Gift Edition

قلمی محبت

طاہر جاوید مغل



پیش لفظ

انسان کے ارادے کچھ ہوتے ہیں، قدرت نے کچھ سوچ رکھا ہوتا ہے۔ یہ بھی محبت کی ایک ایسی داستان ہے جس میں اچانک ایک عجیب موڑ آ گیا تھا۔ جب راہی اپنے آپ میں مگن اس موڑ پر پہنچے تو سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا۔ محبت کی منہ زور لہروں نے اُنہیں دبوچا، جھنجھوڑا اور اُن کے پاؤں زمین سے اُکھاڑ دیئے۔ پھر یہ لہریں اُنہیں اپنی من چاہی سمت میں بہاتی چلی گئیں۔ اور محبت ...... جب کسی کو بہاتی ہے تو پھر ...... اس کے لئے ٹھہرنا محال ہوتا ہے۔ مرد و زن کی محبت، رب العزت کا تخلیق کردہ طاقت ور ترین جذبہ ہے۔ جو تندی، سرکشی اور بے خوفی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس جذبے نے دامی جیسے مصلحت اندیش نوجوان کی کیمسٹری یوں بدلی کہ وہ پاکستان سے تن تنہا سنگاپور کی رنگین و سنگین فضاؤں میں پہنچ گیا۔ وہ اپنی محبت کے لئے اس شہر پُر آشوب کے سارے خطروں کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گیا اور اس نے سامنا کیا بھی۔ ایک انڈین لڑکی امرتا کور کے تحفظ کے لئے اس پاکستانی نوجوان نے ہر چیلنج قبول کیا....... اور سرخرو ہوا۔

لیکن ابھی قدرت کو مزید امتحان منظور تھا۔ دو پیار کرنے والے اب بھی جدا تھے۔ اُن کے درمیان خاردار باڑ تھی۔ اور وہ اس بین الاقوامی باڑ کی دونوں جانب تڑپ رہے تھے، سسک رہے تھے۔ اُن کے سارے ناتے ٹوٹ چکے تھے۔ دیکھنے والی آنکھوں کو نظر آتا تھا کہ ان کے درمیان ہر ناتہ بھسم ہو چکا ہے۔ لیکن ایک ناتہ اب بھی موجود تھا۔ محبت کا ناتہ جو بظاہر بال سے باریک اور کچے دھاگے سے بڑھ کر کمزور تھا لیکن اپنی مضبوطی اور پائیداری میں وہ کائنات کی یکتا شے تھا۔

یہ محبت کی کہانی ہے اور اُن لفظوں کی کہانی ہے جو دل سے نکل کر قلم کے راستے صفحہ قرطاس پر بکھرتے ہیں اور "امٹ" ہو جاتے ہیں۔ یہ فیکس، ای میل اور ایس ایم ایس

کا دور ہے لیکن قلم سے لکھے گئے محبت کے الفاظ آج بھی اپنی جدا شناخت رکھتے ہیں۔

یہ انہی حسین لفظوں اور رنگوں سے شروع ہونے والی روداد ہے۔ اس کہانی کو کھوجتے اور صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے میں نے از خود انڈیا اور سنگاپور کی فضاؤں میں سانس لیا ہے۔ اس زندہ کہانی کے زندہ کرداروں کو قریب سے دیکھنا اور محسوس کرنا ایک زبردست تجربہ تھا۔

محمد علی صاحب کہانی کے حوالے سے تیز نظر رکھتے ہیں۔ وہ محبت کی اس کہانی کو بڑی محبت سے شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ مکتبہ القریش سے شائع ہونے والی یہ کتاب محبت آشنا دلوں کو چھو لے گی۔

طاہر جاوید مغل

ارباز طوفانی محبت کا شکار ہوا تھا۔ ایسی محبت جو دیکھتے ہی دیکھتے بندے کو اکھاڑ پچھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ لڑکی بھی سرحد پار کی تھی، اور سرحد بھی ایسی جسے پار کرتے ہوئے سو دفعہ سوچنا پڑتا ہے۔ لڑکی ہندوستان کی تھی اور جالندھر میں رہتی تھی۔ یہ 83ء کا دور تھا۔ ان دنوں انڈیا آنا جانا ایسا آسان نہیں تھا۔ مشکلات تو اب بھی ہیں۔ لیکن ان دنوں کچھ زیادہ تھیں۔ لڑکی کا نام امریتا کور تھا۔ امریتا کا نام پتہ اور دیگر کوائف ارباز کو کیسے ملے یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ یہاں صرف یہ جان لیجئے کہ امریتا اور ارباز میں پچھلے قریباً دس ماہ سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ یہ خط و کتابت قلمی دوستی کے "رن وے" پر شروع ہوئی تھی۔ پھر تیزی سے دوڑتی ہوئی محبت کی رفتار کو پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے عشق کی فضا میں پرواز کرنے لگی۔

اب وہ دونوں ایک دوسرے کیلئے تڑپ رہے تھے۔ تصویروں کا تبادلہ تو ہو چکا تھا۔ لیکن تصویروں اور تحریروں سے دل کب تک بہلایا جا سکتا ہے۔ امریتا کور کے بارے میں تو مجھے زیادہ معلوم نہیں تھا۔ مگر ارباز کا حال برا تھا۔ وہ میرا گہرا دوست تھا۔ اور اس کی کوئی بھی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ امریتا سے ملنا چاہتا تھا۔ کسی بھی طرح، کسی بھی صورت۔ پچھلے تین چار ماہ میں اس نے کئی بار انڈیا جانے کا پروگرام بنایا۔ مگر بوجوہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی۔ ویزے کا طریقہ کار کافی پیچیدہ تھا...... انڈیا سے خط منگوانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی شرائط تھیں۔ امرتسر میں میرے بڑے بھائی صاحب کے ایک دوست موجود تھے۔ ارباز نے ان سے دو خط بھی منگوا رکھے تھے۔ لیکن ویزے کا ابھی دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

یہ حالات تھے جن میں ایک دن ارباز دندناتا ہوا میرے کمرے میں داخل

ہوا۔ میں اس وقت...... اکثر ایم اے پاس نوجوانوں کی طرح اخبار میں ''ضرورت ہے'' کے اشتہارات دیکھنے میں مصروف تھا۔ ارباز جوتن وتوش میں مجھ سے کچھ بہتر ہے۔ آتے ساتھ ہی مجھ پر جھپٹا اور مجھے بانہوں میں دبوچ کر کمرے میں چار پانچ زبردست قسم کی پھریاں لیں۔ اس کے بعد مجھے فرش پر ٹھہرا کر میرا گال چوما اور بولا۔ ''چل وای! انڈیا چلیں۔''

''کیوں کیا ہوا ہے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''کہیں انڈین صدر نے تجھے براہ راست دعوت نامہ تو جاری نہیں کر دیا۔''

''بس ایسا ہی سمجھ لے یار! ایک دم ہی قسمت کا پھاٹک کھل گیا ہے۔'' اس نے اخبار میرے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ دیکھ...... یہ کیا خبر ہے۔''

یہ انڈیا اور پاکستان کے کرکٹ میچوں کی خبر تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ پاسپورٹ رکھنے والے کرکٹ کے شائقین کو انڈیا جانے کیلئے فوری طور پر ویزے جاری کیے جائیں گے۔

میں نے ساری خبر تفصیل سے پڑھی اور ارباز کی بے تحاشا خوشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس کرکٹ سیریز میں ایک میچ جالندھر میں بھی ہو رہا تھا۔ جالندھر جانے والے شائقین کو لاہور کے قذافی اسٹیڈیم سے ویزے جاری کرنے کی خبر تھی۔ ویزے کی شرائط بے حد آسان نظر آ رہی تھیں۔

''خبر تو واقعی سراسر تیرے حق میں جا رہی ہے میرے رانجھے!'' میں نے سر ہلا کر تائید کی۔

''دیکھ تو پھر میرے لئے رانجھے کا لفظ استعمال کر کے ساری سچویشن کا بیڑا غرق فرما رہا ہے۔'' ارباز نے مجھے تنبیہ کی۔

''پیارے! اگر مجھے کوئی خطاب دینا ہی ہے تو پھر مہینوال کا دے' مہینوال اور سوہنی اور ہمارے درمیان ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا یعنی بارڈر جسے پار کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔''

''لے اب تو نے خود جوئے شیر کا لفظ استعمال کر کے سچویشن کا بیڑا غرق فرمایا

ہے۔ جوئے شیر یعنی دودھ کی نہر کا تذکرہ تو لیلیٰ مجنوں کی کہانی میں آنا چاہیے۔''

''اچھا چل' میں نے تیری ایک غلطی معاف کی۔ اب تو میری ایک معاف کر دے۔ اب فٹافٹ اٹھ جا میرے باپ اور میرے ساتھ چل۔''

''کہاں؟''

''او یئے قذافی اسٹیڈیم چلتے ہیں۔ وہاں سے سارا طریقہ شریقہ معلوم کرتے ہیں۔''

''تو واقعی رانجھے! ...... میرا مطلب ہے مہینوال سے چار پانچ ہاتھ آگے ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''ذرا آنکھوں کے ڈیلے نکال کر خبر کو ٹھیک سے پڑھ' ابھی قذافی اسٹیڈیم میں الو بول رہے ہوں گے۔ یہ ٹکٹوں اور ویزوں وغیرہ کا سلسلہ دس بارہ دن بعد شروع ہونا ہے۔'' بہرطور یہ دس بارہ دن بھی میرے لئے پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ارباز کیلئے یہ پلک جھپکتے میں نہیں گزرے ہوں گے۔ اس کیلئے ایک ایک گھڑی گزارنا محال تھا۔ اپنے تازہ ترین خط میں اس نے امریتا کو یہ تڑپتی پھڑکتی خبر لکھ بھیجی تھی کہ وہ جالندھر ٹیسٹ دیکھنے کیلئے ایک بڑے ''وفد'' کے ساتھ جالندھر تشریف لانے کی کوشش کر رہا ہے۔

یہاں میں اپنا اور ارباز کا تھوڑا سا تعارف کرا دوں۔ میرا نام دائم احمد ہے۔ میں اور ارباز اکٹھے ہی کالج میں پڑھتے رہے تھے۔ میں نے ماسٹرز کیا لیکن ارباز نے گریجویشن کے بعد اپنے والد کے ساتھ کاروبار جوائن کر لیا تھا۔ ہال روڈ پر ان کا الیکٹرانکس کا کافی بڑا شوروم تھا۔ میرے والد اور بڑے بھائی صاحب کا تعلق ٹیچنگ کے شعبے سے ہے۔ والد صاحب نے شروع میں سرکاری ملازمت کی مگر پھر سرکاری نوکریوں کے دگرگوں حالات کے سبب سروس پوری ہونے سے پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی۔ اب وہ بڑے بھائی عاصم کے ساتھ مل کر ایک کامیاب اکیڈمی چلا رہے تھے۔ میرے اور ارباز کے مشاغل میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ اس کے باوجود ہم ہمیشہ گہرے دوست رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ محبت بھری دوستی بڑھتی گئی' کم نہیں ہوئی تھی۔ میرے اور ارباز کے جو مشاغل مختلف تھے ان میں ایک مشغلہ باڈی بلڈنگ کا بھی تھا۔ ارباز کو لڑکپن

سے ہی تن سازی کا شوق تھا۔ اور اس نے گئے برسوں میں یہ شوق مستقل مزاجی سے جاری رکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لے جاتا تھا۔ ایسے میں' میں چند ہفتے یا مہینے یہ شغل جاری رکھتا تھا۔ بعد ازاں اپنی پرانی ڈگر پر آ جاتا تھا۔ قد کاٹھ میں ہم تقریباً ہم پلہ ہی تھے۔ تاہم باڈی بلڈنگ کے سبب ارباز قدرے جسیم نظر آتا تھا۔ وہ ہتھ چھٹ بھی تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کی یہ عادت کبھی بھی بری نہیں لگی۔ وہ جھگڑالو نہیں تھا۔ لیکن جب مسئلہ اپنے دفاع کا یا عزت بے عزتی کا ہوتا تھا تو وہ ''سراپا مزاحمت'' بن جاتا تھا۔ ایسے میں اس کا چوڑا سینہ کسی دیوار کی طرح نظر آنے لگتا تھا۔ گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ اور وہ کسی بھی طرح کے ماحول یا مقابل کو خاطر میں لائے بغیر ڈٹ جاتا تھا۔ میں بذات خود لڑائی بھڑائی کا مزاج نہیں رکھتا۔ لیکن ارباز کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد اس کا تھوڑا بہت رنگ مجھ پر بھی چڑھا تھا۔ خاص طور پر جب ارباز میرے ساتھ ہوتا تھا تو میں ایسے موقعوں پر اپنے اندر اچھی خاصی توانائی محسوس کرتا تھا۔ بے شک شروع میں میری کوشش رہتی تھی کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے۔ لیکن اگر بگڑ جاتا تھا تو پھر میں ارباز کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ بہرحال ایسے معاملوں میں میں اسے چیمپئن سمجھتا تھا اور تہہ دل سے اس کا معترف تھا۔ دوسری طرف ارباز لکھائی پڑھائی کے معاملوں میں میری صلاحیت کی قدر کرتا تھا۔ میری معلومات عامہ پر اسے بہت یقین بلکہ اعتقاد تھا۔

جس دن اسٹیڈیم میں ویزوں کا اجرا شروع ہوا اس دن ہم دونوں اپنے پاسپورٹ تھامے ایک طویل قطار میں کھڑے تھے۔ ویزے کی اکلوتی شرط ٹیسٹ میچ کا سیزن ٹکٹ تھا۔ یہ ٹکٹ بھی وہیں پر ایک کھڑکی سے دستیاب تھے۔ ٹکٹ لینے کے بعد ہم نے دوسری کھڑکیوں کی طرف رجوع کیا۔ یہاں بھارتی عملہ چھ روزہ ویزہ جاری کرنے کیلئے ضروری کارروائی کر رہا تھا۔ ہم نے اپنے پاسپورٹ وغیرہ جمع کرا دیئے۔ اگلے روز ویزہ لگے ہوئے پاسپورٹ ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ خوشی کے سبب ارباز کے چہرے پر جو چمک نمودار ہوئی تھی۔ وہ دیدنی تھی۔ وہ جیسے پاسپورٹ پر لگے ہوئے ویزے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنی امریتا کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دلوں کے معاملے بھی کیا ہوتے ہیں۔ وہ دونوں دو مختلف ملکوں میں رہتے تھے۔ مختلف مذاہب رکھتے تھے۔ ان کا معاشرہ' ان کا رہن سہن

سب مختلف تھے۔ پھر بھی وہ دونوں ایک ان دیکھی ڈور میں بندھ گئے تھے۔

ہمارے اردگرد جو پاکستانی شائقین موجود تھے...... وہ بڑے پرجوش طریقے سے ایک دوسرے کو سفری ہدایات دینے میں مصروف تھے۔ ایک آواز آئی۔

''بھائیو! واٹر کولر کی جالندھر میں اتنی ہی قدر ہے جتنی یہاں فریج کی ہے جو یہاں سے تین چار کولر لے گیا۔ سمجھو اس نے دو اڑھائی ہزار کما لیا۔''

ایک دوسرے خیرخواہ نے ہمراہیوں کو ہدایت کی۔ ''واٹر کولر بھی ٹھیک ہے لیکن کیلکولیٹر کو بھی وہاں آنکھوں سے لگا کر چومتے ہیں۔ چار گنا نہیں تو تین گنا قیمت تو آسانی سے مل جاتی ہے۔''

ایک لڑکے نے الیکٹرانک گھڑیوں کے بارے میں یہی بات کہی۔

ارباز ان ساری باتوں سے بے خبر کسی اور ہی خیال میں کھویا ہوا تھا...... اور میں اس کے تاثرات میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے ریشمی بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ وہ پاسپورٹ ہاتھ میں تھامے بے خیالی میں مشرق کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ جیسے سرحد پار انڈیا کی طرف دیکھ رہا ہو۔ انڈیا جہاں ایک بستی کا نام جالندھر تھا۔ جالندھر جہاں کالے سیاہ بالوں والی ایک خوش رو لڑکی امریتا رہتی تھی۔ امریتا جس سے معروف تاجر حاجی نفیس احمد کے بیٹے ارباز احمد کو پیار ہو گیا تھا۔ ایک ان دیکھی ڈور اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ کرکٹ کیلئے انڈیا نہیں جا رہا تھا۔ نہ واٹر کولرز اور کیلکولیٹرز کیلئے' نہ ہی شراب و شباب کیلئے' وہ بس کسی کو دیکھنے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر ایک سوال پوچھنے جا رہا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ جا رہا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ وہ 24 ستمبر کی ایک نکھری نکھری شام تھی۔ ہم ایک اسپیشل بس کے ذریعے لاہور سے واہگہ بارڈر پر پہنچے۔ یہاں کسٹم اور امیگریشن کے عارضی دفاتر قائم کئے گئے تھے۔ ایک بڑے شامیانے میں طویل میزوں کے پیچھے پاکستانی اہلکار بیٹھے تھے۔ ہمارے کاغذات دیکھے گئے۔ آپریشن ٹیبلز کے اوپر سامان کھول کر دیکھا گیا۔ ہمارے پاس جو کچھ تھا سچ تھا۔ سچ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کوئی واٹر کولر بھی نہیں تھا...... امیگریشن والوں نے عمومی نوعیت کے سوالات پوچھے۔ کتنے ساتھی جا رہے ہیں؟ کتنی پاکستانی کرنسی ہے؟ کیا دیکھنے کا ارادہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اندرون شہر کا ایک لاہوری بھائی میرے آگے کھڑا تھا۔ اس نے دو کیلکو لیٹر جیب میں ٹھونس رکھے تھے۔ آفیسر نے جیب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے مسٹر؟“

”کیلکو لیٹر ہے جی۔“

”یہ کس لئے لے جا رہے ہو؟“

”خرچے شرچے کا حساب رکھنے کے لئے۔“

آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کرنسی تو تم نے بس بارہ سو روپیہ بتائی ہے۔ اس بارہ سو کے حساب کے لئے دو کیلکو لیٹر لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

نوجوان بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اردگرد کھڑے لوگ مسکرانے لگے۔ نوجوان بمشکل جان چھڑا کر شامیانے سے نکلا۔ ہم بھی فارغ ہو کر واہگہ کے گیٹ یعنی ”نو مین لینڈ“ کی طرف چل دیئے۔

میں نے ارباز! سے کہا۔ ”اسے کہتے ہیں عذر گناہ بدتر از گناہ۔“

”اور اسے کیا کہتے ہیں؟“ ارباز نے ہمارے آگے جاتے ہوئے ایک پہلوان نما شخص کے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے غور سے دیکھا اور حیران ہوا ”بھائی صاحب نے براؤن رنگ کی پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔ چپل اور پاؤں کے درمیان میں سے سو سو کے کئی نوٹ جھانک رہے تھے۔ غالباً افراتفری میں زائد کرنسی چھپانے کیلئے بھائی صاحب نے چپل کو استعمال کیا تھا۔ اب مسئلہ یہ ہوا تھا کہ مسلسل چلنے سے نوٹ پاؤں کے نیچے سے کھسک کر باہر کا نظارہ کرنے لگے تھے۔ ہر اٹھنے والے قدم کے ساتھ نوٹ مزید نمایاں ہو رہے تھے۔ سامنے ہی انڈین اہلکار کھڑے تھے۔ میں نے بھائی صاحب کے قریب ہو کر کہا۔ ”پہلوان جی! اپنی جوتی دا تسمہ کس لو۔“

پہلوان نما نے چونک کر پاؤں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے کولر اور بیگ وغیرہ سڑک پر رکھے اور ”جوتی کا تسمہ کس لیا۔“

واہگہ بارڈر کے عین اوپر ایک ناسمجھ پاکستانی کے پاؤں کے نیچے قائد کی تصویر والے نوٹ دیکھ کر دیر تک قلق ہوتا رہا۔ سرحد کی دوسری طرف بھی امیگریشن کے مراحل

طے کرنے کیلئے عارضی کیمپ لگائے گئے تھے۔ وردیوں میں ملبوس انڈین جوان اور آفیسر تیزی سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر سکھ تھے۔ عمومی سوالات پوچھنے کے بعد ویزے اسٹمپ کئے گئے۔ سامان دیکھا گیا۔ پولیس رپورٹ تیار کی گئی اور رپورٹ کی ایک ایک کاپی اس ہدایت کے ساتھ سیاحوں کے حوالے کی گئی کہ اسے جان سے لگا کر رکھنا ہے۔ ورنہ واپسی پر جان مصیبت میں آ جائے گی۔

ایک انڈین میجر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”ہاں بھئی سجناں! کرکٹ کی کھچ (کشش) یہاں لے کر آئی ہے یا انڈیا دیکھنے کی کھچ؟“

میرے جی میں آئی اس خوش مزاج میجر سے کہہ دوں۔ ”نہ کرکٹ کی کھچ اور نہ انڈیا کی کھچ' بس اس لڑکی کی کھچ جس نے میرے یار کو دیوانہ کر دیا ہے۔ اگر تم ہمارے سچے دوست ہو تو بس ہمیں اس پنجابی کڑی کے گھر تک پہنچا دو۔ اس کے بعد ہم جانیں اور ہماری قسمت۔“

لیکن ظاہر ہے کہ میں یہ بات میجر صاحب سے کہہ کر ان کی پوشل پر پاؤں نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور نہ ہی ارباز ایسا احمق تھا کہ اتنا مہنگا سچ بولتا۔

میں نے کہا۔ ”بس جی ہم تو آپ کے کپل دیو اور گواسکر کے دیوانے ہیں۔“

”اور آپاں' آپ کے عمران خان اور ظہیر عباس کے۔“ میجر نے ستائش باہمی کے اصول پر عمل کیا۔ بارڈر پار سے ہم پھر بس میں سوار ہوئے۔ لیکن اس مرتبہ انڈین بس تھی۔ جب تک بس حرکت میں نہیں آ گئی سامان ڈھونے والے قلیوں کے مطالبوں سے نجات پانا ممکن نہیں ہوا۔ ایک اور گروہ بھی مسلسل ناک میں دم کر رہا تھا۔ یہ منی چینجرز تھے۔ وہ کم سے کم شرح پر پاکستانی کرنسی خریدنے کے بعد زیادہ سے زیادہ شرح میں انڈین کرنسی بیچنے کے چکر میں تھے۔ بس حرکت میں آئی تو ہم نے سکھ کا سانس لیا۔

سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ہمارے اردگرد کھیت' درخت' کنوئیں اور گاؤں تھے۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ بس یہی لگ رہا تھا کہ ہم پاکستان میں ہیں......

لیکن پھر ہمیں ایک شے نظر آئی اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں ہوا اور یہ لوگ ہمیں گھما پھرا کر پھر سے شالا مار باغ کے قریب نہیں اتار دیں گے۔ ہم واقعی انڈیا میں تھے۔ اور اس کا ثبوت وہ ان دیکھا سا جانور تھا جو کھیتوں میں گھومتا نظر آتا تھا اور

گھروں کے دروازوں کے سامنے بندھا ہوا تھا۔

''یار یہ کیا ہے؟'' میں نے ارباز سے پوچھا۔

''بکرا نہیں ہے اور نہ ہی بھینس کا کٹا ہے۔''

''اوہو میں نے ہونٹ اسکوڑے' یار! یہ تو سور کا بچہ ہے۔ میرا مطلب ہے سور ہے۔''

''ہاں جی یہ وہی ہے۔'' قریب بیٹھے ایک تاجر پیشہ لاہوریئے نے اپنی زبان کو پلید کئے بغیر میری تائید کی۔

کچھ دیر بعد ہمیں کہیں کہیں سکھ بھائیوں کی رنگین پگڑیاں نظر آنے لگیں۔ اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہم انڈیا میں تھے۔

ہم امرتسر کے قریب سے ہو کر گزرے اور جالندھر کی طرف ہمارا سفر جاری رہا۔ یہ سفر خاصا طویل ثابت ہوا۔ ہم نے تین گھنٹے میں قریباً 110 میل سفر طے کیا اور انڈین وقت کے مطابق رات آٹھ بجے کے لگ بھگ جالندھر کے نواح میں پہنچ گئے۔ جوں جوں کوچہ جاناں قریب آ رہا تھا۔ ارباز کے چہرے پر روشنی سی پھیل رہی تھی۔ میں اس کی حرکات میں اضطراب محسوس کر رہا تھا۔

میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور دھیمی آواز میں سیٹی بجانے لگا۔

''بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔''

وہ مجھے ہوکا دے کر بولا۔ ''تجھے مستی سوجھ رہی ہے' میری جان پر بن رہی ہے۔''

''یار! میں تو تیرا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''دھیان بٹانے کا یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔''

''پھر کون سا طریقہ اچھا ہے۔''

ارباز نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جالندھر سے موصول ہونے والا امریتا کا آخری خط مجھے دکھانے لگا۔ امریتا نے لکھا تھا۔



''ست سری اکال اور پریم بھرا اسلام! آپ کیسے ہیں ارباز' کل آپ کا خط ملا ہے۔ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ خط تقریباً دس دن لیٹ ہے۔ شاید آپ کو انتظار کرا کے مزا آتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ میری لکھی ہوئی باتیں یاد کر کے اکیلے میں مسکراتے رہتے ہیں۔ ارباز صاحب! آپ بس مسکراتے ہیں' میں تو باقاعدہ ہنسنے لگتی ہوں۔ پرسوں بڑی شرم آئی۔ سبزی بناتے بناتے آپ کی وہ نہر میں نہانے والی بات یاد آئی اور میں سچ مچ ہنس دی۔ بڑی دیدی دیکھ رہی تھی۔ حیران ہو کر کہنے لگی۔ کیا بات ہے تجھے کوئی گدگدیاں کر رہا ہے۔ میں نے کہا بس ایک لطیفہ یاد آ گیا تھا اور بڑی مشکل سے بات ٹالی۔ آپ کے بارے میں بہت زیادہ سوچنے لگی ہوں۔ کبھی کبھی یہ خیال کر کے بڑی نراش ہوتی ہوں کہ آخر اس کہانی کا انت کیا ہو گا۔ آپ نے خط کے آخر میں لکھا ہے کہ پاسپورٹ بنوا لیا ہے اور انڈیا آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ جلدی سے آ جائیں...... اور کبھی دل چاہتا ہے کہ آپ بالکل نہ آئیں' کبھی بھی نہ آئیں۔ ہمارا یہ سمبندھ (تعلق) اس طرح ان دیکھا اور انجانا رہے۔

میرے بال گر رہے ہیں۔ پہلے سے بہت چھوٹے رہ گئے ہیں۔ آپ نے اپنی باجی سے پوچھ کر بال لمبے کرنے کا جو نسخہ لکھا ہے وہ میں نے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔''

امریتا نے خط کے آخر میں دو تین شعر لکھے تھے اور جلدی جواب بھیجنے کا کہا تھا۔

میرے خط پڑھنے کے دوران میں ہی بس جالندھر شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ جالندھر جس کا شمار پنجاب کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ ان دنوں اس کی آبادی

چودہ پندرہ لاکھ کے قریب تھی۔ ہمارے سامنے بڑے بڑے روشن بازار تھے' سڑکیں تھیں اور رنگ برنگے آنچلوں اور رنگ برنگی پگڑیوں والے لوگ تھے۔ بس ڈی اے وی ہوسٹل کے سامنے جا کر رکی۔ یہ وسیع عمارت ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا حصہ تھی۔ مقامی حکام نے ہمارے ''وفد'' کا استقبال کیا۔ ہمارے اعزاز میں عشائیے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بس سے اترنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم اور عشائیہ آمنے سامنے تھے۔ کھانے میں ترکاری' بریانی اور گوشت شامل تھا۔ گوشت کے بارے میں ایک خوش پوش سردار جی نے علی الاعلان اور حلفیہ انداز میں بتایا کہ یہ حلال گوشت ہے۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لئے فوراً بستر کی فکر ہوئی۔ ہوسٹل کی بالائی منزل پر ایک طویل راہداری میں کمروں کی طویل قطار تھی۔ ایسی ہی طویل قطاریں چاروں طرف نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں وسیع احاطہ تھا۔ سالانہ چھٹیوں کے سبب ہوسٹل کی بیشتر عمارت خالی پڑی تھی۔ ہمیں جو کمرا الاٹ کیا گیا اس میں دو چارپائیاں تھیں۔ لیکن بستر نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی تھی۔ تکیہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اپنے سفری بیگ تکیے کے طور پر استعمال کئے اور بے سدھ ہو کر لیٹ گئے۔

میں نے غنودگی کی حالت میں کہا۔ ''یار ارباز! تم تو کوچۂ جاناں میں آئے ہو اور کوچۂ جاناں میں سر کے بل بھی چلنا پڑتا ہے۔ لیکن میں تو سیدھا سادا شریف آدمی ہوں۔ میرے آرام کا تو کچھ خیال کرنا چاہیے تھا جالندھر والوں کو۔''

''اوئے خبیث...... ناشکرے...... احسان فراموش...... تجھے جالندھر والوں نے دو سو روپے کا ڈنر مفت دیا ہے۔ مفت رہائش دی ہے۔ مفت فلمیں دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر بھی تجھے مہمان نوازی نظر نہیں آتی۔ ایک تکیے کے لئے رو رہا ہے۔''

''ہاں بھائی! تجھے تو یہاں ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آئے گا۔ تیری امریتا کا شہر جو ہے یہ۔''

''تو کیوں جل رہا ہے۔ وہ کیا کہا ہے شاعر نے ؎

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ...... کیا پتہ تجھے بھی یہاں کوئی قدردان مل جائے۔''

''میرے حالات ابھی اتنے خراب نہیں ہوئے کہ میں پرائے دیس میں

قدردان کی خواہش کروں۔ میں تو فی الحال تیرے انجام کے بارے میں سوچ سوچ کر کانپ رہا ہوں۔'' پھر میں نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے ارباز سے پوچھا۔ ''کیا تجھے پورا یقین ہے کہ امریتا نے جو فون نمبر تجھے دیا ہے وہ کام کرے گا۔''

''ضرور کرے گا...... ضرور کرے گا اور اگر نہ کرے گا تو پھر ایڈریس بھی ہے۔ ڈھونڈ لیں گے۔ دو چار گھنٹے میں۔''

دراصل ارباز نے اپنے آخری خط میں امریتا کو اپنے آنے کا تو بتایا تھا۔ مگر یہ کنفرم نہیں کیا تھا کہ وہ کس دن پہنچے گا۔ ہم حقیقتاً دو روز لیٹ جالندھر پہنچے تھے۔ ٹیسٹ میچ آج صبح سے شروع ہو چکا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم نہا دھو کر جالندھر اور ''جالندھر والی'' کو دیکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم نکل کھڑے ہوتے ہمارے راستے میں ایک چھوٹی سی رکاوٹ آ گئی۔ اس رکاوٹ کا نام پروفیسر امتیاز علی تھا۔ پروفیسر صاحب کا شمار ہمارے پرانے اساتذہ میں ہوتا تھا۔ وہ بھی آٹھ دس طلباء کے ایک گروپ کے ساتھ میچ دیکھنے کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ ہم سے ایک دن پہلے جالندھر پہنچ گئے تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے اور کرکٹ کے بارے میں لمبی چوڑی گفتگو کی۔ کرکٹ ہم دونوں کا بھی پسندیدہ کھیل رہا ہے اور ہم اسے بہت انجوائے بھی کرتے رہے تھے۔ لیکن فی الوقت ہماری دلچسپیاں کچھ اور تھیں۔ یہ دلچسپیاں بھی کرکٹ میچ ہی کی طرح سنسنی خیز اور پر خطر تھیں۔ پہلی ہی بال پر وکٹ صاف اڑنے کا ڈر تھا۔ باؤنسر لگنے کے جملہ خطرات تھے۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔

بہرحال امتیاز صاحب کے سامنے ہم سر کو اثبات میں ہلانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ سر کو یوں مسلسل اثبات میں ہلانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں بادل نخواستہ وہ کام کرنا پڑا جس کے لئے ہم یہاں آئے تھے۔ یعنی ہمیں کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے اسٹیڈیم جانا پڑا۔ دوسرے شائقین تو دیگر سواریوں پر روانہ ہوئے لیکن ہم امتیاز صاحب کے ساتھ ایک ''ہلمن'' کار میں آ بیٹھے۔ یہ کار امتیاز صاحب کے ایک مقامی دوست اجیت سنگھ صاحب کی تھی۔ اجیت صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بہت دلچسپ تھے۔ مزے کا مطلب یہ ہے کہ اجیت صاحب کا

تعلق ''مزے'' اور خصوصاً مزے دار کھانوں سے تھا۔ وہ خاصے موٹے واقع ہوئے تھے۔ یہاں پگواڑا ٹاؤن میں ان کی کپڑے کی بہت بڑی اور وسیع و عریض دکان تھی۔ اجیت صاحب کے بھائی انتظامیہ میں ایک اچھے اور بااثر عہدے پر فائز تھے۔

ہم اسٹیڈیم میں پہنچے۔ یہ ایک خوشگوار دن تھا۔ کرکٹ میچ پورے جوش وخروش سے جاری تھا۔ پاکستانی جھنڈے لہراتے دیکھے تو آنکھوں میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ آج میچ کا دوسرا روز تھا۔ کل ٹاس انڈیا نے جیتا تھا۔ لیکن پاکستان کو کھیلنے کی دعوت دی تھی۔ پاکستان کی شروعات زیادہ اچھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج پاکستان نے اچھی طرح قدم جمالئے تھے۔ ظہیر عباس نے اچھی بیٹنگ کی تھی۔ اب وسیم حسن راجہ کھل کر کپیل دیو اور راجر بنی وغیرہ کی پٹائی کر رہا تھا۔ اس کے ہر شاٹ پر پاکستانی انکلوژر میں زبردست جوش وخروش کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ (بعد ازاں وسیم حسن راجہ مین آف دی میچ بھی رہا) کچھ دیر تک میچ دیکھنے کے بعد ہم انکلوژر سے اس طرح کھسکے جس طرح غافل سکول ٹیچر کے بچے کلاس روم سے کھسکتے ہیں۔ میچ دیکھنے کے دوران میں ارباز میرے کان میں بار بار سرگوشی کرتا رہا تھا...... ''یار! وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔''

اسٹیڈیم سے نکلنے کے بعد ہم پیدل ہی ایک سمت میں چلنا شروع ہو گئے۔ ارباز کے پاس امریتا کا ایڈریس اور فون نمبر دونوں موجود تھے۔ وہ پہلے کسی پی سی او سے فون نمبر ٹرائی کرنا چاہتا تھا۔ جالندھر ہمارے اردگرد موجود تھا۔ اور ہم دن کی روشنی میں پہلی بار غور سے اس کے خدوخال دیکھ رہے تھے۔ سڑکوں پر جو سب سے نمایاں شے نظر آ رہی تھی وہ سائیکل رکشا تھے۔ کچھ سائیکل رکشا چھوٹے تھے اور کچھ اتنے بڑے تھے کہ ان پر بیک وقت آٹھ دس سواریاں بیٹھ سکتی تھیں۔ ان سائیکل رکشاؤں کو کھینچنے والے صورت سے ہی پسے ہوئے طبقے کے لوگ نظر آتے تھے۔ سوکھی سوکھی سیاہ پنڈلیاں' کھچے کھچے چہرے' بجھی بجھی آنکھیں' ان میں سکھ اور غیر سکھ دونوں طرح کے لوگ تھے۔ ہم نے ایک سیٹھ نما ہندو اور اس کی موٹی تازی پتنی کو بڑے ٹھاٹ سے ایک رکشا پر بیٹھے دیکھا۔ اور ہانپتے کانپتے ہوئے رکشا والے کو دیکھ کر دل پر عجیب سا ناگوار بوجھ محسوس ہوا۔ مجھے لگا کہ شاید جالندھر میں قیام کے دوران میں ہم ایک بار بھی سائیکل رکشا پر نہیں بیٹھ سکیں گے۔ سیٹھ اور سیٹھانی بڑی شان کے ساتھ ہمارے بالکل پاس سے گزرے۔ وہ

ضرورت سے زیادہ صحت مند تھے...... یا شاید ہمیں محسوس ہو رہے تھے۔ درحقیقت جالندھر کا عام شہری ہمیں خاصا دھان پان نظر آیا۔ اکثر چہروں پر غربت کی پرچھائیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ سکھ خواتین وحضرات کے بارے میں جو ہمارا تصور تھا کہ وہ خاصے تومند ہوتے ہیں۔ کم از کم جالندھر پہنچ کر تو غلط ہی نکلا۔ یہ بات نہیں کہ صحت مند وخوش پوش لوگ نظر ہی نہیں آتے تھے۔ لیکن ان کی شرح کم تھی۔

میں نے کہا۔ ''یار ارباز! ابھی کچھ دیر پہلے تو نے اجیت صاحب کی ہلمن کار کے بارے میں جو قصیدے پڑھے اور ان کے حسن انتخاب کی جتنی بھی داد دی وہ سب بے کار گئی۔''

''کہہ تو تو ٹھیک ہی رہا ہے۔'' ارباز نے خلاف معمول اتفاق کیا۔

دراصل جب ہم اجیت صاحب کے ساتھ اسٹیڈیم کی طرف آ رہے تھے تو ارباز ہلمن کار کی تعریفوں میں لگا رہا تھا۔ اس نے اجیت صاحب کو اس شاندار کلاسیکل کار کے انتخاب پر دل کھول کر داد دی تھی۔ اب ہمیں احساس ہو رہا تھا کہ اس داد کا مستحق تو ہر وہ جالندھری ہے جس نے کار رکھی ہوئی ہے۔ جالندھر میں ہلمن کار کے علاوہ اور کوئی کار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسکوٹر ''لمبریٹا'' تھا اور ہر طرف وہی دندنا رہا تھا۔ موٹر سائیکل بھی ہر شخص کے پاس ایک ہی نسل کی تھی۔

ایک ریڑھی والے سے کولڈ ڈرنک پینے کے بعد ہم بس میں بیٹھے اور سیدھے گجرال نگر جا پہنچے۔ ہمارے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ اجنبی دیس تھا۔ اجنبی لوگ اور ایک نامعقول قسم کا کام...... ارباز نے کانپتے ہاتھ سے پتے اور فون نمبر والی چٹ نکالی۔ سامنے ہی ایک پبلک کال آفس نظر آ گیا۔ ہم اس میں گھس گئے۔ ارباز نے فون نمبر ڈائل کیا۔ دس پندرہ سیکنڈ بعد اس کے چہرے پر عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ یہ وہی چمک تھی جو امریتا کا خط لکھتے یا پڑھتے ہوئے اس کے چہرے پر نمودار ہوتی تھی۔

''ہیلو...... کون؟'' ارباز نے کہا۔ پھر چند لمحے بعد لرزاں آواز میں بولا۔

''میں ارباز بول رہا ہوں...... تمہارے شہر سے...... بالکل...... بالکل...... نہیں...... یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ ایسی باتیں تو اپریل فول میں ہوتی ہیں...... اور یہ اپریل نہیں ہے...... نہیں نہیں...... تمہارے سر کی قسم...... ہاں...... تمہارے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوں

......کوئی آشا جنرل اسٹور ہے...... مجسمے والے چوک کے قریب...... میں نے سبز قمیض اور سفید پتلون پہن رکھی ہے...... اور تم نے؟...... ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ او کے...... خدا حافظ۔''

تمتمائے ہوئے چہرے اور چڑھی ہوئی سانس کے ساتھ اس نے فون بند کیا۔ پی سی او والے سکھ لڑکے کو پیسے ادا کیے اور میرے ساتھ باہر آ گیا۔

''ہاں...... کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آ رہی ہے گھامڑ...... آدھے گھنٹے کے اندر اندر۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک بس اسٹاپ ہے۔ بس اسٹاپ کے بالکل ساتھ ایک اناس والا ریڑھی بیچ رہا ہے...... م...... میرا مطلب ہے ریڑھی والا اناس بیچ رہا ہے۔ وہ اس بس اسٹاپ پر پہنچ رہی ہے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں اناس کی ریڑھی والا بس اسٹاپ دکھائی دے گیا...... شیڈ تلے چند مرد و زن موجود تھے۔ اسکول سے چھٹی کر کے آنے والے بچوں کی ایک ٹولی بھی اپنے بستوں اور تختیوں وغیرہ کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ سکھ بچہ واقعی خوبصورت ہوتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں تختیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ تختیاں پوچنے اور لکھنے کی روایت ابھی ان علاقوں میں باقی ہے۔

ہم لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گئے...... اور امریتا کا انتظار کرنے لگے۔ اناس کی ریڑھی پر اناس کی بجائے اس کا جوس فروخت ہو رہا تھا۔ اناس کو بیلنے میں گنے کی طرح پیل کر ایک فٹ لمبا گلاس رس سے بھرا جاتا تھا اور فقط دو روپے کے عوض گاہک کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا تھا۔ ریڑھی کے اردگرد اناس اور چھلکوں کے ڈھیر نظر آ رہے تھے...... وی آئی پی پھل اناس کی یہ بے قدری دیکھ کر حیرت تو ہوئی۔ لیکن مزا بھی آیا۔ لاہور میں ''اناس'' ہم سے آنکھ نہیں ملاتا لیکن یہاں دو روپے کے عوض اس کی بے عزتی خراب ہو رہی تھی۔

ارباز بڑے انہماک سے شمال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ ''اوئے باندر' کیا تجھے یقین ہے کہ وہ اس طرف سے آئے گی۔''

وہ کھسیا گیا۔ ''واقعی یار! یہ تو پتہ نہیں کہ اس نے کدھر سے آنا ہے۔'' پھر ذرا

توقف سے بولا۔ ''تم اس طرف دیکھو میں اس طرف نظر رکھتا ہوں۔''

''میرے دیکھنے سے کیا ہوگا۔ تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ ''جالندھر والی'' نے کپڑے کون سے پہنے ہوں گے۔''

''سفید قمیض اور نیلی شلوار۔''

''سفید قمیض اور نیلی شلوار یا نیلی قمیض اور سفید شلوار؟''

''ہاں ہاں یہی۔''

''تو لو پھر وہ آ رہی ہے'' میں نے لرزاں لہجے میں کہا۔

ارباز نے چونک کر میرے رخ پر دیکھا اور اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ وہ لڑکی جس کے سپنے کئی ماہ سے اس کی آنکھوں میں سجے ہوئے تھے...... جس کا خیال دھڑکن کی طرح اس کے سینے میں رہتا تھا...... آج جالندھر کی اس خوشگوار دوپہر میں' تارکول کی سڑک پر بڑی ادا سے قدم رکھتی بس اسٹاپ کی طرف آ رہی تھی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ امریتا کی طرح وہ بھی شلوار کرتے میں تھی۔ اس نے بھی ایک پھولدار چادر سے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا۔ سرو قد امریتا نے قدرے گھبرائے ہوئے انداز میں بس اسٹاپ پر اور اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو چکے تھے۔ پھر میں نے امریتا کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نوٹ کیے اس کی نگاہ ارباز کی سبز قمیض پر پڑ گئی تھی۔

آپس میں سرگوشیاں کرتی دونوں لڑکیاں ہمارے پاس آ گئیں۔ چہرے عموماً دور سے خوبصورت نظر آتے ہیں۔ لیکن انہیں نزدیک سے دیکھنے پر خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ لیکن امریتا کے حوالے سے ایسا نہیں ہوا۔ وہ قریب آ کر بھی قبول صورت ہی لگی۔ بلکہ شاید اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ خوبصورت بھی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے دبلے پتلے چہرے کی سب سے دلکش چیز نقوش پر چھائی ہوئی فطری بے ساختگی اور معصومیت تھی۔ یہ معصومیت اسے کچھ اور بھی الہڑ اور کم عمر دکھاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی ساتھی لڑکی عمر میں شاید اس سے ایک دو سال بڑی تھی۔ وہ بھی گوری رنگت والی ایک قبول صورت لڑکی تھی۔

ارباز بے حد محویت سے امریتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نجانے کہاں سے اس کی

بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آ گئی تھی۔ امریتا کی پلکوں نے بوجھل ہو کر اس کی آنکھوں کو چھپا لیا تھا۔ خاموشی کا وقفہ طویل محسوس ہوا تو امریتا نے ہمت کر کے نگاہ اٹھائی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''ست سری اکال...... السلام وعلیکم''

جواب میں ہم دونوں نے بھی ایک ساتھ یہی الفاظ دہرائے۔ یعنی ایک ہی لمحے میں ہم چاروں بول اٹھے تھے۔ اس اتفاق پر دونوں لڑکیاں مسکرا دیں۔ مسکراہٹ ماحول کے تناؤ کو کم کرتی ہے اور جب مسکراہٹ لڑکی کی ہو تو پھر سونے پر سہاگہ۔

''آپ سے...... مل کر...... بب بہت خوشی ہوئی۔'' ارباز نے رسمی جملہ استعمال کیا۔

''ہمیں بھی۔'' امریتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔

''آپ' ہم کا لفظ کیوں استعمال کر رہی ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے اپنے بارے میں بات کریں۔'' میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

ایک بار پھر وہ دونوں مسکرا دیں۔ اس دوسری مسکراہٹ نے ماحول کو مزید نارمل کیا۔

''آیئے...... کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' امریتا نے اپنی چادر سینے پر درست کرتے ہوئے کہا۔ ہم سڑک کے کنارے کنارے چل دیئے۔ وہ بولی۔ ''یہاں پاس ہی بچوں کا ایک پارک ہے۔ بڑی سندر جگہ ہے۔ اس کو لوگ ''بچہ گراؤنڈ'' کہتے ہیں۔''

ارباز بولا۔ ''ظاہر ہے جس چیز کا تعلق بچوں سے ہوگا' وہ سندر ہی ہوگی۔''

''آپ کے خطوں کی طرح آپ کی باتیں بھی خوبصورت ہیں۔'' وہ ذرا لجا کر بولی۔

بیٹھنے اور باتیں کرنے کے لئے یہ واقعی بڑی مناسب جگہ تھی۔ سایہ دار درخت تھے۔ ان کے نیچے لکڑی اور پتھر کے بینچ تھے۔ کینٹین سے ایک سکھ لڑکا فوراً ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ''آپ کیا لیں گی؟'' ارباز نے دونوں لڑکیوں سے ایک ساتھ پوچھا۔

''یہ سوال پوچھنے کا ادھیکار ہمارا ہے۔'' امریتا نے کمال بے تکلفی اور سادگی سے کہا۔ ''آپ ہمارے مہمان ہیں' ہمارے دیس میں ہیں۔''

''تو پھر کوئی دیسی چیز ہی منگوا لیجئے۔ میرا مطلب ہے پیڑوں والی لسی وغیرہ۔'' ارباز کی بجائے میں نے جواب دیا۔

''اس کے لئے آپ کو بازار جانا ہوگا۔ اور بازار یہاں سے چار پانچ کلومیٹر دور ہے۔'' امریتا کی بجائے اس کی ساتھی نے جواب دیا۔ ایک طرح سے ہم دونوں امریتا اور ارباز کے معاونوں کا کردار ادا کر رہے تھے۔

''ان مس صاحبہ کا تعارف تو آپ نے کرایا ہی نہیں۔'' ارباز نے امریتا سے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''کہیں یہ وہی لالہ صاحبہ تو نہیں جن کا ذکر کہیں کہیں آپ کے خطوں میں بھی ملتا ہے۔''

''ہاں یہ وہی ہے۔ میری پیاری سہیلی' اس کا پورا نام للیتا شیکھر ہے۔ ہمارے اور ان کے گھر کی دیواریں ملی ہوئی ہیں۔ یہ بی ایس سی فائنل ایئر میں ہے۔''

امریتا نے ہمارے منع کرنے کے باوجود چائے اور سموسے منگوا لئے۔ رسمی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ وہی باتیں تھیں جو قلمی دوستی کرنے والے اس وقت کرتے ہیں جب دیرینہ تعلق کے بعد وہ پہلی بار ملتے ہیں۔ آپ کا فلاں خط ایسا تھا۔ فلاں خط ویسا تھا۔ آپ کی فلاں فلاں باتیں مجھے بہت اچھی لگیں۔ فلاں خط سے پہلے آپ نے بہت انتظار کرایا۔ آپ کے بارے میں میرا تصور ایسا تھا۔ آپ کے مزاج کے بارے میں میرے فلاں فلاں اندازے درست ثابت ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ

امریتا اور ارباز باتیں کر رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ ''وہ باتیں'' نہیں ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا اور سننا چاہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ کچھ ان کہیاں ہونٹوں کے پیچھے دبی ہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ انہیں موقع فراہم کیا جائے۔ میں نے مسکراتے ہوئے لالہ سے کہا۔ ''اگر آپ برا نہ منائیں تو مجھے اس چلڈرن پارک کے کچھ نشیب و فراز دکھا دیں۔ یہ تو واقعی سندر جگہ ہے۔ مجھے تو اپنے لاہور کا اقبال پارک یاد آنے لگا ہے۔''

''وائی ناٹ۔'' اس نے کہا اور اٹھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں روش پر چلتے ہوئے ایک دوجے سے باتیں کرنے لگے۔ وہ ہندو تھی تاہم اس کا لب و لہجہ یکسر پنجابی تھا۔ وہ بولی۔ ''مجھے تو کرکٹ کا زیادہ شوق نہیں لیکن میرے بڑے بھائی جان

دیوانے ہیں۔ کھیل کے بارے میں اندازے بھی بڑے ٹھیک لگاتے ہیں۔ کل ہی کہہ رہے تھے یہ دیسم راجہ سنچری بنا کر جائے گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میاں داد کے حوالے سے بھی انہیں کافی اندیشے ہونے چاہئیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دھیرے دھیرے ہماری گفتگو کا رخ امریتا اور ارباز کی طرف مڑ گیا۔ لالہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "وائم صاحب! امریتا آپ کے دوست سے واقعی بہت بہت پریم کرتی ہے۔ وہ اس معاملے میں کافی آگے نکل گئی ہے۔ مجھے یہ جانکاری نہیں ہے کہ آپ کے دوست اس معاملے میں کتنے سنجیدہ ہیں۔"

"اس کی سنجیدگی کا اندازہ آپ اس بات سے لگالیں کہ وہ یہاں آپ کے شہر میں موجود ہے۔ یہاں آنے کے لئے وہ پچھلے کئی مہینوں سے جس طرح پھڑک رہا تھا اس بارے میں کچھ میں ہی جانتا ہوں۔"

لالہ نے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "آپ کا کیا وچار ہے۔ کیا ارباز بھائی اس حد تک سنجیدہ ہیں کہ وہ امریتا کے ساتھ بیاہ کر لیں۔"

"میرے خیال میں وہ اس سے بھی زیادہ سنجیدہ ہے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ امریتا غیر مذہب اور غیر ملک کی ہے۔ ان کے ملنے میں بہت زیادہ رکاوٹیں ہوں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ انڈیا ہی کا ایک گانا ہے' پیار دیوانہ ہوتا ہے' مستانہ ہوتا ہے۔"

وہ بھی مسکرائی۔ "لیکن آپ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ یہ ایک فلمی گانا ہے۔ فلم اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں باؤ جی کے بارے میں سوچتی ہوں تو بہت پریشان ہو جاتی ہوں۔"

"باؤ جی؟ یہ کون ہیں؟"

"امریتا کے باپو اتنے سادہ اتنے بھلے مانس ہیں کہ شاید آپ سوچ بھی نہ سکیں۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے اتنی عمر میں بھی سخت محنت کرتے ہیں۔ امریتا ان سے بڑا پریم کرتی ہے۔ سب کچھ سہہ سکتی ہے۔ لیکن ان کی تکلیف نہیں سہہ سکتی۔ پر

مشکل یہ ہے کہ جو راستہ اس نے چنا ہے وہ مصیبتوں والا راستہ ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کوئی بڑی کٹھنائی سامنے نہ آ جائے۔"

ہم دور ایک جامن کے نیچے لکڑی کے ایک بنچ پر جا بیٹھے اور باتیں کرتے رہے۔ امریتا کے حوالے سے میری معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ یہ تو مجھے پتہ تھا کہ امریتا کی والدہ عرصہ پہلے فوت ہو چکی ہیں اور اس کا اکلوتا بڑا بھائی اپنی پتنی کے ساتھ کولمبو میں رہتا ہے۔ لالہ کی باتوں سے پتہ چلا کہ امریتا کے بھائی کے گھر چھوڑنے کی وجہ امریتا کے باپو کی حد سے بڑھی ہوئی سادگی اور دیانتداری تھی۔ وہ ریونیو کے محکمے میں ہیڈ کلرک کے طور پر کام کرتے تھے۔ اور ایسی جگہ پر تھے کہ "کوشش" کر کے لاکھوں کما سکتے تھے۔ مگر ان کی بس دال روٹی چلتی تھی۔ بیٹا اور ذہن کا تھا۔ باپ سے اس کا جھگڑا رہتا تھا۔ بہو بھی ایسی ملی جو بیٹے سے دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ اسے لے کر اڑن چھو ہو گئی......

میں لالہ کی باتیں سن رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ دور بیٹھے ارباز اور امریتا کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ہوا میں نوخیز امریتا کے بال بار بار اڑ رہے تھے۔ وہ انہیں سنبھالتی ہوئی ارباز سے باتیں کرتی ہوئی بڑی خوش رنگ لگ رہی تھی۔ عجیب معصومیت تھی اس کے انداز میں۔ کسی بات پر وہ ہنستی' شرما کر دہری ہوتی اور پھر تیزی سے سیدھی ہو کر بالوں کو پیچھے کی طرف سنبھالتی ...... انہیں دور سے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ارباز آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا ہے اور اس کی باتوں میں تھوڑی سی بے باکی آ گئی ہے۔

چلڈرن پارک میں ہونے والی یہ دلچسپ و خوشگوار ملاقات دوپہر دو بجے کے قریب ختم ہوئی اور ہم دونوں واپس اپنے ٹھکانے پر یعنی ڈی اے وی ہوسٹل آ گئے۔

واپسی پر ارباز بہت خوش تھا۔ اس کے پاؤں جیسے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ہوسٹل کے بڑے گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے سڑک کراس کی تو بے دھیانی میں ارباز ایک سائیکل رکشا سے جا ٹکرایا۔ اس کی دائیں ہاتھ کی انگلی پہلے ہی زخمی تھی۔ رکشا ٹکرانے سے مزید زخمی ہو گئی۔ خون رسنے لگا۔ قریب ہی ایک میڈیکل سٹور نظر آیا۔ میں اسے میڈیکل سٹور پر لے گیا تاکہ پٹی ہو سکے۔ میڈیکل سٹور پر پکے رنگ کا ایک بندو موجود تھا۔ کیا ہوا ہے بھائی صاحب کو؟ اس نے پوچھا۔

"محبت اندھی ہوتی ہے اور ان کو وہی ہوگئی ہے جی۔" میں نے زیر لب کہا۔

میڈیکل سٹور والے نے انگلی دیکھی۔ "ان کو تو شاید پہلے بھی زخم لگا ہوا ہے۔"

جن دنوں ہم انڈیا گئے اس سے کچھ روز پہلے بقر عید تھی۔ عید پر گائے ذبح کرتے ہوئے ارباز کی انگلی پر کٹ لگ گیا تھا۔ میڈیکل سٹور والے کے استفسار پر ارباز نے سادگی سے یہی بات اسے بتادی۔

گائے ذبح ہونے کی بات پر وہ ایکدم چونک کر ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی سی اتر آئی۔ بے حد خشک لہجے میں بولا۔ "آپ مذاق میں کہہ رہے ہیں یا واقعی ایسا ہوا ہے۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ بے خیالی میں نامناسب بات ہم نے کہہ دی ہے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہمارے جواب دینے سے پہلے ہی میڈیکل سٹور والے نے ارباز کا ہاتھ جھٹک دیا اور ایک دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد ارباز نے پوچھا۔ "کوئی دوائی ہے آپ کے پاس...... انگلی کے لئے؟"

"نہیں۔" بے رخی سے مختصر جواب دیا گیا۔

ہم اپنا سا منہ لے کر باہر نکل آئے اور ایک دوسرے سٹور سے دوا لی۔ میں نے کہا۔ "دیکھ بھائی! تو بڑا خوش خوش ہے آج ...... لیکن یہ جو فرق ہے ناں ندی کے دونوں کناروں میں اس کو بھی ضرور دیکھ لینا۔"

ارباز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں آنے تک وہ سب کچھ بھول گیا۔ اور مجھے آج کی ملاقات کی تفصیل بتانے بیٹھ گیا۔ میں بھی یہ سب سننے کے لئے بے تاب تھا۔ اس نے میری گود میں سر گھسیڑا اور سگریٹ کا چھوٹا سا کش لے کر بولا۔ "سچ دای! ایسے لگنے لگا ہے اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ اب اس سے دور رہنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ بہت مشکل ہو جائے گا یار!"

"کیا کہتی ہے وہ؟"

"وہ سب کچھ جو میں چاہتا ہوں۔ ابھی تو اس کی آنکھیں ہی بول رہی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے دو چار دن میں اس کے ہونٹ بھی وہ سب کچھ بولیں گے جو میں

آنکھوں سے سن رہا ہوں۔"

"سنا ہے اس کے والد ہیڈ کلرک ہیں اور بڑے بھلے مانس آدمی ہیں۔"

"بھلے مانس بھی اور روشن خیال بھی' ملازمت کے علاوہ وہ پارٹ ٹائم ٹیچنگ بھی کرتے ہیں۔ کہنے کو تو ان کا تعلق سکھ فیملی سے ہے لیکن حقیقت میں وہ بالکل لبرل ذہن رکھتے ہیں۔ ہر مذہب کو اچھا سمجھتے ہیں۔ امریتا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر کسی وقت کسی مرحلے میں مذہب کی تبدیلی کا مسئلہ پیش آیا تو یہ بڑی آسانی سے حل ہو جائے گا...... لیکن ارباز کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے اس کا کان مروڑا۔ "رک کیوں گئے؟"

"وہ بھی رک گئی تھی۔" ارباز نے طویل سانس لی۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ کہنا چاہ رہی تھی وہ۔ مگر اس نے کہا نہیں۔ ٹال گئی۔ کہتی تھی پھر بتاؤں گی...... شاید پرسوں بتائے۔"

"پرسوں؟ کیا مطلب؟ کل ملاقات نہیں ہوگی؟"

"نہیں۔" ارباز نے قدرے اداسی سے سر ہلایا۔ "کل کالج میں اس کا فائنل پریکٹیکل ہے' وہ مس نہیں کر سکتی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ اسے پتہ بھی ہے کہ ہم صرف پانچ دن کے لئے یہاں ہیں۔ پھر وہی فاصلے درمیان میں ہوں گے۔ وہ اپنے دیس ہم اپنے دیس۔"

"بھئی مجبوریاں بھی تو ہوتی ہیں۔ پرسوں وہ ضرور آئے گی۔"



اگلے روز کچھ بھی نہ ہو سکا۔ نہ کرکٹ میچ نہ امریتا کا پریکٹیکل، وقفے وقفے سے تیز بارش ہوتی رہی۔ ہم بھی کمرے میں گھس کر بیٹھے رہے یا پروفیسر امتیاز کی محفل میں ان کی گراں قدر باتیں سنتے رہے۔ ارباز نے امریتا سے رابطہ کیا۔ وہاں سے یہ مایوس کن اطلاع ملی کہ چونکہ پریکٹیکل اب کل ہے اس لئے ملاقات پرسوں ہی ہو پائے گی۔

اگلے روز ہم خانہ پری کیلئے کرکٹ میچ دیکھنے چلے گئے۔ انڈیا کی اننگ کا آغاز اچھا نہیں تھا۔ پاکستانی انکلوژر میں زبردست جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ نعرے لگ رہے تھے۔ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ بات پہلے سے طے تھی کہ ٹیسٹ میچ کے پانچوں روز پاکستانی شائقین کے لئے لنچ میزبانوں کی طرف سے ہوگا۔ پاکستانی شائقین اس فری لنچ کے حوالے سے خاصے جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس جوش وخروش کو برقرار رکھنے کیلئے میزبانوں نے یہ اہتمام کیا تھا کہ لنچ کے لئے بکرے پاکستانیوں کے سامنے ذبح کئے جاتے تھے تاکہ جھٹکے وغیرہ کا شک نہ رہے۔ سکھ بھائیوں کی یہ ادا پاکستانی شائقین کو خاصی پسند آئی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب سکھ تحریک زوروں پر تھی اور ابھی دربار صاحب امرتسر میں جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ اور اس کے جانثار ساتھیوں کا گلو کاٹا نہیں ہوا تھا۔

لنچ کے وقفے پر میں اور ارباز انکلوژر سے باہر نکلنے لگے تو میری نگاہ ساتھ والے انکلوژر میں ایک اچھلتی کودتی لڑکی پر پڑی۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ امریتا تھی۔ نوخیز، چنچل، اس کا رنگین آنچل لہرا رہا تھا۔ عریاں بازو فضا میں بلند تھے۔ میں نے ارباز کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ ارباز نے بھی جوابی طور پر ہاتھ ہلائے...... پھر ہم دونوں پروفیسر امتیاز صاحب کی نگاہ بچاتے ہوئے

انکلوژر سے باہر آ گئے۔ دو چار منٹ بعد وہ بھی پہنچ گئی۔

"السلام علیکم۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر بڑی ادا سے کہا۔

ہمارے اردگرد موجود پاکستانیوں کے لئے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ مقامی لڑکی ہے یا ہمارے ساتھ ہی پاکستان سے آئی ہے۔ بس ایک چیز جو اسے قدرے مختلف ظاہر کر رہی تھی۔ وہ اس کا لباس تھا۔ وہ معمولی کپڑے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اور ایسا صرف امریتا کے ساتھ ہی نہیں تھا۔ یہاں جالندھر میں ہمیں اکثر خواتین وحضرات کے لباس معمولی ہی نظر آئے۔ طبقہ امرا سے تعلق رکھنے والوں کے لباس بھی عام لاہوریوں کے لباس سے بہتر نہیں ہوں گے۔

"آپ نے تو آج آنا نہیں تھا۔" ارباز نے کہا۔

"میں نے سوچا دو چار دن تو آپ نے رہنا ہے۔ پھر آج کا دن بھی ضائع کیوں کیا جائے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"تو...... پھر کہاں چلنا ہے؟"

"جہاں آپ چاہیں۔"

"کوئی فلم نہ دیکھیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"ابھی فلم کا ٹائم کہاں ہوا ہے؟" ارباز بولا۔

وہ مسکرائی تو اس کے دانت کلیوں کی طرح کھل گئے۔ "میرے خیال میں آپ کے دوست آپ سے زیادہ جانتے ہیں۔" وہ ارباز سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ہمارے ہاں سینماؤں کے شو صبح نو بجے سے شروع ہو جاتے ہیں، یعنی جو کام کا ٹائم وہی تفریح کا ٹائم۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ بچے اسکولوں، کالجوں سے پھوٹ کر سینما گھروں میں گھس جاتے ہوں گے۔" ارباز نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"ہاں ایسا تو ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اب بھی تین بچے پھوٹ کر یہی پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"چلیں آپ تو اپنے پریکٹیکل سے پھوٹ کر آئی ہیں۔ لیکن ہم کہاں سے پھوٹے ہیں۔" ارباز نے استفسار کیا۔

”آپ کرکٹ میچ سے چھوٹ رہے ہیں۔“ وہ بولی اور اس کے ساتھ ہی حسب عادت ہنس کر دہری ہوئی۔

وہ دہری ہوئی تو اس کے بال اوڑھنی کے نیچے سے نکل کر کمر پر پھسلنے لگے۔ میں نے اور ارباز نے ایک ساتھ اس کے بالوں کو دیکھا اور دنگ رہ گئے۔ اس کے بال غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ اتنے لمبے کہ نگاہ پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ یہ بال اس کی پشت سے آگے پنڈلیوں کے بالائی حصے تک چلے جاتے تھے۔ کل ان بالوں پر ہماری نظر نہیں پڑی تھی۔ یقیناً انہیں احتیاط سے اوڑھنی میں سمیٹا گیا تھا۔ مگر آج یہ ہمارے سامنے تھے اور ہمیں حیران کر رہے تھے۔ ارباز کے چہرے پر تو باقاعدہ حیرت رقص کر رہی تھی۔

امریتا نے بھی جان لیا کہ ارباز کی نظر کیا دیکھ رہی ہے۔ اس نے ادا سے مسکراتے ہوئے بالوں کو اوڑھنی میں چھپا لیا۔

”آ...... آپ نے تو خط میں لکھا تھا کہ آپ کے بال چھوٹے ہیں اور گرنے سے مزید چھوٹے ہو رہے ہیں۔“ ارباز نے کہا۔

”یہ تو نہیں لکھا تھا کہ چھوٹے ہیں۔ ہاں یہ ضرور لکھا تھا کہ گرنے سے چھوٹے ہو رہے ہیں۔“

”اگر یہ چھوٹے ہیں تو پھر لمبے کتنے ہوں گے؟“ ارباز کا لہجہ ستائشی تھا۔

امریتا سرخ ہو گئی۔

ہم اسٹیڈیم کی حدود سے نکلے اور سڑک پر آ گئے۔ امریتا نے ایک سائیکل رکشا والے کو اشارے سے روکا اور ہمیں لے کر اس پر سوار ہو گئی۔ سائیکل رکشا جالندھر کی سڑکوں پر آگے بڑھنے لگا۔ درمیان میں ارباز تھا، ایک طرف امریتا اور دوسری طرف میں۔ سائیکل رکشا پر سفر کرتے ہوئے ایکدم مجھے احساس ہوا کہ ماحول کے سبب انسان کی سوچ اور اس کی قدریں کتنی تیزی سے تبدیل ہوتی ہیں۔ فقط دو دن پہلے جب ہم جالندھر میں اترے تھے اور ہم نے غریب صورت مدقوق افراد کو جانوروں کی طرح سائیکل رکشا کھینچتے دیکھا تھا تو دل کو ملال ہوا تھا۔ کم از کم میں نے تو یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اس ”انسانیت سوز“ سواری پر ہرگز نہ بیٹھوں گا۔ لیکن آج میں اطمینان سے رکشا پر براجمان تھا اور ہانپتے کانپتے ہوئے رکشا والے کو دیکھ رہا تھا۔

امریتا ہمیں اپنے شہر کی سیر کرانے کے موڈ میں تھی۔ سینما کی طرف جانے سے پہلے وہ ہمیں جالندھر کے ایک بارونق بازار میں لے گئی۔ یہاں دودھ، دہی اور کھیر کی بہت بڑی دکان تھی۔ وہ بولی۔ ”یہاں کی کھیر پورے شہر میں مشہور ہے۔ لوگ پیک کروا کے دوسرے شہروں میں بھی لے جاتے ہیں۔“

جونہی ہم رکشا سے اترے سکھ دکاندار خود سیڑھیاں اتر کر ہمارے پاس آ گیا۔

”او ساڈے پاکستانی متر آئے۔“ اس نے چہک کر کہا اور ہم سے بگلے ملنا شروع ہو گیا۔

اس کی دکان پر خالصہ تحریک کا پوسٹر آویزاں تھا۔ اس نے ہمیں بڑی محبت سے کھیر کھلائی اور پیسے لینے سے صاف انکار کیا۔

سہ پہر تین بجے کے قریب ہم ایک اور سائیکل رکشا پر بیٹھے اور سینما گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ہم ایک دوجے سے بے تکلف ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے امریتا سے پوچھا۔ ”بھئی آج آپ کی ساتھی دکھائی نہیں دے رہی، کہاں ہیں محترمہ؟“

”وہ تو کل بھی بڑی مشکل سے میرے ساتھ آئی تھی۔ آج کل اپنی دیدی کی شادی میں بہت مصروف ہے وہ۔“

”تمہیں محترمہ کی اتنی فکر کیوں لاحق ہو گئی ہے؟“ ارباز نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”نہیں، میں تو اخلاقاً پوچھ رہا تھا۔“ پھر میں نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔ ”ہاں، ہماری وہ سکول سے چھوٹنے والی بات تو وہیں رہ گئی۔ اگر سینما کا شو صبح نو بجے چلے گا تو نونہالوں کی نیت تو خراب ہو گی۔“

”اس کا توڑ بھی کیا ہوا ہے سمجھ بوجھ والے لوگوں نے۔“

امریتا نے کہا۔ ”زیادہ تر سینما گھروں میں پہلے ایک دو شو پرانی فلموں کے چلتے ہیں۔ بعض تو اتنی پرانی ہوتی ہیں کہ بلیک اینڈ وائٹ ہوتی ہیں۔ آج کی نئی نسل ان فلموں میں دلچسپی نہیں لیتی۔ یہ فلمیں زیادہ تر ریٹائرڈ اور فارغ لوگ دیکھتے ہیں......“

ایسی ہی باتوں کے دوران ہم سینما گھر پہنچ گئے۔ اس سے پہلے ہم نے بس ”امرتسر ٹی وی“ اور وی سی آر پر بھارتی فلمیں دیکھی تھیں۔ سینما میں بھارتی فلم دیکھنے کا

ہمارا یہ پہلا موقع تھا۔ دونوں حکومتوں میں خیر سگالی کے جو جذبات پائے جا رہے تھے۔ یہ اس کا نتیجہ تھا کہ کشمیر کے مسئلے سے ...... ذرا ایک چھوٹے مسئلے پر بھارت ہمیں خصوصی رعایت دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ یعنی ہم جالندھر کے جس سینما میں بھی جاتے بس اپنا پاسپورٹ دکھا کر بلاٹکٹ فلم ملاحظہ کر سکتے تھے۔ پاکستانی شائقین نے بھارتی حکومت کی طرف سے مہیا کئے جانے والے ''اعتماد سازی'' کے اس ماحول کو بھرپور تقویت پہنچانے کا تہیہ کر رکھا تھا اور جوق در جوق سینماؤں کا رخ کر رہے تھے۔ سینما میں ان دنوں ہیما مالینی کی فلم رضیہ سلطان لگی ہوئی تھی۔ تاریخ کے اس معروف کردار پر مبنی یہ فلم ان دنوں انڈیا کے طول وعرض میں کافی پسند کی جا رہی تھی۔ سینما کے باہر فلم بینوں کے ٹھٹ تھے۔ ہم نے پاسپورٹ دکھا کر دو ٹکٹ آسانی سے حاصل کر لئے اور ہماری فرمائش پر ہمیں تیسرا ٹکٹ بھی دے دیا گیا۔

انڈیا کی فلم انڈسٹری کی طرح وہاں کے سینما ہاؤس بھی تن و توش میں ہمارے سینماؤں کی نسبت کافی بڑے ہیں۔ ہم لق و دق سینما کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ایک اکیلی گیلری ہی مکمل سینما ہال نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی گیلریاں یا باکس بھی ہال کی دیواروں کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ہم گیلری میں بیٹھے تھے اور بیٹھنے کے لئے امریتا نے سب سے آخری قطار چنی تھی۔

فلم کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ امریتا شرما رہی ہے۔ وہ میرے اور ارباز کے درمیان بیٹھی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ ارباز سے شرما رہی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ غیر محسوس طور پر ارباز سے ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی کی شرماہٹ یعنی کبھی کبھی کتنی معصوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھ کر کسی لوا سپاٹ پر جاتی ہے اور جب وہ تنہائی میں اس کی طرف بڑھتا ہے تو وہ کار کے اندر ہی اپنے آپ کو چراتی ہوئی دروازے کے ساتھ لگ جاتی ہے۔ کچھ یہی کیفیت اس وقت امریتا کی ہو رہی تھی۔ فلم رضیہ سلطانہ کے رومانوی پیچ وخم نے فلم بینوں کو سحر میں لے لیا تھا......
جالندھر کے اس سینما گھر میں، میں نے پہلی بار فلم بینوں کو فلم کی شاعری پر داد دیتے دیکھا۔ نغمہ گونج رہا تھا۔ اے دل ناداں، آرزو کیا ہے، جستجو کیا ہے۔
اور کچھ فلم بین، مشاعرے کے انداز میں باقاعدہ ہاتھ لہرا لہرا کر داد دے رہے

تھے۔ اسی دوران میں، میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ امریتا کا ہاتھ ارباز کے ہاتھ میں تھا۔ وہ گاہے بگاہے ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی بھی کر رہے تھے...... یہ پریم کہانی آگے بڑھ رہی تھی۔

ہوسٹل واپس آنے کے بعد میں نے ارباز سے سب سے پہلے کل والی ادھوری بات کے بارے میں پوچھا۔ امریتا کل ارباز کو کچھ بتاتے بتاتے رہ گئی تھی۔
میں نے کہا۔ ''ہاں بھئی! تمہاری پریمیکا نے کل والی آدھی بات پوری کی یا نہیں؟''

''مجھے تیری جاسوسی طبیعت کا پتہ تھا۔ میں جانتا تھا تم سب سے پہلے یہی سوال پوچھو گے۔''

''تو پھر کیا جواب ہے اس سوال کا۔''

وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''امریتا کے باپو جی کے کوئی دوست ہیں پرتاپ صاحب، ان کا بیٹا سنگاپور میں ملازمت کرتا ہے۔ وہ اس کے لئے امریتا کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ امریتا کے باپو جی نے نیم رضامندی ظاہر کر رکھی ہے۔ لیکن باقاعدہ ہاں نہیں ہوئی۔ وہ اکلوتی بیٹی کو پرائے دیس میں بھیجنے سے ڈر بھی رہے ہیں۔ مگر دوسری طرف یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ رشتہ بہت اچھا ہے۔ وہ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ لڑکا بہت اچھی طرح سیٹ ہے۔''

''کہیں یہ کوئی بھاؤ بڑھانے وغیرہ کا چکر تو نہیں؟'' میں نے ازراہ مذاق کہا۔

''نہیں دای! وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ تم کئی مہینوں سے اس کے خط پڑھ رہے ہو۔ اب اس سے مل بھی چکے ہو۔ وہ حقیقت حال بیان کر رہی ہے۔''

''اچھا، اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟''

''وہ مجھے اپنے باپو سے ملانا چاہتی ہے۔''

''اور تم؟''

''میں بھی ملنا چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں کیا بات ہے یار! ان کو دیکھنے سے پہلے ہی ان کی ایک بڑی پیاری سی تصویر میرے ذہن میں بن گئی ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے کر ڈالو یہ کام بھی۔'' میں نے کوک کے ساتھ نمکو کھاتے

ہوئے کہا۔

''ہم دونوں چلیں گے یار!''

''نہ بابا نہ، محبوبہ کا باپ جیسا بھی ہو بہرحال باپ ہوتا ہے۔ اس کی ساری نرم مزاجی کسی بھی وقت سختی میں بدل سکتی ہے۔ اور میں یہاں اپنی ہڈی پسلی نرم کرانا نہیں چاہتا۔ پرایا دیس ہے۔ پرائے ڈاکٹر ہیں۔ اس میڈیکل سٹور والے کا رویہ تو تم نے دیکھا ہی تھا۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ اس نے ناراضگی سے کہا اور رخ پھیر کر لیٹ گیا۔ ایک دو منٹ یونہی گزرے۔ پھر میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پیارے! جہاں اتنا کچھ کیا ہے وہاں یہ ایک کڑوا گھونٹ اور سہی' میں چلوں گا تیرے ساتھ بلکہ وہ سب کچھ بھی کہوں گا جو تیرے لئے کہنا مشکل ہو گا۔ کہہ دوں گا ان سے' باپو جی! یہ لڑکا آپ کی دھی رانی سے اتنی محبت کرتا ہے۔ جتنی رانجھے نے...... میرا مطلب ہے مہینوال نے بھی اپنی سوہنی سے نہیں کی ہو گی۔ وہ سرحد کا چناب پار کر کے آپ کے پاس آ گیا ہے۔ اب اس کو مایوس واپس نہ جانے دیں...... بتا کب جانا ہے باپو جی کے پاس؟''

''کل شام...... یا پرسوں سویرے۔'' ارباز نے نیم ناراض لہجے میں کہا۔

''کل سویرے کا کیا پروگرام ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کل امریتا ہمیں جالندھر کی سیر کرائے گی' قابل دید جگہیں دکھائے گی۔''

''میرے خیال میں تم مجھے کباب میں ہڈی نہ بناؤ۔ کل اکیلے ہی نکل جاؤ اس کے ساتھ۔ بعد میں اگر باپو جی کے پاس جانا ہوا تو ہم اکٹھے چلے جائیں گے۔''

''نہیں دای! مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ ہم دونوں جائیں گے۔ رہی کباب میں ہڈی والی بات تو لالہ بھی ساتھ ہو گی۔ تم لالہ سے گپ شپ لگاتے رہنا۔''

اگلے روز دس بجے کے قریب امریتا اور لالہ تیار ہو کر پروگرام کے مطابق ڈی اے وی ہوسٹل کے سامنے سڑک پر پہنچ گئیں۔ امریتا آج ایک سستی لیکن خوش رنگ ساڑھی میں تھی۔ لالہ نے حسب سابق شلوار کرتہ پہن رکھا تھا۔ ہم لوکل بس میں بیٹھے اور سب سے پہلے جالندھر کے مشہور ''شیو مندر'' پہنچے۔ امریتا اور لالہ دونوں اسمارٹ

تھیں۔ تاہم امریتا کا سراپا زیادہ دلکش تھا۔ وہ ساڑھی میں لپٹی ہوئی موی گڑیا کی طرح نظر آتی تھی۔ معصوم اور سادہ۔ اس کے لمبے بال راہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے بالوں کو جان بوجھ کر اس طرح باندھ رکھا ہے کہ ان کی طوالت کم محسوس ہو۔ وہ ارباز کے پہلو میں چل رہی تھی۔ اور دونوں ایک خوبصورت جوڑی کی طرح نظر آتے تھے۔

وہ کسی گائیڈ کی طرح ہمیں شیو مندر کے احاطے میں لے آئی۔ ہمیں یہ عجیب بات نظر آئی کہ مندر کا داخلی گیٹ بالکل مسجد جیسا تھا جبکہ اندرونی حصہ عام مندروں کی طرح تھا۔ امریتا ہمیں بڑی روانی سے بتاتی چلی گئی۔ یہ گرمنڈی کا علاقہ ہے۔ اس مندر کا تعلق لودھیوں کے دور سے ہے۔ اسے نواب آف سلطان پور نے تعمیر کیا تھا۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے علیحدہ علیحدہ طرز تعمیر کا مشترکہ نمونہ ہے......''

امریتا ہمیں مندر دکھا رہی تھی۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ ارباز صرف امریتا کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسا والہانہ پن تھا۔ جسے لفظوں میں شاید بیان نہ کیا جا سکے۔ جب امریتا اور ارباز ایک دوجے کو دیکھتے تھے تو وہ ایک خاص الخاص نظر ہوتی تھی۔ ایسی نظر جو دوسروں کو چونکا دیتی ہے۔ لیکن جو ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہا گیا ہے کہ پیار کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ وہ بس اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اپنے آس پاس کو نہیں۔

ہم شیو مندر دیکھنے کے بعد باہر نکلے۔ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ سامنے ہی سڑک کے کنارے ایک ریڑھی کھڑی تھی۔ ہمیں یہ شربت کی ریڑھی لگی۔ ارباز ریڑھی کی طرف بڑھا تو امریتا اور لالہ دونوں مسکرانے لگیں۔ ''اچھا تو یہ شوق بھی کرتے ہیں آپ؟'' امریتا نے شوخی سے کہا۔

''باپ رے۔'' اچانک میں نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا۔

ارباز نے بھی دھیان سے ریڑھی کے اسباب کو دیکھا اور جان گیا کہ یہ شراب کی ریڑھی ہے۔ شراب خانہ خراب کو ''شربت یا کانجی'' کی طرح ریڑھی پر بکتے ہوئے ہم نے پہلی بار جالندھر کی اس سڑک پر دیکھا۔ ریڑھی پر خانہ ساز اور فیکٹری ساز دونوں

قسم کی شرابیں موجود تھیں۔

ہم نے کچھ فاصلے پر ایک کھوکھا نما دکان سے رجوع کیا اور وہاں سے کولڈ ڈرنک کی بوتلیں خریدیں۔ ایک اسٹابری کا ذائقہ تھا۔ ایک سنگترے کے ذائقے والی بوتل تھی۔ ارباز کی نگاہ کے رخ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سنگترے کے فلیور کا ایک گھونٹ چکھنا چاہتا ہے۔ میں بوتل کو منہ کی طرف لے جاتے ہوئے رک گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ میں نے بوتل کا پہلا گھونٹ بھر لیا تو پھر ارباز گھونٹ نہیں بھرے گا۔ ''جوٹھ موٹھ کا'' اسے ہمیشہ سے بہت خیال رہتا تھا۔ گہرے دوستوں میں اس طرح کا تکلف نہیں ہوتا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ ارباز کی مجبوری ہے۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے نفسیاتی مسئلے ہر شخص کے ساتھ ہوتے ہیں۔

شیو مندر سے ہم پھر ایک سائیکل رکشا پر بیٹھے۔ اب امریتا کا ارادہ ہمیں ''گرودوارا پادشاہی'' دکھانے کا ارادہ تھا۔ ہم سائیکل رکشا پر بیٹھ چکے تو اچانک مجھے سائیکل رکشا کی تصویر کھینچنے کا خیال آیا۔ میں نے ارباز سے کہا یار! ایک فوٹو سائیکل رکشا پر سواری کرتے ہوئے بھی ہونی چاہیے۔

ارباز تصویر کھینچنے میں مصروف ہو گیا۔ رکشا والے کو ہدایت کی گئی کہ وہ دونوں ہاتھ ہینڈل پر رکھ کر درست پوز بنائے۔ تصویر کھینچی جا چکی تو ایکدم میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ ایک بار پھر مجھے ماحول اور معاشرت کے زبردست اثر و رسوخ کا احساس ہوا۔ دو تین دن میں ہی ماحول نے مجھ پر بلکہ ہم دونوں پر اتنا اثر ڈالا تھا کہ ہم سائیکل رکشا پر باقاعدہ پوز بنا کر تصویریں اتروا رہے تھے جبکہ پہلے دن اس سائیکل رکشا کو ہم نے ایک ''غیر انسانی'' سواری قرار دیا تھا۔

سائیکل رکشا جالندھر کی سڑکوں پر دوڑنے لگا۔ ارباز نے کہا۔ ''یار! میں تو حیران ہوں یہاں ریڑھیوں پر شراب بکتی ہے۔''

''یہ شراب کا گڑھ ہے بھئی! انڈیا میں پنجاب کو شراب سازی میں خاص مقام حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ شراب سازی کی سب سے بڑی فیکٹری یا کارخانہ بھی یہیں کہیں پنجاب میں موجود ہے۔''

''آپ کی معلومات کافی وسیع ہیں۔'' لالہ نے تعریف کی۔

''ارباز سے دوستی اپنی جگہ لیکن میں پڑھا لکھا بندہ ہوں محترمہ۔'' میں نے کہا۔

امریتا ہنستے ہوئی بولی۔ ''جانکاریاں (معلومات) تو ارباز کی بھی کم نہیں ہیں۔ میں تو ان کے خط پڑھ پڑھ کر آدھی جغرافیہ دان ہو گئی ہوں۔''

''جغرافیہ لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ کوئی بھی بندہ اٹلس دیکھ کر خود کو جغرافیہ دان ظاہر کر سکتا ہے۔''

''مگر انہوں نے صرف جغرافیہ ہی تو نہیں لکھا۔'' امریتا نے ارباز کی وکالت جاری رکھی۔

لالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شما کیجئے گا' ارباز صاحب کے لکھے ہوئے ایک دو پتر میں نے بھی دیکھے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے دل سے لکھا ہے اور دل سے لکھی ہوئی بات چاہے بہت وزنی نہ بھی ہو مگر اثر کرتی ہے۔ اپنی تحریر میں کہیں کہیں یہ شعر بھی کوٹ کرتے ہیں اور یہ بہت برمحل ہوتے ہیں۔''

انہی باتوں کے دوران میں ہم گرودوارہ پہنچ گئے۔ یہ گرودوارہ واقعی جالندھر کا قابل دید مقام ہے۔ یہاں ہمیں سکھ مرد و زن اور بچے ننگے پاؤں گھومتے اور مختلف مذہبی رسمیں ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ امریتا بڑے ہلکے پھلکے انداز میں ایک بار پھر گائیڈ کے فرائض انجام دینے لگی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ سکھوں کے چھٹے گرو ہرگوبند جب جالندھر گئے تو دوآبہ کے دورے کے دوران میں ان کی ملاقات ایک مسلمان درویش سے ہوئی۔ اس مسلمان درویش نے گرو صاحب سے چند سوالات پوچھے اور پھر ان سوالات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ چھٹے گرو صاحب اس روحانی گفتگو سے بے حد متاثر ہوئے۔ بعد ازاں گرو صاحب نے یہ گرودوارہ تعمیر کروایا اور یہ عین اسی جگہ پر تھا جہاں مسلمان درویش سے ان کی تاریخی بات چیت ہوئی تھی۔

''مسلمان درویش کا نام کیا تھا؟'' میں نے امریتا سے پوچھا۔

''جہاں تک میری جانکاری ہے۔ ان کے نام کا ریکارڈ نہیں۔''

''غالباً اس گرودوارے میں گرنتھ صاحب کا کوئی قدیم قلمی نسخہ بھی پڑا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

لالہ اور امریتا نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھ کر تائید کی۔ قلمی نسخہ

دیکھنے کے بعد ہم باہر نکل آئے۔ اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ قریب ہی ایک مناسب سا ریستوران دیکھ کر ہم اندر گھس گئے۔ امریتا نے ہماری پسند پوچھنے کے بعد کھانا منگوایا تاہم ارباز نے شرط رکھی کہ اس مرتبہ بل ہم ادا کریں گے۔ کھانے میں چاول، ترکاری، گوشت اور روٹی تھی۔ ہم دونوں نے ترکاری اور چاول کھانا پسند کئے۔ امریتا نے ترکاری کے ساتھ تھوڑا سا گوشت کا سالن بھی پلیٹ میں ڈالا۔ شاید اس طرح وہ اپنے ''لبرل ازم'' کو ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

''یہ کس چیز کا گوشت ہے؟'' ارباز نے پوچھا۔

''مکس'' امریتا نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''یہاں ملا جلا ماس پکانے کا رواج بھی ہے۔ اس سالن میں چکن، بیف اور Pork کے ٹکڑے ملے جلے ہیں۔''

ہمیں کچھ عجیب سا لگا۔ تاہم اردگرد موجود افراد میں سے کئی بڑی رغبت سے یہ سالن کھا رہے تھے۔ ''بڑا سیکولر سالن ہے یہ'' میں نے کہا۔

''ٹھیک کہا آپ نے۔'' وہ مسکرائی۔

''اور جو جگہیں آج تم نے دکھائی ہیں وہ بھی سیکولرازم کو بڑھاوا دینے والی تھیں۔''

ارباز نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی شیو مندر...... جس کا دروازہ مسجد کا اور احاطہ مندر کا تھا اور پھر گرودوارہ پادشاہی جو ایک مسلمان درویش کی نسبت سے تعمیر کیا گیا اور اب یہ سالن۔''

وہ بولی۔ ''میں نے کچھ بھی سوچ سمجھ کر نہیں کیا۔ بس جو من کے اندر کا موسم ہوتا ہے وہی باہر بھی نظر آنے لگتا ہے۔''

''یعنی تمہارے من کے اندر کا موسم بدلا ہوا ہے۔'' ارباز نے کہا۔

''کچھ کچھ۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔ اور پھر خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کے غیر معمولی لمبے بالوں کی کچھ لٹیں چہرے کی طرف پھسل آئیں۔

ارباز اب امریتا کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔ دوسری طرف وہ بھی ذرا سی جھجک کے ساتھ یہی صیغہ استعمال کر رہی تھی۔

''اب کہاں کا ارادہ ہے دوستو؟'' میں نے کولڈ ڈرنک کے آخری گھونٹ کے ساتھ لنچ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اب آپ کو درشن کرائیں گے سینٹ میری کیتھڈرل چرچ کے۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوبصورت پارک بھی ہے۔''

''لیکن میں اب ''آ گیا'' چاہوں گی۔ لالہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں کیول اڑھائی بجے تک کا ٹائم لے کر آئی ہوں۔ چندی گڑھ سے بہت ضروری کال آنی ہے میری۔''

ہم دونوں نے لالہ کو روکنا چاہا لیکن وہ رک نہیں سکتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہم سے رخصت ہو کر چلی گئی۔ لالہ کے جانے کے بعد میں نے ارباز سے کہا۔

''بھئی! میرا خیال ہے اب تم دونوں ذرا اکیلے گھوم پھر لو۔ میں یہاں کوئی دکان تلاش کر کے حجامت بنواتا ہوں اور ہوسٹل واپس چلا جاتا ہوں۔''

''امریتا نے اٹھلا کر بڑی ادا سے میرا بازو تھام لیا۔ ''نہیں جی! آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' یہ فقرہ کہتے ہوئے اس نے ایک ترچھی، شرمیلی نگاہ ارباز پر ڈالی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ امریتا کے ساتھ ارباز کی محبت بھری بے تکلفی بتدریج بڑھ رہی ہے۔

''آپ مجھے درمیان میں کیوں رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ شخص تعلقات خراب کرنے میں دو منٹ نہیں لگاتا۔ ہماری برسوں کی دوستی پلک جھپکتے میں غارت ہو جائے گی۔''

امریتا نے قہقہہ لگایا اور اس کے طویل بال منتشر ہونے لگے۔

اس مرتبہ ہم بذریعہ بس ''سینٹ میری چرچ'' جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر عین وقت پر پروگرام بدل گیا۔ مطلوبہ بس نہیں مل رہی تھی۔ امریتا نے کہا۔ ''چلئے'' میں آپ کو دیش بھگت میموریل ہال دکھا دوں۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''دیش بھگتی کی یادگاریں۔ جن لوگوں نے انگریزوں سے آزادی کے لئے

جانوں کا بلیدان دیا۔ وہ اپنی نشانیوں اور کہانیوں کی صورت میں وہاں موجود ہیں۔"

ہم ایک بار پر سائیکل رکشا پر سوار ہوئے اور میموریل ہال پہنچ گئے۔ اچھی خوبصورت جگہ تھی۔ شائقین بھی نظر آ رہے تھے۔ میں امریتا اور ارباز کو کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑنا چاہتا تھا۔ آئس کریم لینے کے بہانے سڑک کی دوسری جانب چلا گیا۔ امریتا اور ارباز ہال کی عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے جان بوجھ کر دیر لگائی۔ آئس کریم کے تین کپ لے کر جب میں واپس لوٹا تو دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ غالباً دونوں کوئی پرانا خط پڑھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک امریتا نے خط ارباز کے ہاتھ سے چھین لیا......

ارباز نے خط واپس لینے کی کوشش کی۔ امریتا ہنستی ہوئی اٹھ کر پیچھے ہٹی۔ ارباز اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھا۔ امریتا نے جب یہ دیکھا کہ وہ اسے دبوچنے سے بھی گریز نہیں کرے گا تو اس نے خط نیچے پھینک دیا۔ دونوں ہنستے ہوئے واپس درخت کی طرف آئے۔ یہی وقت تھا جب میں نے امریتا کو بری طرح چونکتے ہوئے دیکھا۔ میں فاصلے پر تھا پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ میں نے امریتا کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ ایک سفید بلمن کار کے ادھ کھلے دروازے میں ایک شخص کھڑا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھاری تن و توش کا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ واپس گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

میں امریتا اور ارباز کے پاس پہنچا۔ وہ ایک دم بجھی بجھی اور پریشان نظر آ رہی تھی۔ ارباز بھی اس کی کیفیت بھانپ چکا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے امریتا؟ کون تھے وہ بھائی صاحب؟"

"یہ...... یہ وہی ہیں۔" امریتا نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"کون؟ تمہارے باپو؟"

"نہیں...... انکل پرتاپ، پتہ نہیں یہ کہاں سے آ ٹپکے ہیں۔ بڑے شکی مزاج کے ہیں یہ...... کہیں بات کا بتنگڑ نہ بنا لیں۔"

اس واقعے کے بعد بھی امریتا پندرہ بیس منٹ ہمارے ساتھ رہی مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اکھڑی اکھڑی اور پریشان ہے۔ ہم دیش بھگت میموریل ہال بھی ٹھیک سے

نہ دیکھ سکے۔ اس نے ارباز کو ایک فون نمبر دیا اور بولی۔

"میں دوپہر کو اسٹیڈیم پہنچ جاؤں گی۔ پاکستانی انکلوژر کے سامنے اگر نہ آئی تو پھر تم مجھے اس نمبر پر فون کر لینا۔"

اگلے روز وہ نہیں آئی۔ ارباز بے حد بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ برلٹن پارک اسٹیڈیم بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ایک دلچسپ مقابلے کے بعد میچ ڈرا کی صورت میں ختم ہو چکا تھا۔ پاکستان نے پہلی اننگ میں 337 رنز بنائے تھے۔ انڈیا کا اسکور بھی لگ بھگ یہی تھا۔ دوسری اننگ ہو ہی نہیں سکی تھی۔ اسٹیڈیم کے باہر ایک ہٹا کٹا پاکستانی تماشائی کل اسٹیڈیم میں پیش آنے والے واقع کو مرچ مسالہ لگا کر بیان کر رہا تھا۔ اس کے بقول کل پاکستانی انکلوژر میں وزٹ کرنے والے ایک اعلیٰ انڈین عہدیدار کو تماشائیوں نے گھیر لیا تھا۔ اور اس سے فرمائش کی تھی کہ انہیں دہلی اور آگرہ وغیرہ کی سیر کرائی جائے۔ یہ عہدیدار غالباً ایس ایس پی یا کوئی اس سے بڑا افسر تھا۔ سکھ ہونے کی وجہ سے وہ پاکستانی تماشائیوں کی "مسکہ کاری" میں آ گیا تھا۔ اور اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے پاکستانی بھائیوں کے منورنجن (خوشی) کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

دوپہر ایک بجے ارباز نے پی سی او سے امریتا کے بتائے ہوئے نمبر پر فون کیا۔ یہ فون کال امریتا کی سہیلی للیتا یعنی لالہ نے ریسیو کی۔ ارباز کی آواز پہچان کر اس نے ہولڈ کرنے کو کہا۔ تقریباً دو منٹ بعد امریتا کی بجھی ہوئی آواز ریسیور پر سنائی دی۔ ارباز اور امریتا کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح تھی۔

ارباز نے کہا۔ "کیا بات ہے امریتا! تم آئی نہیں؟"

امریتا نے کہا۔ "بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہی ہوا ہے جس کا مجھے ڈر تھا۔ کل رات انکل پرتاپ ہمارے گھر آئے۔ بند کمرے میں انہوں نے دیر تک باؤ جی سے بات کی ہے۔ پتہ نہیں انہیں کیسے جانکاری ہو گئی ہے کہ آپ پاکستانی ہیں اور صرف مجھ سے ملنے کے لئے انڈیا آئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اور بھی کئی باتیں معلوم ہیں۔ انہوں نے باؤ جی کو بری طرح بھڑکایا ہے۔ باؤ جی بڑے غصے میں ہیں۔ انہوں نے کل سے میرے ساتھ بات نہیں کی۔ جب وہ بات نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت دکھی ہیں۔" امریتا کی آواز بھرا رہی تھی۔

ارباز نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ”یہ سب کیسے پتہ چلا تمہارے انکل پرتاپ کو؟“

”میں کیا بتاؤں‘ میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا۔ لالہ پر مجھے پورا پورا بھروسا ہے۔“

”لالہ نے تو کسی سے بات نہیں کی۔“

”لالہ کی ایک دوست شانتی ہے۔ اس کو تھوڑا بہت معلوم تھا۔ مجھے تو یہی شک ہو رہا ہے کہ شاید اس نے بات آگے بڑھا دی ہے۔ وہ انکل پرتاپ کی دور پار کی رشتے دار بھی ہے۔ لالہ کے ساتھ ہی کالج میں پڑھتی ہے۔“

”بہرحال جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔“

”انکل پرتاپ نے تو باؤ جی سے یہ بھی کہا ہے کہ میں اور آپ ایک دوجے کو دیر سے پتر وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ انکل نے باؤ جی کو بدگمان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔“

”امریتا! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تمہارے باپو جی سے مل لوں؟“

”نہیں اب اس کام کے لئے دیر ہوگئی ہے۔ کم از کم ابھی تو یہ ناممکن ہے۔“

”تو پھر کب ممکن ہوگا۔ تین دن بعد تو ہم جا رہے ہیں۔“

”مم...... میں کیا کروں‘ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”اچھا فون پر اتنی لمبی بات ٹھیک نہیں۔ کیا تم مجھے کہیں ملنے کے لئے آ سکتی ہو؟“

”فی الحال تو یہ بہت مشکل ہے۔“

ارباز نے اصرار کیا تو وہ شدید تذبذب سے گزرنے کے بعد بولی۔ ”تین چار بجے اسی بس شاپ پر ملوں گی جہاں پہلے دن ملی تھی۔“

وہ چار بجے کی بجائے پانچ بجے کے لگ بھگ آئی۔ وہ اکیلی تھی۔ بالکل سمٹی سمٹائی اور زرد رو نظر آتی تھی۔ ایک لمبی چادر میں اس نے خود کو سرتاپا چھپا رکھا تھا۔ وہ اناناس والی ریڑھی کے قریب پہنچی تو ہم بھی کھڑے ہو گئے۔ وہ بغیر کوئی بات کئے ہمارے ساتھ ساتھ اس پارک کی طرف چل دی۔ جہاں ہم پہلے بیٹھے تھے۔

پارک میں شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ سنبل‘ پاپولر اور سرو کے لمبے درخت پہریداروں کی طرح چاروں طرف سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اکا دکا بچے جھولے لینے میں مصروف تھے۔ عمر رسیدہ سکھ عورتوں کی ایک ٹولی ایک درخت تلے بیٹھی گپ شپ میں مصروف تھی۔ ہوسکتا ہے خالصتان کا مسئلہ زیر بحث ہو۔ ہمارے ساتھ بھی ایک مسئلہ تھا۔ اور اس مسئلے نے ہم تینوں کے چہروں پر تناؤ پیدا کر رکھا تھا۔ امریتا توقع سے زیادہ دل گرفتہ نظر آتی تھی۔ ہم نیم کے ایک پھیلے ہوئے درخت تلے لکڑی کے بینچ پر بیٹھے تو امریتا کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو گرنے لگے۔

”ارباز! سب کچھ خراب ہوگیا ہے۔ انکل پرتاپ نے باپو کو بری طرح بدظن کر دیا ہے۔ کتنی جلدی ہر چیز الٹ پلٹ ہوگئی ہے۔“

”اب کیا ہوا ہے؟“

”ابھی دو گھنٹے پہلے انکل پرتاپ اپنے چھوٹے بھائی راج سنگھ اور اس کی پتنی کے ساتھ ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ انکل پرتاپ نے پھر پورے زور سے میرے بیاہ کی بات چھیڑی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بس دس پندرہ دن کے اندر راکیش کے ساتھ میرا بیاہ کر دیا جائے۔ اگر مجھے پڑھنے کا زیادہ شوق ہے تو میں یہ شوق سنگاپور جا کر بھی پورا کر سکتی ہوں۔ میرے لئے نراشا کی بات یہ ہے کہ اب باپو بھی رضامند نظر آ رہے ہیں۔ انہوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھ سے بات کی ہے اور......“ امریتا کی آواز بھرا گئی۔ وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔

یکا یک ہم بری طرح چونک گئے۔ دو صحت مند افراد پارک کا گیٹ پار کر کے بڑی تیزی سے قدم اٹھاتے ہماری طرف آ رہے تھے۔

”ہائے ربا!“ امریتا کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ کھڑی ہوگئی۔

”کون ہیں یہ؟“ ارباز نے پوچھا

”انکل پرتاپ! اور انکل راج!“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

دونوں لمبے چوڑے سکھ اپنی رنگین پگڑیاں چمکاتے ہماری طرف چلے آ رہے تھے۔ دونوں نے سفید کرتے پانجامے پہن رکھے تھے۔ کڑا‘ کنگھا‘ کرپان وغیرہ سب

کچھ ان کے جسم کا حصہ تھا۔ ہم بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جس شخص کو امریتا' انکل پرتاپ کہتی تھی۔ اس کی عمر پچاس پچپن سال تھی۔ تاہم اس کا بھائی راج سنگھ پینتیس چھتیس کا دکھائی دیتا تھا۔ دونوں کے تیور واضح طور پر خراب تھے۔

ہمارے قریب پہنچ کر پرتاپ سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے۔ اپنا پیٹ تھوڑا سا آگے کیا اور بالوں بھری گردن کو دائیں طرف تھوڑا سا خم دے کر کرخت آواز میں بولا۔

''ہاں بھئی! کون ہو تم دونوں اور کیوں ہماری بالڑی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔''

''جی وہ...... جی وہ......'' ارباز نے بمشکل کہا۔

''جی وہ کے بچے۔ لگتا ہے عزت راس نہیں ہے تجھے۔ کیا پاکستان سے بدمعاشی دکھانے کے لئے یہاں آیا ہے؟'' راج سنگھ نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی ارباز کو دھکا دیا۔

ارباز لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر زردی کی جگہ سرخی نے لے لی۔ چند ہی لمحوں میں اس کا سینہ تن گیا۔ اور گردن کی رگیں نمایاں ہو گئیں۔ میں نے دیکھ لیا۔ اس کے اندر کا وہی لڑاکا نوجوان بیدار ہو گیا تھا جس کے لئے تن تنہا دو تین صحت مند بندوں کی مرمت کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

''سردار جی! دھیان سے بات کرو۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔'' وہ سرسراتی آواز میں بولا۔

''اوئے تیری تو......'' راج سنگھ نے چمک کر کہا۔ اور ارباز کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں تیزی سے دونوں کے درمیان آ گیا۔ اس دوران میں پرتاپ سنگھ نے بھی چھوٹے بھائی کا راستہ روک لیا۔ ''نہیں راج دنگا نہیں کرنا ہمیں۔'' اس نے چھوٹے بھائی کو تھام لیا۔

اردگرد موجود افراد ذرا چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ پرتاپ سنگھ

نے امریتا کا ہاتھ پکڑا اور بظاہر نرم لہجے میں بولا۔ ''چل کڑیئے۔''

امریتا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹ ذرا براؤن ہو کر لرز رہے تھے۔ اس نے اشک بھری نظروں سے ارباز کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ جواں سال راج سنگھ نے خونی نظروں سے ارباز کو اور مجھے گھورا۔ نہایت سنگین لہجے میں بولا۔

''ایک بات کان کھول کر سن لو منڈیو! اگر تم دونوں پھر امریتا کے آس پاس نظر آئے تو واہگرو کی سوگند' تمہارے سری پائے توڑ کر رکھ دوں گا۔''

دونوں بھائیوں نے امریتا کو ساتھ لیا اور پارک سے باہر کھڑی نئی پلمن کار کی طرف بڑھ گئے۔ ہم اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔

ایک عجیب قسم کی تکلیف دہ مایوسی نے ارباز کو گھیر لیا تھا۔ اور جب وہ اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا تو میں کیسے خوش ہو سکتا تھا۔ وہی شہر جو کل تک خوبصورت اور دلچسپ لگتا تھا' ایکدم سوگوار ہو گیا تھا۔ اڑتالیس گھنٹے بعد ہمیں یہاں سے جانے کی تیاری کرنا تھی۔ اور یہ روانگی ایسی صورت حال میں ہو رہی تھی جو بے حد مایوس کن اور غمناک تھی۔ جس قسم کے حالات سامنے آ رہے تھے۔ ان سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اگلے دو چار ہفتوں میں امریتا شادی کے بندھن میں بندھ سکتی ہے۔ امریتا اور ارباز کا تعلق جس طوفانی انداز سے شروع ہوا تھا۔ اسی طوفانی انداز سے کلائمیکس پر پہنچنے کے بعد اینٹی کلائمیکس کی طرف جا رہا تھا۔

ہم شام تک بھٹکے ہوئے راہیوں کی طرح جالندھر کے گلی کوچوں میں گھومتے رہے۔ پھر پریشان کن خیالات سے دھیان ہٹانے کے لئے ایک سینما ہاؤس میں گھس گئے۔ سنی دیول کی نئی فلم بےتاب زیر نمائش تھی۔ گیلری میں ایک پاکستانی شناسا ملا۔

میں نے پوچھا۔ ''یار! تم نے تو کہا تھا کہ یہاں آ کر دو بار یہ فلم دیکھ چکا ہوں۔ اب پھر دیکھنے آ گئے ہو؟''

''بھاجی! مفت میں مل رہی ہے تو پھر کیوں نہ پی جائے...... میرا مطلب ہے دیکھی جائے۔ آج صرف تین گانے دیکھ کر چلا جاؤں گا۔ کل ہم تین دوست رضیہ سلطان کا ''اینڈ'' دیکھنے جائیں گے...... پرسوں تو پھر واپسی کی تیاری ہے۔''

''بہت خوب۔'' میں سر ہلا کر رہ گیا۔

فلم کے دوران میں بھی ارباز گم صم بیٹھا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں نمناک ہیں۔ اس کی آنکھوں کی یہ نمی میرے دل کو براہ راست متاثر کر رہی تھی۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ انڈیا میں ہمارا قیام مختصر ہو رہا تھا۔ اور روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔

ابھی سینما ہال میں داخل ہونے سے پہلے ارباز نے ایک فقرہ کہا تھا۔ ''یار دای! کسی طرح ہم یہاں کچھ دن اور نہیں رک سکتے؟''

یہ فقرہ مسلسل میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس فقرے میں موجود حسرت میرے دل و دماغ کو ٹھوکے دے رہی تھی۔ اچانک سینما ہال کی تاریکی میں بیٹھے بیٹھے میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے ارباز کا بازو تھاما اور کہا۔ ''اٹھو یار! آؤ میرے ساتھ۔''

''کہاں؟''

''بتاتا ہوں۔''

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرش پر گرے ایک مدہوش انڈین فلم بین کو پھلانگتے ہوئے ہم دروازے سے باہر نکل آئے۔ یہ چھ سے نو والا شو تھا۔ گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ ''یار! کہاں جانا ہے؟'' ارباز نے پوچھا۔

''امرتسر۔''

''امرتسر؟ وہ کیوں؟''

''بھائی جان کے دوست زمیندر صاحب کے پاس۔ تم جانتے ہی ہو وہ کسٹم میں ہیں۔ ان کے ایک قریبی رشتے دار امیگریشن کے محکمے میں بھی کام کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زمیندر صاحب ہمارے لئے کچھ کر سکیں۔ (یہ وہی صاحب تھے جن سے ارباز کے لئے میں نے خط منگوائے تھے۔)

''کیا مطلب؟ کیا وہ ویزے کی میعاد بڑھوا سکتے ہیں؟''

''یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی راہ نکال لیں۔

ویسے بھی ان سے ملاقات کئے بغیر جانا اچھا نہیں لگتا۔''

''مگر ہمارا ویزہ تو صرف جالندھر کے لئے ہے۔''

''یار اتنی چھوٹی موٹی ریلیکسیشن تو ہوتی ہی ہے۔''

ٹھیک دو گھنٹے بعد ہم امرتسر میں تھے۔ سکھوں کا مقدس شہر' مشرقی پنجاب کا دل' جس کی سب سے بڑی پہچان دربار صاحب ہے۔ جس وقت ہم امرتسر میں اترے رات کے دس بجنے والے تھے۔ ہوٹلوں' ریستورانوں اور شراب خانوں کی رونق برقرار تھی۔ اکا دکا یورپین سیاح بھی نظر آ رہے تھے۔

زمیندر صاحب کا ایڈریس میری جیب میں موجود تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم ایک رہائشی علاقے رنجیت کالونی میں زمیندر صاحب کی دو منزلہ رہائش گاہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ زمیندر صاحب پینتیس چالیس کے پیٹے میں نظر آتے تھے۔ درحقیقت وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی ٹھیک عمر کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ مذہب کے لحاظ سے سکھ تھے۔ تاہم ان سکھوں میں سے تھے جو پگڑی اور داڑھی وغیرہ نہیں رکھتے۔ یعنی مونے سکھ کہلاتے ہیں۔ زمیندر صاحب کا ماتھا چوڑا' رنگ سفید اور بال ذرا گھونگریالے تھے۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ ان کے چہرے کا حصہ دکھائی دیتی تھی۔ میرے بڑے بھائی جان کی طرف سے یہ اطلاع زمیندر صاحب کے پاس پہلے سے موجود تھی کہ ہم ان سے ملنے امرتسر آ سکتے ہیں۔ وہ بے حد تپاک سے ملے اور ہمیں گھر میں لے گئے۔ وہ اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ گھر کی بالائی منزل پر رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مہیندر سنگھ نچلی منزل میں تھے...... گھر کی آرائش اچھے طریقے سے کی گئی تھی۔ بڑے گروؤں کی چند تصویروں کے سوا ہمیں کوئی ایسی شے نظر نہیں آئی جو نگاہوں کو اجنبی لگتی۔ کسی پاس کے گھر میں لاؤڈ اسپیکر پر گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ اور مذہبی دعائیں پڑھی جا رہی تھیں۔ اس قسم کی آوازیں ہم نے یہاں تک آتے ہوئے کئی جگہ سنی تھیں۔ سکھوں کا مذہبی جوش و خروش ہمیں جالندھر میں بھی نظر آیا تھا۔ تاہم یہاں اس میں زیادہ شدت تھی۔

زمیندر صاحب نے مکھن میں تلے ہوئے پراٹھوں' ساگ' پنیر کے پکوڑوں

اور زردے سے ہماری تواضع کی۔ زمیندر صاحب کی پتنی بھی ایک ہنس مکھ خاتون تھیں اور پاکستان کے ٹی وی ڈراموں کی خاصی مداح تھیں۔ وہ بھی بہت جلد ہم سے گھل مل گئیں۔

جلد ہی میں اپنے اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے زمیندر صاحب سے کہا۔ ’’بھائی جان! انڈیا آنے کی تمنا ہمیں بہت دیر سے تھی۔ لیکن اب آئے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ ہاتھ لگا کر واپس جا رہے ہیں۔ نہ کچھ دیکھا‘ نہ کہیں گھومے پھرے۔‘‘

زمیندر صاحب بولے۔ ’’کوئی بات نہیں میں ایک دو ماہ میں پھر تم دونوں کا ویزہ لگوا دوں گا۔ تسلی سے رہنا‘ بے شک دلی اور بمبئی تک گھوم پھر آنا۔‘‘

وہ ہمیں تسلی دے رہے تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا۔ ہم مہینوں کے حساب سے انتظار نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہفتوں یا دنوں کے حساب سے بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں تو اسی ویزے میں توسیع درکار ہے۔ اگر کسی طرح ہو سکے تو۔

میں نے مناسب لفظوں میں ان سے اپنا مدعا ظاہر کیا اور بتایا کہ اب ہم چلے گئے تو پھر شاید اگلے دو تین برسوں میں اکٹھے یہاں نہ آ سکیں اور ہم چند دن اکٹھے یہاں رہنا چاہتے ہیں۔

وہ گہری سوچ میں کھو گئے۔ پھر ہولے سے بولے۔ ’’خالصہ تحریک کی وجہ سے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ہر معاملے میں سختی ہو رہی ہے...... پھر بھی ...... ایک کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن۔‘‘ میرے دل میں امید کی موہوم سی کرن نمودار ہوئی۔

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے کہا۔ ’’بھائی جان کہتے تھے آپ کے کوئی عزیز امیگریشن میں بھی ہیں۔‘‘

وہ اپنے چہرے کی سنجیدگی ختم کر کے مسکرائے۔ ’’عزیز کیا یارو! اپنا بڑا بھائیا ہے۔ بھائیا مہندر‘ نیچے والی سٹوری میں وہی رہتا ہے۔ میں سویرے اس سے بات کروں گا۔ اگر کوئی راہ نکل سکتی ہوئی تو وہ ضرور نکال لے گا۔‘‘

اگلے روز نو بجے کے قریب ہم سو کر اٹھے تو زمیندر صاحب نے ہم سے ہمارے کاغذات مانگے۔ ہم اپنا سامان تو ڈی اے وی ہوسٹل میں چھوڑ آئے تھے۔ لیکن

سفری کاغذات سارے ساتھ لائے تھے۔ زمیندر صاحب نے بتایا کہ سرکاری ڈاکٹر کا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑے گا۔ پولیس کی تصدیق ہو گی۔ اس کے علاوہ بھی ایک دو کاغذ پیش کرنے ہوں گے۔ بہرحال کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔

ہم دونوں انہیں ممنون نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئے۔ وہ دروازے تک پہنچنے کے بعد ایک لمحے کے لئے رکے اور ہماری طرف مڑ کر بولے۔ ’’اگر کوئی ایسی صورت ہوئی کہ تم دونوں میں سے ایک کا Stay بڑھ سکا تو پھر؟‘‘

ارباز نے تیزی سے کہا۔ ’’تو پھر رہنے دیجیے گا۔ ہم دونوں جائیں گے یا دونوں رہیں گے۔‘‘



اگلے قریباً 36 گھنٹے سخت کشمکش میں گزرے۔ ہمیں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ہمیں جانا ہوگا یا رکنا ہوگا۔ زمیندر صاحب بھی کوئی واضح جواب نہیں دے پا رہے تھے..... سخت غیر یقینی کیفیت تھی۔ دوسری طرف ارباز نے امرتسر سے ہی امریتا سے فون پر رابطہ کرنے کی کئی کوششیں کی تھیں۔ لیکن بالکل کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لالہ والے فون پر ایک مرد کی بھاری بھرکم آواز سنائی دیتی تھی۔ امریتا نے جو ایک اور نمبر دیا ہوا تھا وہ مسلسل خاموش تھا۔

اگلے روز شام کے وقت ہمیں یقین ہونے لگا کہ ڈی اے وی ہوسٹل سے اپنا اسباب سمیٹ کر...... اور امریتا کو اس کے حال پر چھوڑ کر ہمیں شاید کل سویرے واپس روانہ ہونا پڑے گا۔ ایک گہری اداسی دل و دماغ کو گھیرے میں لیتی جا رہی تھی۔ اور تو اور آپس میں بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بھابی (زمیندر صاحب کی پتنی) ہمیں ہنسانے کی جتنی بھی کوششیں کر رہی تھیں وہ ناکام جا رہی تھیں۔ وہ شاید دل ہی دل میں حیران بھی تھیں کہ چند دن مزید انڈیا میں قیام نہ کر سکنے کی وجہ سے ہم دونوں اس قدر دل گرفتہ کیوں ہیں؟

اگر ہم انہیں وجہ بتا دیتے اور یہ انکشاف کر دیتے کہ ہم امرتسر اور چندی گڑھ وغیرہ نہ گھومنے کی وجہ سے اتنے دل گرفتہ نہیں۔ بلکہ ہماری پریشانیوں کی وجہ ایک من موہنی سکھ لڑکی ہے۔ اور اس کی وجہ سے یہاں ایک ٹھیک ٹھاک ٹینٹا کھڑا ہو چکا ہے۔ تو یقیناً ان کی رائے فوراً ہمارے حوالے سے بدل جاتی۔ وہ فٹافٹ فون اٹھاتیں اور پتی صاحب کو وارننگ دیتیں کہ وہ بھولے سے بھی ہمارے ویزوں میں توسیع نہ کروائیں۔ ایسا کرنا ہمارے حق میں اور ہمارے بہی خواہوں کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

شام کے قریباً آٹھ بجے تھے جب زمیندر صاحب گھر میں داخل ہوئے اور چند کاغذات ہوا میں لہراتے ہوئے بولے۔ ''مبارک ہو سجنوں! تمہارا کام بن گیا ہے۔''

''واقعی؟'' ہم دونوں ایک ساتھ ہی چلا اٹھے۔

''واقعی اور سچ مچ۔'' زمیندر صاحب نے کاغذات ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ان کی پیشانی پر مسکراتے ہوئے بھی ذرا سی سلوٹیں نمودار ہوتی تھیں۔

کاغذات گواہ تھے کہ ہمیں پورے اٹھائیس روز کا Stay یہاں مل گیا ہے۔

قریباً دو گھنٹے بعد ہم ایک بار پھر جالندھر میں تھے۔ قیام میں توسیع کی وجہ سے ہم ایک دم ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ وہ جو ایک گھٹن سی سینے میں جمع ہو رہی تھی ایکدم دور ہو گئی تھی۔ صبح سویرے ہم نے پروفیسر امتیاز صاحب سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ ہم چند دن مزید یہاں رکیں گے۔ پروفیسر صاحب یہ جان کر حیران ہوئے کہ ہم اس محدود مدت میں اپنے ویزے میں توسیع کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

انہوں نے ہمارے سفری کاغذات دیکھے اور اپنی تسلی کی۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں ایک طرف لے جا کر کچھ ضروری ہدایات دیں۔ ان کا ایک فقرہ یاد رکھنے کے قابل تھا۔ انہوں نے کہا بے شک انڈیا کے ساتھ ہمارے روابط کتنے بھی بڑھ جائیں۔ ہم ایک دوسرے کے کتنے بھی قریب آ جائیں لیکن ہندوؤں اور مسلمان میں جو فطری بعد ہے وہ کبھی دور نہیں ہو سکتا۔ بے شک دونوں قومیں دشمنی کو بھلا دیں لیکن وہ تاریخ کو نہیں بھلا سکتیں۔

پروفیسر صاحب جب یہ بات کہہ رہے تھے تو میرے ذہن میں دو واقعات ایکدم چمک اٹھے۔ پہلے واقع کا ذکر تو میں اس سے پہلے بھی کر چکا ہوں۔ میڈیکل سٹور والے ہندو نے جس طرح ہمیں زخم کی دوا دینے سے انکار کیا تھا وہ منظر ذہن پر نقش تھا۔ دوسرا واقعہ جالندھر کے ہی ایک ہوٹل میں پیش آیا تھا۔ میں اور ارباز پیاس سے بے تاب ہو کر ہوٹل میں گھسے تھے۔ سامنے ہی پانی اور گلاس وغیرہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے بے تاب ہو کر ایک گلاس اٹھا کر پانی بھرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مہاشے بڑی تیزی سے ہماری طرف آئے تھے۔ اور انہوں نے گلاس میرے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہ ہندو پانی ہے، مسلم پانی وہ دوسری طرف ہے۔'' اور میں ہکا بکا دیکھتا رہ گیا تھا۔ بظاہر یہ

معمولی واقعات تھے۔ لیکن ان کے پیچھے نسل در نسل سینوں میں موجزن رہنے والے زہریلے جذبے کی شدت محسوس کی جا سکتی تھی۔

پروفیسر صاحب نے ہمیں ہمارے سفری کاغذات خصوصی دھیان سے رکھنے کی ہدایت بھی کی۔

پاکستان اور انڈیا کا یہ ٹیسٹ میچ جو ہم دیکھنے آئے تھے سیریز میں دوسرا میچ تھا۔ پہلا میچ بھی ڈرا ہوا تھا۔ یعنی سیریز صفر صفر سے برابر تھی۔ جالندھر والے اس میچ میں ایک دو باتیں یادگار تھیں۔ شعیب محمد اور غالباً قاسم عمر نے بھی پہلی بار ٹیسٹ میچ میں حصہ لیا تھا۔ وسیم حسن راجہ نے شاندار 125 رنز بنائے تھے اور مین آف دی میچ رہے تھے۔ انڈیا کے گائیک وارڈ نے سست ترین ڈبل سنچری اسکور کی تھی۔ جالندھر آنے والے شائقین کرکٹ اب واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ڈی اے وی ہوسٹل کے کمروں میں کھٹ پٹ اور اٹھا پٹخ ہو رہی تھی۔ سامان سمیٹا جا رہا تھا۔ سامان تو ہم بھی سمیٹ رہے تھے لیکن پاکستان واپسی کے لئے نہیں صرف ہوسٹل چھوڑنے کے لئے ہم نرمیندر صاحب کے بتائے ہوئے ایک ہوٹل میں منتقل ہو رہے تھے۔ اسی دوران میں اسی ہٹے کٹے پاکستانی بھائی سے ملاقات ہوگئی جس نے تین دن پہلے اسٹیڈیم میں لنچ کے دوران میں اپنا کارنامہ بیان کیا تھا۔ ہمیں بتایا تھا کہ سو دو سو پاکستانیوں نے مل کر انتظامی عہدیدار سے دلی اور آگرہ کی سیر کرانے کا بھرپور مطالبہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ''ہاں استاد جی! کیا بنا آپ کے مطالبے کا؟''

وہ باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''بننا کیا تھا۔ سیر کر کے آئے ہیں بادشاہو۔''

''دلی کی؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں یار...... سردار صاحب باڈی ٹیک گئے تھے۔ کہنے لگے کہ میرے سجنو! میری اتنی اتھارٹی نہیں ہے کہ آپ کو دلی لے جا سکوں۔ پھر آپ کو بالکل انکار بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے آپ کو سرکاری خرچے پر چندی گڑھ کی سیر کروا دیتا ہوں۔''

''یعنی چندی گڑھ گئے آپ لوگ؟''

''بالکل گئے اور اسپیشل بسوں پر گئے اور باقاعدہ وزیر اعلیٰ ہاؤس میں کھانا شانا بھی کھایا۔''

استاد جی کی آنکھوں میں مفت بری سے حاصل ہونے والی خوشی کی چمک تھی۔

بعد ازاں ایک اور ہم سفر کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ وزیر اعلیٰ ہاؤس کے اندر ہونے والی دعوت میں کچھ ناسمجھ پاکستانیوں نے دھکم پیل اور ہڑبونگ کا مظاہرہ کیا۔ آئس کریم کے لئے چھینا جھپٹی کی گئی اور چمچوں کی بجائے چپوں سے آئس کریم نوش کی گئی۔ بہر حال اس سے یہ مطلب نہیں کہ پاکستانی شائقین میں سب لوگ ایسے ہی تھے۔ اس جماعت میں پروفیسر امتیاز جیسے بہت سے لوگ بھی تھے۔ جو بیرون ملک ہر ہر قدم پر ملکی وقار اور شخصی رکھ رکھاؤ کا خیال رکھتے ہیں۔

ہوسٹل کے اندر اور آس پاس بہت سے جالندھری جمع ہو گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر غریب صورت نوجوان ہی تھے۔ کچھ گھاگ قسم کے دکاندار بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ لوگ ہم سے کیلکولیٹر اور واٹر کولر وغیرہ خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہوسٹل کے طویل برآمدوں میں اور کمروں کے سامنے بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا۔ ہمارے ساتھ والے کمرے کے ایک باؤ نذیر صاحب کو 200 روپے کی رسٹ واچ کے 500 بھارتی روپے زبردستی تھمائے جا رہے تھے۔

انڈین خواتین و حضرات مختلف اشیاء کی خرید کے لئے اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ ہوسٹل کے احاطے میں ہجوم سا ہو گیا تھا۔ اس ہجوم میں اچانک میری نگاہ ایک لڑکی پر پڑی اور میں ششدر رہ گیا وہ امریتا تھی۔ وہ شلوار قمیض میں تھی۔ اپنے لمبے بال اس نے حسب معمول اوڑھنی میں چھپا رکھے تھے۔ اس کی متلاشی نظریں کسی کے لئے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ میں جانتا تھا وہ کس کے لئے بھٹک رہی ہیں۔

اور پھر ارباز نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ جلد ہی ارباز اور امریتا آمنے سامنے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے۔ امریتا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان دو چار دنوں میں ہی اس کا کتابی چہرہ کچھ اور بھی دبلا پتلا ہو گیا تھا۔ رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ہم ہجوم سے ہٹ کر ایک درخت تلے آن کھڑے ہوئے۔ امریتا نے ابھی تک ارباز کے ہاتھ بڑی مضبوطی سے تھام رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے غیر شعوری طور پر وہ ان ہاتھوں کو سختی سے پکڑے رکھنا چاہتی ہے...... وہ چاہتی ہے کہ ارباز کو جانے سے

روک لے۔

پھر ارباز نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ ابھی واپس نہیں جا رہا ہے۔ امریتا کی آنکھوں میں لاتعداد ستارے چمک اٹھے۔ وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ارباز کو دیکھتی چلی گئی۔

''آ...... آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''سو فیصد۔'' وہ مسکرایا۔

''کب تک رہیں گے؟''

''دو تین ہفتے۔''

''اوہ نو۔'' وہ خوشی سے لتھڑی ہوئی آواز میں بولی۔

پھر ایکدم ہی اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ مسرت و شادمانی کے تاثرات بتدریج اداسی اور غم میں ڈھل گئے۔ وقتی خوشی کو مستقل اور تلخ حقائق کے خیال نے ڈھانپ لیا۔ ارباز نے اس کو ساری تفصیل بتائی کہ کس طرح ہم دونوں جالندھر سے امرتسر پہنچے اور کس طرح ہمارے میزبان نے دو دن تک بھاگ دوڑ کر کے ہمارے قیام میں توسیع کے اسباب پیدا کئے۔

وہ خاموشی سے ہنستی رہی' پھر بولی۔ ''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ یہاں سے جا نہیں رہے...... لیکن اس سے کیا ہوگا ارباز...... وہ سب کچھ تو بدل نہیں سکے گا جو ہمارے سامنے ہے۔'' اس کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

''کیا صورت حال ہے؟'' ارباز نے پوچھا۔

''کچھ نہ پوچھیں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

''سب...... کچھ...... ختم ہو رہا ہے۔ باؤ جی میرے بیاہ پر رضامند ہو گئے ہیں۔ راکیش آٹھ دس دن میں سنگاپور سے یہاں پہنچ رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں ناں راکیش' انکل پرتاپ کے بیٹے کا نام ہے۔''

میں نے کہا۔ ''امریتا! بہتر ہے کہیں بیٹھ کر آرام سے بات کریں۔ یہاں لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔''

ارباز نے امریتا کا کندھا سہلایا۔ ''امریتا! ہم ہوٹل میں شفٹ ہو رہے

ہیں۔ یہاں سے اکٹھے ہی چلتے ہیں۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔''

وہ چند لمحے شدید ہچکچاہٹ کا شکار رہی پھر اس نے رضامندی سے سر ہلا دیا۔

وشواناتھ ہوٹل درمیانے درجے کا تھا اور جالندھر کے پگواڑا ٹاؤن کے قریب واقع تھا۔ یہ جگہ کپڑے کے کاروبار کے حوالے سے مشہور ہے۔ ہمیں دوسری منزل پر ایک ڈبل بیڈ کمرا 200 انڈین روپے یومیہ پر ملا تھا۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ امریتا اور ارباز نے برآمدے میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کیں۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں باہر آیا تو امریتا کا چہرہ دھلا دھلایا اور نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے گمبھیر بادوباراں کے بعد مطلع صاف ہو جائے۔ ہر شے شفاف دکھائی دینے لگے۔ رومال ابھی تک امریتا کے ہاتھ میں تھا اور یقیناً یہ آنسوؤں سے تر تھا۔ آنسو جو محبت کی سزا ہوتے ہیں' جو چاہت کا خراج کہلاتے ہیں۔ یہ خراج دینے کے بعد وہ ایکدم نوخیز اور من موہنی نظر آنے لگی تھی۔

امریتا نے جو کچھ ارباز کو بتایا تھا۔ وہ خاصا حوصلہ شکن تھا۔ اس کے باپو جی نے اسے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ اس کی شادی پرتاپ کے بیٹے راکیش سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو یقین تھا کہ راکیش سے اچھا بر انہیں کسی صورت مل ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے امریتا کو دیر تک سمجھایا بجھایا تھا۔ اسے بتایا تھا کہ فی زمانہ متوسط گھرانے کی لڑکیوں کے لئے اچھے رشتے ملنا کتنے دشوار ہو چکے ہیں۔ لڑکا کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ خوبصورت تھا۔ اس کا مستقبل تابناک تھا۔ امریتا کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا۔ باپو جی نے انکل پرتاپ کو گرین سگنل دے دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو سنگاپور سے بلا لیں۔ امریتا اور اس کے باپو کی کوئی لمبی چوڑی رشتے داری نہیں تھی۔ باپو جی کے دوست پرتاپ سنگھ کے بھی جالندھر اور امرتسر میں بس دو چار رشتے دار تھے۔ ایک مختصری گھریلو تقریب میں امریتا اور راکیش کی شادی کا پروگرام بن گیا تھا۔

یہ جو کچھ ہو رہا تھا اس کا اندیشہ امریتا کے دل میں پہلے سے موجود تھا۔ تاہم عین ممکن تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی نہ ہوتا۔ ساری گڑبڑ اس وجہ سے ہوئی تھی کہ چند روز پہلے امریتا کے انکل پرتاپ سنگھ نے اسے ارباز کے ساتھ دیش بھگت میموریل ہال کے باہر دیکھ لیا تھا۔

حالات سنگین تھے۔لیکن آس امید کی کونپلیں تو بدترین حالات میں بھی انسان کے دل میں پھوٹتی رہتی ہیں۔امریتا کا چہرہ دیکھ کر محسوس ہورہا تھا کہ وہ بہت دل گرفتہ تو ضرور ہے لیکن انہونیوں کی توقع‘ اس کے دل میں تاحال موجود ہے۔

ارباز نے کہا۔”امریتا! پتہ نہیں کیا بات ہے مجھے اب بھی یقین ہے کہ اگر میں ایک بار باپو جی سے مل لوں تو حالات میں بہتری نمودار ہوسکتی ہے۔“ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوکر بولا۔

”تمہارا کیا خیال ہے دای؟“

میں نے کہا۔”باپو جی کے بارے میں اب تک جو کچھ سنا اور محسوس کیا ہے‘ اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ درد دل رکھنے والے شخص ہیں۔کیا پتہ‘ ان سے بات کی جائے تو وہ تم دونوں کے جذبے کی شدت کو محسوس کرلیں۔“

ارباز جیسے ایک دم حتمی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔”اٹھو امرت! ابھی چلتے ہیں تمہارے باپو جی کے پاس‘ جو کچھ ہوگا‘ دیکھا جائے گا۔“

وہ بولی۔”ارباز! اپنے گھر کے حالات کے بارے میں جتنی جانکاری میری ہے‘ آپ کی نہیں ہوسکتی۔فی الوقت باؤجی (باپوجی) سے بات کرنا بے کار ہوگا۔دوسری بات یہ ہے کہ باؤجی اس وقت جالندھر سے باہر ہیں۔وہ دو دن سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔اگر وہ گھر میں ہوتے تو شاید میں اس طرح آپ سے الوداعی ملاقات کرنے ڈی اے وی ہوسٹل نہ آسکتی۔“

”الوداعی ملاقات کا کہہ کر میرے دل پر گھونسہ نہ مارو۔اب تو یہ الوداعی ملاقات نہیں ہے‘ نہیں ہے نا؟“

”ہوں۔“امریتا نے جیسے گہری سوچ میں ڈوب کر کہا۔

”جب تک باپو جی واپس جالندھر نہیں آجاتے‘ تمہیں روز مجھ سے ملنے آنا ہوگا۔“

”لیکن ارباز......“

”لیکن ویکن کچھ نہیں جو کہہ دیا سو کہہ دیا اور آج بھی تم سارا دن ہمارے ساتھ گزارو گی۔وہ کون سی جگہ تم نے دکھانا تھی ہمیں......کون سی جگہ تھی......“

”تلسی مندر۔“ میں نے لقمہ دیا۔

”ہاں‘ تلسی مندر...... چلو ابھی چلتے ہیں وہاں‘ اب تو کافی سے زیادہ ٹائم ہے ہمارے پاس۔“

وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔”دای! تم بھی تو کچھ بولو۔کیا ایسے حالات میں ہمارا گھومنا پھرنا مناسب ہے۔“ میری طرف سے فوری طور پر کوئی جواب نہیں ملا تو وہ کہنے لگی......”رب جانے مجھے اب کیوں آپ کے ساتھ باہر جاتے سے خوف آتا ہے۔“

ارباز خاموش سا ہوگیا۔اس کی اداس خاموشی دیکھ کر وہ فوراً بولی۔”اچھا ٹھیک ہے‘ چلتے ہیں۔“

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی سنجیدگی پر اپنی چنچلتا کو غالب کرلیا۔اپنے بے مثال بالوں کو ایک جھٹکا دیا اور ارباز کی خوشی کی خاطر اٹھلا کر کھڑی ہوگئی۔

کچھ اسنیکس وغیرہ ہم نے راستے سے ہی لے لئے تھے۔ہوٹل سے ہم نے چائے لے کر تھرماس میں ڈال لی۔اور تلسی مندر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔امریتا کو بہت خوبصورت تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔تاہم وہ قبول صورت تھی۔ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ معمول سے زیادہ ”قبول صورت“ دکھائی دیتی تھی۔آج بھی ایسا ہی ہورہا تھا۔شاید رو دھو کر اس کا چہرہ نکھر گیا تھا۔

ہم دو بسیں تبدیل کر کے تلسی مندر پہنچے۔یہ مندر جالندھر کے کوٹ کشن چاند کے علاقے میں واقع ہے......عمارت دیدہ زیب ہے۔مندر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بوسیدہ سی مسجد بھی تھی۔لیکن اپنے فطری میلان کے سبب ہمیں یہ مسجد‘ مندر سے زیادہ دلکش لگی۔امریتا نے ایک بار پھر ایک گائیڈ کا سا انداز اختیار کرلیا۔اس نے بتایا...... یہ مندر جالندھرا کی پیاری پتنی کے اعزاز میں یادگار کے طور پر تعمیر ہوا تھا۔پھر وہ تفصیل بتانے لگی کہ اس کے اتنے دروازے ہیں‘ اتنی سیڑھیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔اس کا نام پہلے تلسی مندر نہیں تھا بلکہ اسے ورندا مندر کہتے تھے......

میں نے کہا۔”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اس مندر کے تالاب کے حوالے سے ایک عقیدہ موجود ہے۔غالباً یہ کہا جاتا ہے کہ جالندھرا اس میں اشنان کیا کرتا تھا اور

اس کی پتنی بھی یہاں نہاتی تھی۔"

امریتا نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "واہ! تمہاری جانکاری کافی وسیع ہے۔ لیکن یہاں نہانے کی بات فقط جالندھرا کے حوالے سے کی جاتی ہے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم کچھ فاصلے پر ایک مناسب سی سایہ دار جگہ پر بیٹھ گئے۔ ہم نے اسنیکس نکال لئے اور چائے انڈیل لی۔ چائے کے لئے ہمارے پاس فقط دو کپ تھے۔ ایک تو تھرماس کا ڈھکنا تھا' دوسرا ایک ڈسپوزایبل کپ تھا۔ تھرماس کا ڈھکنا میں نے استعمال کرلیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایک کپ تو کم رہے گا۔ میں تیسرے کپ کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑا رہا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ ارباز اور امریتا نے ایک ہی کپ (یعنی ڈھکن) کو شیئر کرلیا ہے۔ وہ باری باری چائے کی چسکی لے رہے تھے...... اور میں حیران ہو رہا تھا کہ محبت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ میں نے آج تک ارباز کو کسی کا جوٹھا برتن استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کوئی "لیکوئیڈ" شے کسی کے ساتھ شیئر کرنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ آج بڑی رغبت کے ساتھ ایک ہی کپ میں امریتا کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔



تلسی مندر کے قریب اس سایہ دار جگہ پر بیٹھے بیٹھے اچانک ہماری آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ گئے۔ سب سے پہلے میں نے ہی انکل پرتاپ سنگھ اور اس کے بھائی کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ارباز اور امریتا کی نگاہ ایک ساتھ ان دونوں بلکہ تینوں پر پڑی۔ آج ان کے ساتھ چوڑے کندھوں والا ایک اور شخص بھی تھا...... پتہ نہیں کہ وہ کس طرف سے اور کیسے آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کومل امریتا کا رنگ ہلدی ہوگیا تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کے کندھے سے کندھا ملائے ارباز کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں وہی عقابی چمک تھی جو اسے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ وہ مدمقابل کی طاقت اور تعداد کو خاطر میں لائے بغیر ایک دم ڈٹ جاتا تھا۔

پرتاپ سنگھ کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ زہریلے سانپ کی طرح پھنکارا "تجھے کہا تھا نا منڈیا...... اس کڑی کا پیچھا چھوڑ دے۔ پر لگتا ہے تیری نسل ہی خالص نہیں ہے۔ کسی بے غیرت باپ کا......"

"منہ سنبھال کر بات کر سردارا' میں گندی زبان کھینچ کر ہتھیلی پر رکھ دیا کرتا ہوں۔" ارباز نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"اوئے تیرے تو میں نے ٹوٹے نہ کر دیئے تو کہنا۔" پرتاپ کے چھوٹے بھائی نے ایک گندی گالی نکال کر ارباز کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔

اب بات چیت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ارباز نے گھما کر ایک ہاتھ راج سنگھ کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک قلفی والی ریڑھی پر جا گرا۔ پرتاپ سنگھ نے تڑپ کر ارباز کو اپنے جپھے میں لینا چاہا لیکن ارباز نے اسے دھکیل کر دور پھینک دیا۔ امریتا کی

خوفزدہ چیخ میرے کانوں میں گونجی۔لیکن میں اس کے تاثرات دیکھ نہیں سکا۔ کیونکہ میں خود پرتاپ سنگھ کے تیسرے ساتھی کے ساتھ الجھ چکا تھا۔ میں نے اس کے جبڑے پر زور دار مکہ مارا تھا۔ جواب میں اس نے بھی میری کنپٹی پر ایک زور دار ہاتھ رسید کیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ جگہ میدان جنگ بن گئی۔ میں جانتا تھا ارباز اس موٹے بھدے پرتاپ سنگھ اور اس کے بھائی سے سنبھلنے والا نہیں اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ ارباز کی ایک زور دار ٹکر نے راج سنگھ راجو کا چہرہ لہولہان کر دیا اور اس کے چند زوردار مکوں نے پرتاپ سنگھ کی پگڑی کھول دی اور اس کے کیس بکھیر دیئے۔ دوسری طرف میں بھی اپنے مدمقابل کے ساتھ پورا اترنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے بری طرح الجھے ہوئے ایک سائیکل رکشا پر گر گئے تھے۔اور ایک دوجے کو لاتیں اور گھونسے رسید کر رہے تھے۔ میں اوپر اور میرا مقابل نیچے تھا۔

اچانک ایک پولیس گاڑی کی جھلک نظر آئی۔ گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا اور عین ہمارے درمیان پہنچ گئی۔ پولیس والے چھلانگیں لگا کر اترے۔ایک دو کے ہاتھ میں رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

''خبردار...... پیچھے ہٹو......خبردار'' پولیس والے گرجے۔

بالوں بھرے کرخت ہاتھوں نے مجھے اور میرے مدمقابل کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ دوسری طرف راجو کو بھی ارباز کے نیچے سے لہولہان حالت میں نکال لیا گیا۔ پرتاپ سنگھ اپنی کرپان نکال چکا تھا مگر پولیس والوں نے اسے جکڑ لیا۔

پرتاپ سنگھ گالیاں بک رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ ''مسلو! میں تمہاری جان لے لوں گا۔ ہماری گودی میں بیٹھ کر ہماری داڑھی کھینچتے ہو؟ اوئے تمہاری جرأت کیسے ہوئی ہمارے دیش میں آ کر ہماری عزت سے کھلواڑ کرنے کی۔''

راجو نے ارباز کی طرف انگلی اٹھائی اور چلا کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! ہتھکڑیاں لگاؤ ان دونوں بدیشی غنڈوں کو۔ یہ حرامی یہاں کرکٹ دیکھنے آئے تھے اور اب یہاں ڈیرہ ڈال کر ہماری عزت برباد کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کے کاغذات چیک کرو جناب! دیکھو یہ کون ہیں اور کیا کرنے آئے ہیں یہاں۔''

دوسری طرف ارباز بھی چلا رہا تھا۔''دیکھ سردار! گالی نہ نکال، میں کہتا ہوں

گالی نہ نکال۔ میں تیری زبان کھینچ کر کتوں کو ڈال دوں گا۔''

اس پولیس پارٹی میں سے ایک اے ایس آئی پرتاپ سنگھ کا واقف نظر آتا تھا۔ وہ اسے بھائیا جی کہہ کر مخاطب کرنے لگا اور ہم دونوں کو اپنی لال لال آنکھوں سے گھورنے لگا۔ وہ چہرے پر چیچک کے مدھم داغوں والا ایک کرخت سا سکھ تھا۔

پولیس والوں نے ہم سے ہمارے پاسپورٹ مانگے۔ پاسپورٹ ہم ہر وقت جیب میں ہی رکھتے تھے۔ ہم نے اپنے پاسپورٹ دکھا دیئے۔ پولیس رپورٹ ہوٹل میں تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ رپورٹ وغیرہ چیک کرنے کے لئے وہ لوگ ہمارے ساتھ وشواناتھ ہوٹل چلے آتے۔ بلکہ جب انہوں نے ہم دونوں کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا تو ہم یہی سمجھے کہ وہ ہمیں وشواناتھ ہوٹل لے جا رہے ہیں...... امریتا اس وقت ڈری سہمی تھرتھر کانپتی پرتاپ سنگھ کے پاس کھڑی تھی۔ وہ بظاہر اس سے نرم لہجے میں باتیں کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی غصے کی آگ صاف جھلک دکھا رہی تھی۔ ان دونوں کی آواز ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس دھینگا مشتی میں ہمارا کیمرا ٹوٹ گیا تھا۔ پولیس والوں نے یہ کیمرا بھی اپنے پاس رکھ لیا۔

چند سڑکوں سے گزرتے ہوئے سکھ پولیس انسپکٹر نے ہم سے ابتدائی نوعیت کے سوالات پوچھے' اور یہ دریافت کیا کہ ہمارے جالندھر کے Stay میں کیونکر توسیع ہو سکی ہے۔ ہم نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ پولیس انسپکٹر نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ بس خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔

پولیس کی گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی تو ہم چونک گئے۔

میں نے پوچھا۔'' جناب! آپ ہمیں تھانے کیوں لے آئے ہیں؟''

''تو کہاں لے کر جاتے بھائی صاحب؟''

''ہم سمجھے تھے۔ ہم ہوٹل جا رہے ہیں۔ ہمارے باقی کے کاغذات تو وہیں پڑے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں سجن جی! کاغذات بھی آ جاتے ہیں۔'' انسپکٹر نے کھردرے لہجے میں کہا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ یہ لوگ ہمیں پریشان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ارباز کے تاثرات بھی اس اندیشے کو ظاہر کر رہے تھے۔ ارباز کا نچلا ہونٹ

پھٹ گیا تھا اور دائیں ہاتھ کی پشت پر بھی چوٹ آئی تھی ...... میرا گریبان کھل کر ناف تک چلا گیا تھا۔ اور ایک آنکھ پر سوجن محسوس ہو رہی تھی۔

یہ ایک عام سا شہری تھانہ تھا۔ اینٹوں لگے فرش پر دو شودر رکشا والے اپنے سوکھے سڑے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے کھڑے تھے۔ اور ان کے گھر کی عورتیں بھک منگوں کی طرح پولیس والوں کے قدموں میں بیٹھی تھیں۔ چند حوالاتی سلاخوں سے لگے کھڑے تھے۔ اور آتے جاتے پولیس اہلکاروں کی منت سماجت کر رہے تھے۔ پولیس انسپکٹر ہمیں اپنے دفتر میں لے گیا اور کرسیوں پر بٹھایا۔ تاہم انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم پر بہت بڑا احسان کر رہا ہو۔

ایک دو جگہ فون کر کے اس نے کچھ مبہم باتیں کیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دائم تمہارا نام ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''تم میرے اے ایس آئی کے ساتھ ہوٹل چلے جاؤ اور وہاں سے اپنے اور اپنے ساتھی کے کاغذ لے آؤ۔''

میں نے ذرا ترشی سے کہا۔ ''سر جی! آپ تو ایسا برتاؤ کر رہے ہیں جیسے ہم مجرم ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ لڑائی کی بنیاد ہم نے نہیں پرتاپ صاحب نے رکھی تھی۔ انہوں نے منع کرنے کے باوجود ہمیں ننگی گالیاں دیں۔ آپ وہاں موقع پر موجود لوگوں سے پوچھ لیں......''

''یار کیوں نراش ہوتے ہو اتنا...... ہم تم پر کوئی دفع شفع تو نہیں لگا رہے۔ کم از کم اتنا ادھیکار (حق) تو ہمارا ہے نا کہ تمہارے کاغذات دیکھ لیں۔ اور ایک دو باتیں تم سے پوچھ لیں۔'' انسپکٹر کا انداز طنزیہ تھا۔

''بالکل جناب! آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ ہم آپ سے کچھ چھپائیں گے نہیں۔''

''کیا تم دونوں واقعی کرکٹ دیکھنے یہاں آئے ہوئے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''پرتاپ صاحب کی رشتے دار کڑی سے تمہاری جان پہچان کیسے پیدا ہو

گئی؟''

''یہ جان پہچان کافی پہلے کی ہے جی۔'' ارباز نے کہا۔

''ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے۔ قلمی دوستی تھی ہماری......''

''قلمی دوستی......'' سکھ انسپکٹر نے ذرا چبا کر کہا۔

اس دوران میں وائرلیس پر کوئی پیغام آ گیا اور انسپکٹر گروجیت ہم سے پوچھ گچھ ادھوری چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ہماری تواضع کے لئے ملائی والی دودھ پتی آ گئی۔ چند گھونٹ لینے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور انسپکٹر گروجیت کے ماتحتوں کے ساتھ پولیس جیپ میں آ بیٹھا۔ وہ لوگ مجھے لے کر وشوانا تھ ہوٹل جا رہے تھے۔

ہوٹل پہنچ کر میں اپنے کمرے میں گیا۔ دو اہلکار میرے ساتھ تھے اور عقابی نظروں سے اردگرد کی ہر شے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہمارے سفری سامان میں دو اٹیچی کیسوں اور دو شاپروں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ارباز کے اٹیچی کیس کی چابی میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ہمارے دیگر شناختی کاغذات، میچ کے ٹکٹ اور پولیس رپورٹس وغیرہ اٹیچی کیسوں میں ہی تھیں۔ میں نے یہ کاغذات سمیٹے اور دو چار منٹ کے اندر میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ سب سے اہم دستاویز یعنی دونوں پولیس رپورٹس کاغذات میں موجود نہیں تھیں۔ میں نے پولیس اہلکاروں کے سامنے ہی اٹیچی کیسوں کا سارا سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور یہ سامان تھا ہی کیا۔ ان دھلے کپڑے، تولیے، جرابیں اور رومال وغیرہ تھے۔ میں نے ایک ایک شے دیکھ لی دونوں رپورٹس موجود نہیں تھیں۔

یکا یک میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہ دونوں رپورٹس تو ''خصوصی حفاظت'' کی غرض سے ارباز نے پولیتھین میں لپیٹ کر اپنی پاکٹ میں رکھی تھیں۔ لیکن اب اس کی پاکٹ میں یہ رپورٹیں موجود نہیں تھیں۔ تھانے میں پہنچ کر ارباز نے اچھی طرح اپنی ساری جیبیں دیکھی تھیں۔ پاسپورٹ اور مقامی کرنسی کے سوا اور کچھ نہیں نکلا تھا۔ اچانک ایک اور منظر میری نگاہوں کے سامنے گھوما اور رپورٹوں کے حوالے سے رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اپنی غفلت کے سبب ہم وہ دونوں رپورٹیں گم کر چکے ہیں...... دونوں پولیس اہلکاروں کی نگاہوں میں نظر آنے والی بیگانگی اور سختی ایک دم ہی بڑھ گئی تھی۔ وہ کرخت نظروں سے مجھے گھورتے چلے جا رہے

تھے۔

ایک پولیس اہلکار نے اپنی چھڑی سے میرے سامان کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان ہوگئے ہو۔''

''وہ......وہ دراصل مجھے پولیس رپورٹ نہیں مل رہی۔'' میں نے ہکلا کر کہا۔

ہیڈ کانسٹیبل اور اے ایس آئی نے معنی خیز نظروں سے ایک دوجے کو دیکھا۔ اے ایس آئی بولا۔ ''ایک وار پھر اچھی طرح دیکھ لو...... تھانے جا کر پھر نہ کہنا کہ دوبارہ یہاں آنا ہے۔''

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ایک بار پھر سارے سامان کو الٹ پلٹ کیا۔ پولیس رپورٹیں کہیں نہیں تھیں۔ میرے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔ دیارِ غیر میں اس طرح کی پریشانی بندے کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

مایوس ہوکر میں نے باقی کاغذات سمیٹے اور دروازہ مقفل کر کے پولیس اہلکاروں کے ساتھ تھانے روانہ ہوگیا۔

تھانے پہنچ کر جب انسپکٹر گروجیت کو ساری صورتحال معلوم ہوئی تو اس کے تیور جو پہلے ہی اچھے نہیں تھے ایکدم خراب ہوگئے۔ وہ مجھے اور ارباز کو خالص تھانیداری نظروں سے گھورنے لگا۔ اس نے ہمارے باقی کے کاغذات چیک کرنے کے بعد کہا۔ ''اصل چیز تو پولیس رپورٹ ہے۔ اور وہ تمہارے پاس نہیں۔ اپنا کیس تم دونوں خود خراب کر رہے ہو۔''

''جناب! دو کاغذ ہی تو تھے۔ کہیں ادھر ادھر ہوگئے ہیں۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔'' ارباز نے کہا۔

''یہ غلطی تم کو دن میں تارے دکھا دے گی کاکا جی! اگر یہ واقعی غلطی ہے تو معمولی نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''جس پیپر کو ہم سب سے زیادہ احتیاط سے رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ وہی تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس کا کچھ مطلب بھی ہوسکتا ہے۔''

میں نے گزارش کی۔ ''دیکھیں سردار صاحب! پیپر گم جانے کا کوئی حل بھی تو ہوگا۔ بارڈر پر پولیس والوں نے رجسٹر پر بھی اندراج کیا تھا۔ آپ وہاں سے تصدیق کر سکتے

ہیں۔''

''اچھا' اب تم مجھے بتاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ انسپکٹر گروجیت سنگھ کا لہجہ مزید سخت ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کسی شیر سنگھ کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ ''اوئے شیرے! ان دونوں منڈوں کو بڑے کمرے میں لے جا۔ میں ذرا ڈپٹی صاحب سے بات کرلوں۔''

گھنی مونچھوں اور عقابی آنکھوں والا ہیڈ کانسٹیبل شیر سنگھ ہمیں ''بڑے کمرے'' میں لے آیا۔ یہ دراصل لاک اپ کا ہی حصہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے خود کو سلاخوں کی دوسری جانب پایا۔ ارباز کا بھی یہ پہلا تجربہ تھا۔ آزادی اور پابندی کے فرق کا احساس پہلی بار ایک نئے زاویے سے ہوا۔

پولیس والوں کے تیور دیکھ کر ارباز نے کہا۔ ''میرا خیال ہے دامی! ہمیں مدد کی ضرورت پڑے گی۔ کیا فون پر انکل نریندر سے رابطہ ہوسکے گا؟''

''فون نمبر تو ہے۔ لیکن پتہ نہیں یہ پلسیے ہمیں فون کرنے بھی دیتے ہیں یا نہیں؟''

کچھ دیر تک ہم دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم رہے' پھر ارباز پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''ویسے یہ بھی تو ہوسکتا ہے دامی! کاغذ انکل نریندر کے گھر میں ہی کہیں رہ گئے ہوں۔ بھابی جی نے انہیں سنبھال لیا ہو۔''

''نہیں' مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے میں نے کمرا بڑی اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ الماری بھی چیک کی تھی۔''

ایک بار پھر دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم ہوگئے۔ اس مرتبہ بھی خاموشی ارباز نے ہی توڑی۔ ''یار پتہ نہیں امریتا کا کیا حال ہوگا؟'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''کہیں اس پر سختی نہ کی جائے۔''

''پیارے اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''لگتا ہے کہ تمہیں اس کی بالکل فکر نہیں۔''

''فکر تو ہے لیکن عاشق جیسا مفکر کوئی غیر عاشق تو نہیں بن سکتا نا۔''

''میں فکر کی بات کر رہا ہوں۔ تم مفکر بنا رہے ہو۔''

''فکر کرنے والے کو ہی مفکر کہتے ہیں۔ اور تم ہو مفکر، بلکہ مفکر کا بھی اگلا درجہ، یعنی غائب دماغ۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کیا غائب دماغی کی ہے۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ پولیس رپورٹیں بھاپ بن کر اڑ گئی ہیں۔ میرے شہزادے! وہ رپورٹیں تمہارے ہاتھوں ہی گم ہوئی ہیں۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔''

''کیا یاد آ گیا ہے؟''

''پرسوں ہم امرتسر میں جنڈیانوالہ باغ دیکھنے گئے تھے۔ گئے تھے نا؟ وہاں ہم نے کنویں کے پاس تصویریں اتاریں، دو تصویریں ہم نے اکٹھے اتروائی تھیں اور کیمرے کو آٹو پر سیٹ کیا تھا۔ کیا تھا نا؟''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''کیمرا سیٹ کرتے ہوئے تم نے ایک چبوترے پر رکھا تھا۔ کیمرا ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ اسے بیلنس کرنے کیلئے تم نے کیمرے کے نیچے تہہ کئے ہوئے کاغذ رکھے تھے۔ کیمرا ''سیٹ'' ہو گیا تھا۔ ہم نے تصویر اتاری تھی اور پھر کیمرا اٹھا کر چلتے بنے تھے۔ کاغذ وہیں رکھے رہ گئے تھے۔ مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ کاغذ وہیں رکھے رہ گئے تھے اور وہی پولیس رپورٹیں تھیں۔''

ارباز کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ اور اس کے تاثرات میرے خیال کی سو فیصد تصدیق کر رہے تھے۔

اس دوران میں ہمیں آہنی سلاخوں کی دوسری طرف پرتاپ سنگھ کے چھوٹے بھائی راج کی شکل نظر آئی۔ وہ اب پتلون قمیص میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ناک اور ایک رخسار، ارباز کی ٹکر سے شدید زخمی ہو چکے تھے۔ ان زخموں پر بینڈ ایج نظر آ رہی تھی۔ راج کی دونوں آنکھیں سوجنے کے سبب اس کی شکل کچھ اور کرخت ہو گئی تھی۔ چہرے پر چیچک کے داغوں والا اے ایس آئی گپتا بھی اس کے ساتھ تھا۔ گپتا کی موجودگی میں راج نے ہم دونوں کو گندی گالیاں دیں اور سلاخوں کے اندر سے ارباز کو گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی۔ ارباز نے بھی جواب میں راج کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی تو اس کا یار گپتا طیش میں آ گیا۔ اس نے ارباز کے، سلاخوں سے باہر کھلے ہاتھ پر زور دار

ڈنڈے رسید کئے اور اسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔ راج بھی گالیاں بکتا جا رہا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ دونوں باہر چلے گئے۔

چند منٹ بعد اے ایس آئی گپتا اکیلا واپس آیا۔ ہم دونوں کی طرف ایک ساتھ انگلی اٹھا کر بولا۔ ''تم دونوں مسلوں کی بدمعاشی ناک کے راستے نہ نکال دی تو اپنے باپو کا نہیں۔'' پھر گالی دے کر بولا۔ ''ننگا کر کے چھتر ماروں گا تم دونوں کو۔''

چھتر مارنے اور کھانے کی نوبت تو نہیں آئی بہرحال خبیث گپتا کی باتیں ذہن پر نقش ہو کر رہ گئیں۔ اگلے اڑتالیس گھنٹے ہم دونوں نے سخت مصیبت میں گزارے۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ بار بار کی درخواست کے باوجود انسپکٹر گرو جیت سنگھ یا اے ایس آئی گپتا نے ہمیں فون پر امرتسر میں رابطہ نہیں کرنے دیا۔ لاک اپ میں ایک ہی چارپائی تھی۔ ایک نہایت گندا باتھ روم تھا۔ جس کے ٹوٹے دروازے کے سوراخوں سے مچھر رات بھر نکلتا تھا اور مزاج پرسی کرتا تھا۔ لوہے کے ایک جھلنگا سے نواڑی پلنگ پر ہمیں اکٹھے سونا پڑ رہا تھا۔ کھانے میں دال بھاجی اور تندور کی ٹھنڈی روٹیاں مل رہی تھیں۔ لیکن یہ کھانا تقریباً ویسے کا ویسا ہی پڑا رہتا تھا۔ پریشانی کی یلغار نے بھوک اڑا کر رکھ دی تھی۔

تیسرے دن صبح سویرے انسپکٹر گرو جیت سنگھ نے ہمیں امرتسر فون کرنے اور نریندر صاحب سے رابطہ کرنے کی اجازت دی۔ میں نے مختصر الفاظ میں نریندر صاحب کو اپنی بپتا سے آگاہ کیا اور جلد سے جلد جالندھر پہنچنے کی درخواست کی۔ (اپنی بپتا میں، میں نے لڑکی کا ذکر اب بھی نہیں کیا تھا صرف پولیس رپورٹوں کی بات کی تھی۔)

نریندر صاحب نے بتایا کہ آج ان کی ایک پیشی ہے جس میں انہیں ہر صورت کورٹ پہنچنا ہے۔ وہ پوری کوشش کریں گے۔ لیکن اگر نہ آ سکے تو کل ضرور پہنچ جائیں گے۔

ساری صورتحال سے وہ کچھ گھبرائے ہوئے بھی لگتے تھے۔ میں نے کہا۔ ''انکل! یہاں ہم بڑی مشکل میں ہیں۔''

انہوں نے مجھ سے تھانے کا پتہ اور ایس ایچ او کا نام وغیرہ پوچھا۔ پھر تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''میں ابھی کسی سے، ایس ایچ او کو فون کرواتا ہوں۔''

فون کے بعد ہمیں دوبارہ لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ ایک سکھ کانسٹیبل جس کے کانوں میں مرکیاں تھیں ہمیں کل سے ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "اس نے ہندو اے ایس آئی گپتا کی نظر بچا کر ہمیں ایک دو بار سگریٹ کی پیشکش بھی کی تھی۔ دوپہر کے وقت گپتا اور گروجیت سنگھ کسی "ریڈ" پر روانہ ہوئے تو مرکیوں والا سکھ کانسٹیبل ہمارے پاس آ گیا۔ وہ سلاخ دار کھڑکی سے باہر کھڑا ہو کر ہمیں تشویشناک نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا "اوئے بھائی لوگو! اگر یہاں تمہارا کوئی جان پہچان والا ہے تو اس سے رابطہ کر لو نئیں تو بڑی سخت مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

"لیکن یار! ہمارا جرم کیا ہے؟" ارباز نے تپ کر پوچھا۔

"جرم شرم کا تو مجھے پتہ نہیں۔ پر اتنا بتا دیتا ہوں کہ اگر تم اپنے کاغذ پیش نہ کر سکے تو بڑی سخت آفت آ جائے گی تم پر۔ واہگرو شا کرے...... تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ وڈے افسروں کے من میں اگر جاسوسی کا شبہ پکا ہو گیا نا تو بہت شکنجہ کسا جائے گا تم دونوں پر۔"

"ایک کاغذ گم ہو جانے سے کوئی جاسوس بن جاتا ہے؟"

"یہ کاغذوں کا ہی تو سارا کھیل ہے مترو!" سکھ کانسٹیبل نے سرگوشی کی۔ "ایک کاغذ وہ بھی ہوتا ہے جس کو بلیک وارنٹ کہتے ہیں اور اس پر بندہ پھانسی لگ جاتا ہے۔"

سکھ کانسٹیبل نے جو کچھ کہا تھا ہماری ہمدردی میں کہا تھا۔ لیکن ان باتوں نے ہمیں اگلے دن تک سخت پریشان رکھا۔ ہمیں ایک امید یہ بھی تھی کہ شاید امریتا کچھ ہاتھ پاؤں مارے اور اس کی کوشش سے باؤ جی یا پرتاپ سنگھ وغیرہ ہی ہمارے چھٹکارے کیلئے کچھ کریں۔ لیکن ایسی کوئی امید بر نہیں آئی۔

دوسرے دن بارہ بجے کے لگ بھگ انکل نریندر اپنے ایک دوست وکیل کے ساتھ تھانے میں پہنچ گئے۔ میری درخواست کے مطابق انہوں نے ابھی تک پاکستان میں ہمارے لواحقین کو یہاں کی صورتحال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ تھانے پہنچنے کے بعد انکل نریندر کیلئے کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی اور رہنی بھی نہیں چاہئے تھی۔ ورنہ وہ ہماری مدد کس طرح کر پاتے۔ ہمارے بتانے سے پہلے ہی انہیں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ معاملہ صرف پولیس رپورٹس کے گم ہونے کا ہی نہیں۔ ایک سکھ لڑکی کا ٹنٹنا

بھی پوری شدت کے ساتھ یہاں موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ نہیں چھپانا چاہئے۔ ہم نے بھی انکل نریندر اور وکیل روہیل سنگھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ لڑکی والے معاملے پر انکل نریندر کچھ جز بز نظر آئے۔ لیکن صورتحال ایسی تھی کہ وہ ہمیں سرزنش کر کے مزید دل گرفتہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ فی الوقت اصل مسئلہ پولیس رپورٹوں کا تھا اور اس کی سنگینی ہم سب پر ظاہر تھی۔ انکل نریندر اور وکیل روہیل صاحب ہمیں تسلی تشفی دے کر چلے گئے (ہوٹل کے کمرے کی چابی میں نے انکل کو دے دی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا انہوں نے ہوٹل میں ہمارا کمرا خالی کر کے کرایہ ادا کر دیا تھا۔ لیکن ہمارا سامان وہیں ہوٹل میں امانتاً رکھ چھوڑا تھا) تھانے سے روانہ ہوتے ہوئے انکل نریندر نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے ایس ایچ او سے بات کر لی ہے۔ یہاں ہمیں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔ ارباز نے انکل نریندر سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھر میں ہماری گمشدہ رپورٹوں کو ایک بار پھر اچھی طرح سے تلاش کر لیں۔

اس روز پولیس والوں نے ہماری گرفتاری ڈالی اور اگلے روز ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے ہمیں عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ پر واپس تھانے لے آئے۔ اے ایس آئی گپتا کے سوا دیگر اہلکاروں کا سلوک ہمارے ساتھ زیادہ سخت نہیں تھا۔ اس روز شام کو ایس ایچ او گروجیت نے فون پر میری بات انکل نریندر سے کرائی۔ انکل سے میں نے سب سے پہلے رپورٹوں کے بارے میں ہی پوچھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا رپورٹیں جنڈیانوالہ باغ میں گم ہوئی ہیں۔ وہی غرض مند دیوانہ والی بات تھی۔

انکل کا جواب نفی میں تھا۔ رپورٹیں نہیں ملی تھیں۔ بہرحال انکل نے تسلی دی کہ وہ ڈپلی کیٹ رپورٹیں نکلوانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ امریتا کے گھر والے بہت بھڑکے ہوئے ہیں۔ اور وہ اس امر کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ہم پر سخت کیس بنے۔



انکل نریندر اور وکیل روہیل صاحب سے ہماری اگلی ملاقات اگلے روز بارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ کسی ساتھ والے کمرے میں کسی بے آسرا ملزم کے ساتھ مار پیٹ ہورہی تھی اوراس کی چیخیں پورے تھانے میں گونج رہی تھیں۔ پولیس اسٹیشنوں میں اس قسم کی صورتحال ماحول کوگمبھیر تر کر دیتی ہے۔

میں اور ارباز گم صم بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس دوران میں انکل نریندر کی صورت نظر آئی اور ہمارے دلوں میں امید کی کرنیں نمودار ہوگئیں......انکل کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ انسپکٹر گروجیت کی خصوصی رعایت کے سبب دونوں حضرات نے ہم سے لاک اپ کے اندر آ کر ملاقات کی۔

انکل نریندر نے کہا۔ ''ایک خبر خوشی کی ہے اور دوسری نراشا کی۔''

''خوشی کی کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل میں اور روہیل متعلقہ پولیس اسٹیشن میں گئے تھے۔ وہاں وہ رجسٹر وغیرہ موجود ہیں جن میں پاکستانی سیاحوں کا اندراج کیا گیا تھا' کافی کوشش کر کے اور دے دلا کر ہم رجسٹر کھولنے میں کامیاب ہوئے۔ ایک رجسٹر میں 24 ستمبر کی تاریخ میں تمہارا مکمل اندراج مل گیا ہے اور تمہاری پولیس رپورٹ کی نقل بھی تیار ہوگئی ہے۔''

''اور ارباز کی رپورٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسری خبر جو نراشا کی ہے وہ یہی ہے۔'' انکل نریندر نے کہا۔ ''ارباز کا نام رجسٹر میں بھی نہیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے بے حد حیرانی سے پوچھا۔

''اس سوال کا جواب تو ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔'' وکیل روہیل صاحب نے کہا۔

''آپ..... آپ کو دیکھنے میں غلطی لگی ہوگی وکیل صاحب' میں نے کہا۔ ''ہم دونوں کی انٹری ایک ساتھ ہوئی تھی۔ ایک ساتھ اندراج ہوا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''جیسے بھی ہوا ہے لیکن ابھاگے (بدقسمتی) کی بات یہ ہے کہ یہ ہوا ہے۔ ہم نے ایس پی صاحب سے تفصیلی بات کی ہے۔ ایک دو سفارشیں بھی ڈالی ہیں۔ بہت جتن کر رہے ہیں کہ پرسوں تم دونوں کی ضمانتیں ہوسکیں۔ لیکن صرف ایک ضمانت ہوتی نظر آ رہی ہے۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ انکل نریندر کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ صرف میری ضمانت ہوسکے گی ارباز بدستور حراست میں رہے گا۔ ارباز کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا۔

میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''انکل! کوئی ایسی صورت نکالیں کہ جو کچھ ہو ہم دونوں کے ساتھ ہو۔ میں اکیلا باہر جانا نہیں چاہتا۔''

''نادانی کی بات نہ کرو وامی' یہ دل سے نہیں دماغ سے سوچنے کا وقت ہے۔'' ارباز نے بھی انکل کی تائید کرتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک پردیس' دوسرے جدائی......اور جدائی بھی ایسی جس میں پریشانی ہی پریشانی تھی۔

تیسرے دن وہی کچھ ہوا جو انکل نریندر اور روہیل صاحب نے کہا تھا۔ عدالت میں میری ''بیل'' ہوگئی۔ توقع تھی کہ ارباز کو جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل روانہ کر دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میرے لئے بے حد صدمے کی بات تھی۔ لیکن انکل اور روہیل صاحب مجھے مسلسل تسلی تشفی دے رہے تھے۔ انکل نے بتایا کہ وہ اپنے بڑے بھائی مہندر کے ذریعے ارباز کی ڈپلی کیٹ رپورٹ بنوانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہی تھا کہ ابھی تک ارباز کا اندراج نہیں مل رہا تھا۔ بڑی حیرانی اور تشویش کی بات تھی۔

میں نے علیحدگی میں انکل سے پوچھا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ امریتا کے اس چھوٹے چچا پرتاپ نے ہی کوئی چکر چلا دیا ہو۔ لگتا ہے کہ پولیس میں اس کی جان پہچان بھی ہے۔''

''نہیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ رجسٹر میں سے اندراج کو ختم کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اندراج کاٹا جائے تو اس کا پتہ بھی فوراً چل جاتا ہے۔ اب تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اوپر تلے دو ''ورگھٹنائیں'' ہوئی ہیں۔ ارباز کی پولیس رپورٹ گم ہوئی

ہے اور عملے کی غلطی کے کارن اس کا اندراج بھی نہیں ہوسکا۔''

''اب اس کا کیا حل ہے انکل؟''

''میں تمہیں نراش کرنا نہیں چاہتا داؤ! لیکن یہ بڑی مشکل سچوئیشن ہے۔ بات کسی بھی طرف جاسکتی ہے۔ اگر پرتاپ سنگھ وغیرہ اپنے کیس کی پیروی نہ بھی کریں تو صرف رپورٹ والے معاملے کی وجہ سے ارباز سخت کٹھنائی میں پڑسکتا ہے۔''

پروگرام کے مطابق میں ایک بار پھر وشواناتھ ہوٹل میں آ گیا۔ انکل نریندر کا کہنا تھا کہ مجھے اپنے بھائی کو پاکستان میں صورتحال سے آگاہ کر دینا چاہئے۔ لیکن میں فی الحال اس شرمندگی سے بچنا چاہ رہا تھا۔ دل میں امید تھی کہ کیا پتہ اچانک بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ انکل نریندر نے مجھے زبردستی ایک ہزار بھارتی روپے بھی تھما دیئے تا کہ میں جالندھر میں قیام و طعام کا خرچہ کرسکوں۔

وشواناتھ ہوٹل کا کمرا مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ یہاں میں اور ارباز اکٹھے پہنچے تھے۔ کچھ وقت اکٹھے گزارا تھا اور آئندہ دو تین ہفتے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس کمرے میں امریتا کی سرگوشیاں اور ہنسی بھی گونج رہی تھی۔ جب ہم تینوں اس کمرے سے نکل کر تلسی مندر جارہے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں سبھی کچھ تہہ و بالا ہونے والا ہے۔ تلسی مندر میں ہٹے کٹے پرتاپ سنگھ اور اس کے بھائی کی اچانک آمد اور ان کے ساتھ مار کٹائی کے سارے مناظر میرے ذہن میں تازہ ہوگئے۔ اور دل کو افسردہ کرنے لگے۔

جالندھر جو ارباز کے ساتھ بے حد خوبصورت اور دلچسپ تھا۔ اب ویران لگنے لگا تھا...... یوں لگتا تھا کہ ہر طرف دھول اڑ رہی ہے۔ اور دم گھٹ رہا ہے۔ اگلے دو دن میں' میں بس ایک مرتبہ ہوٹل سے باہر نکلا...... شیونگ کا سامان خریدا۔ ایک چپل لی اور واپس آ گیا۔ واپسی کے وقت جب میں ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا ایک لڑکی اوپر سے نیچے اتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکی اور دوبارہ اوپر چلی گئی۔ میں اپنے کمرے کا لاک کھولنے کیلئے جیب میں چابی ڈھونڈ رہا تھا۔ لڑکی میرے قریب آئی اور بولی۔ ''ست سری کال'' میں نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا...... وہ کہنے لگی۔ ''کیا ہم ادھر ہی لابی میں بیٹھ کر ذرا بات کر سکتے ہیں؟''

میں چونک گیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ اس لڑکی کا تعلق ضرور امریتا والے معاملے سے ہوگا۔ میں لڑکی کے ساتھ برآمدہ نما لابی میں آ گیا۔ کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ دو تین پرانے صوفے اور کرسیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ لڑکی نے کہا۔ ''مجھے وشواش ہے کہ آپ ہی دائم صاحب ہیں...... احمد دائم۔''

''جی' میں ہی ہوں۔'' میں نے تصدیق کی۔

''میرا نام شانتی ہے۔ میں امریتا کی سہیلی لالہ کے ساتھ ہی کالج میں پڑھتی ہوں۔'' لڑکی نے اپنا تعارف کرایا۔

مجھے یاد آیا کہ امریتا نے ایک دن میرے اور ارباز کے سامنے شانتی نامی لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ امریتا نے بتایا تھا کہ لالہ پر اسے پورا وشواش ہے۔ وہ اس کیخلاف کسی طرح کی بات نہیں کرسکتی۔ لیکن لالہ کی دوست شانتی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے لالہ سے تھوڑا بہت معلوم ہوا ہو اور اسی نے انکل پرتاپ وغیرہ کو ''ارباز والے معاملے'' سے باخبر کردیا ہو۔

آج وہی شانتی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ شکل وصورت سے بھلی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس نے جو باتیں کیں وہ بھی مجھے بھلی ہی لگیں۔ اس نے آنکھوں میں نمی لے کر کہا۔ ''امریتا بہت اچھی لڑکی ہے'' لیکن سادہ دل بھی ہے۔ اسے کھوٹے کھرے کی زیادہ پہچان نہیں ہے۔ وہ لالہ کو اپنی Best Friend سمجھتی ہے۔ اس پر اندھا وشواش رکھتی ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں لالہ جیسی اوپر سے نظر آتی ہے۔ ویسی اندر سے نہیں۔ بے شک وہ امریتا کی دوست ہے لیکن اندر سے اس کیلئے رقابت بھی رکھتی ہے۔''

''کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی جہاں' ہر رویے کا کوئی کارن تو ہوتا ہی ہے نا۔ لالہ کے رویے کے پیچھے بھی ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔ شاید آپ کو پتہ ہی ہو۔ امریتا کے ایک شادی شدہ بھائی ہیں جو اپنی بیوی کے ساتھ کولمبو شفٹ ہوگئے ہیں۔ ایک موقع پر ان بھائی صاحب کا رشتہ لالہ کے ساتھ ہونے کی بات چلی تھی۔ مگر پھر یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بے شک لالہ امریتا کی دوست تھی' لیکن بطور بھابی وہ بھی لالہ کو پسند نہ کرسکی...... بہرحال یہ لمبی بات ہے

دائم صاحب! میں نے آپ کو تھوڑا سا اشارہ دے دیا ہے کہ لالہ اندر سے امریتا کیلئے کیسی ہے۔ اصل بات جو میں آپ کو بتانے آئی ہوں' کچھ اور ہے۔''

''جی کہیئے میں سن رہا ہوں۔''

وہ بولی! ''یہ بات میں آپ کو صرف اس لئے بتا رہی ہوں تا کہ آپ اور آپ کا دوست آئندہ لالہ کی طرف سے محتاط رہیں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور ٹشو پیپر سے گردن کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''ایک طرف لالہ امریتا کی ہمراز سہیلی کی حیثیت سے آپ لوگوں کے ساتھ گھومتی رہی ہے اور دوسری طرف آپ کی مخبری بھی کرتی رہی ہے۔ اس مخبری کے کارن ہی انکل پرتاپ اور انکل راج کو امریتا اور ارباز صاحب کے سمبندھ کا پتہ چلا۔ اور اس مخبری کے کارن ہی وہ دو مرتبہ امریتا اور ارباز کو عین ملاقات کے وقت' پکڑنے کیلئے پہنچ گئے......''

شانتی مجھے تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتانے لگی...... مجھے اس کی باتوں میں سچائی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ تصور میں گزرے ہوئے مناظر گھومنے لگے...... دو کے بجائے تین مواقع ایسے آئے تھے جب پرتاپ سنگھ عین ملاقات کے وقت امریتا اور ارباز کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ یعنی دیش بھگت میموریل ہال کے سامنے تو پرتاپ ان دونوں کو صرف دیکھ کر گزر گیا تھا۔ مگر بعد کے دونوں موقعوں پر اس کا ارباز سے باقاعدہ آمنا سامنا ہوا تھا۔ آخری ملاقات میں پرتاپ کے ساتھ راج سنگھ کے علاوہ ایک ساتھی بھی تھا۔ اور ہمارے درمیان باقاعدہ دنگا ہوا تھا۔ یہ بات تو پہلے ہی ذہن میں نہیں سماتی تھی کہ دو تین مرتبہ پرتاپ اور راج اتفاقاً ہی موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ بہرحال اب شانتی کی باتوں سے مخبری والا معاملہ کنفرم ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے اور شانتی کیلئے چائے منگوائی۔ اس نے بس ایک دو چسکیاں لے کر کپ ایک طرف رکھ دیا۔ وہ پریشان نظر آتی تھی۔ گہرے سانس لے کر بولی۔ ''بہرحال اب ان باتوں سے کچھ خاص فائدہ نہیں' سب کچھ تو ختم ہو رہا ہے۔ آپ کو سنڈے کے بارے میں پتہ چل ہی گیا ہو گا۔''

''سنڈے کے بارے میں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''سنڈے کو شادی ہو رہی ہے نا امریتا کی۔'' شانتی نے انکشاف کیا۔

میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ تو پتہ تھا کہ یہ آفت ہم پر ٹوٹنے والی ہے لیکن اتنی جلدی؟ اس کا اندازہ نہیں تھا...... ''آ...... آپ کس سنڈے کی بات کر رہی ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''یہی سنڈے جو آ رہا ہے چار دن بعد۔''

میرے دل میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔ ارباز کی بے بسی کے تصور نے بے حال کر دیا۔ وہ قسمت کا مارا سلاخوں کے پیچھے تھا اور جس کو حاصل کرنے کے سپنے وہ دیکھ رہا تھا۔ وہ عروسی جوڑا پہن کر اور پھیرے لے کر کسی اور کی ہونے جا رہی تھی۔ وہی درد بھری کہانی' وہی دلفگار کتھا جو قرنوں سے دہرائی جا رہی ہے۔

''لگتا ہے آپ کو اس بارے میں جانکاری نہیں تھی۔'' شانتی نے میرے تاثرات دیکھ کر خیال آرائی کی۔

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ بولی۔ ''انکل پرتاپ کا بیٹا راکیش پرسوں سنگاپور سے آ گیا ہے۔ اسے بڑی مشکل سے صرف دس دن کی چھٹی ملی ہے۔ شادی کے فوراً بعد وہ لوگ واپس سنگاپور چلے جائیں گے۔ شادی کا فنکشن بھی مختصر سا ہو گا۔ انکل پرتاپ کا کوئی قریبی رشتے دار تو یہاں ہے نہیں۔ امریتا اور باؤجی کی طرف سے بھی بس آٹھ دس لوگ ہی شریک ہوں گے۔ سارا پروگرام فائنل ہو چکا ہے۔''

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ دل پر مسلسل گھونسے برس رہے تھے۔ یہ بڑی تکلیف دہ خبر تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پہلی بار اندازہ ہوا کہ غریب الوطنی اور مصیبت اکٹھی ہو جائیں تو تنہا بندے پر کیا گزرتی ہے۔ آجا کے انکل نریندر کے سوا یہاں اور کون تھا...... اور وہ بے چارے بھی اس سلسلے میں بھلا کیا کر سکتے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر دل خون ہو رہا تھا کہ حوالات میں جا کر یہ خبر ارباز کو کیسے سناؤں گا۔

شانتی کی آواز نے مجھے چونکایا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''دائم صاحب! شاید آپ جانتے ہی ہوں۔ انکل پرتاپ سے ہماری دور پار کی رشتے داری بھی ہے۔ رشتے داری بھی کیا ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ تھوڑی سی جان پہچان ہے۔ مجھے انکل پرتاپ کے بیٹے راکیش کے بارے میں جو تاثر ملا ہے' وہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ اپنی ٹھنڈی ٹھار چائے کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''کوئی خاص بات نہیں ہے' ہوسکتا ہے کہ میرا اندازہ ہی غلط ہو۔ لیکن مجھے...... راکیش کچھ الجھا ہوا...... کچھ پیچیدہ سا بندہ لگتا ہے۔ ایک مرتبہ ڈیڈی نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ راکیش ٹھیک لڑکا نہیں ہے۔''

''کوئی...... وضاحت نہیں کی آپ کے ڈیڈی نے؟''

''نہیں' وضاحت نہیں کی۔ اور نہ ہی میری ہمت ہوئی کہ کچھ پوچھوں......''

''آپ خود راکیش سے کتنی بار ملی ہیں؟''

''تین چار بار سے زیادہ نہیں۔ ایک مرتبہ اس نے......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

''کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ جیسے ہمت کر کے بولی۔ ''ایک مرتبہ اس نے مجھ سے بھی فلرٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں دامن بچا گئی۔''

ہم نے پانچ دس منٹ مزید گفتگو کی۔ میں نے شانتی سے پوچھا کہ موجودہ حالات میں اس شادی کو رکوانے کا کوئی چانس ہے۔

شانتی نے کہا۔ ''مجھے تو چانس نظر نہیں آ رہا۔ اب تو کیول ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے' اگر امریتا خود پروٹیسٹ کرے اور شادی میں رکاوٹ بن جائے تو شاید...... حالات بدل جائیں۔''

''کیا امریتا سے کسی طرح ملاقات ہوسکتی ہے؟''

''اب تو یہ بھی کٹھن نظر آتا ہے۔ شادی میں کیول تین چار دن باقی ہیں۔''

''کیا آپ کسی طرح فون پر رابطہ کر کے امریتا سے کہہ سکتی ہیں کہ وہ ایک بار آ کر مجھ سے بات کر لے۔''

''لالہ نے میری طرف سے اسے بڑا بدگمان کر رکھا ہے۔ وہ میری کسی بات پر وشواش نہیں کرے گی۔ بلکہ الٹا اثر لے گی۔ پھر بھی اگر آپ کہتے ہیں تو میں کسی دوست کے ذریعے کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں۔ ویسے اس کے آنے کا امکان بہت کم ہے۔''

''آپ کوشش تو کریں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے موقع مل جائے۔ ارباز تو حوالات میں ہے۔ اسی کی طرف سے اس کے گھر والوں کو زیادہ خطرہ ہوسکتا ہے نا۔''

شانتی نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کر چلی گئی۔

میں بھی بوجھل دل کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ امریتا' لالہ کی دوستی کا دم بھرتی تھی۔ مگر مجھے یوں لگا تھا کہ شانتی' لالہ سے کہیں زیادہ اس کی خیر خواہ اور ہمدرد ہے۔ لالہ کا کردار بالکل نئے رخ سے سامنے آیا تھا۔

اس روز شام کو میں دل کڑا کر کے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ چند ہی دن میں ارباز کی آنکھیں سفیدی مائل ہوگئی تھیں اور چہرہ اتر گیا تھا۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ انکل نریندر کی کوششوں اور اثر ورسوخ کی وجہ سے حوالات میں اس کے ساتھ ناروا سلوک نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس Separate کمرے میں تھا جہاں نواڑی پلنگ اور باتھ روم کی سہولت موجود تھی۔ کھانا بھی مناسب مل رہا تھا۔

میں نے بڑے نرم لفظوں میں اور ٹھہر ٹھہر کر اسے شانتی کی دی ہوئی اطلاع کے بارے میں بتا دیا۔ اس کا چہرہ زرد ہوگیا اور آنکھیں مزید گہرائی میں اتر گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سنبھلا تو اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے اور چہرے پر طیش کی سرخی ابھر رہی تھی۔ وہ بہت کڑے لہجے میں بولا۔ ''نہیں یہ نہیں ہونے دوں گا' کسی صورت نہیں۔''

''کیا کر سکو گے تم؟'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''اور میں بھی کیا کر سکوں گا۔ لگتا ہے کہ یہاں کچھ بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔''

''تم...... تم ایسا کرو دامی! کسی طرح امریتا سے رابطہ کرو۔ ہمیں پتہ تو چلے کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ اتنی جلدی ہمت نہیں ہارے گی۔ اسے ہمت ہارنی بھی نہیں چاہئے۔ کوئی رستہ نکالو دامی! امریتا سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''شانتی نے وعدہ تو کیا ہے۔ اب دیکھیں وہ کچھ کر سکتی ہے یا نہیں۔''

ارباز بے حد بے قراری سے لاک اپ کے اندر ٹہلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ اس کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ نہ ہی یہ برداشت ہوا کہ میں آزاد فضا میں کھڑا رہوں اور وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہے۔ میں اپنے اندر کا کرب چھپا کر وہاں سے ہٹ آیا۔

وہ رات بڑی طویل' بڑی تاریک اور اندوہناک تھی۔ امریتا کسی اور کی ہو رہی تھی...... اور ارباز قفس میں تھا۔ میں نے رات کا بیشتر حصہ ہوٹل کے کمرے میں ٹہلتے اور

کانٹوں بھرے بستر پر کروٹیں لیتے گزارا۔ ارباز سے تعلق تو بہت پرانا تھا...... اب ایک عجیب سا قلبی تعلق پیدا ہو چکا تھا' امریتا سے بھی...... رات پچھلے پہر میں نڈھال سا ہو کر سو گیا۔ صبح دس بجے کے قریب آنکھ کھلی۔ کھڑکی کے نیچے سے گزرنے والی سڑک پر ٹریفک کا شور تھا۔ کسی قریبی میوزک سنٹر میں نئی فلم بے تاب کا نغمہ زور وشور سے بج رہا تھا۔

جب ہم جواں ہوں گے...... جانے کہاں ہوں گے

نیند سے جاگتے ہی امریتا کی شادی کا خیال ایک بہت بڑے وزنی پتھر کی طرح سینے کو دبانے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک ایک مدھم دستک نے مجھے چونکایا۔ یہ کون ہوسکتا ہے؟ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا۔ ''کیا شانتی کوئی پیغام لے کر آئی ہے...... یا پھر پولیس والے یا...... نریندر صاحب؟''

''کون؟'' میں نے دروازے کے سامنے جا کر پوچھا۔

دستک پھر ہوئی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک برقعہ پوش لڑکی کھڑی تھی۔ مسلمان لڑکیوں کی طرح اس نے اپنا تین چوتھائی چہرہ سیاہ ریشمی نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے اسے اس کی آنکھوں سے پہچان لیا۔ وہ امریتا تھی۔ وہ جلدی سے اندر آ گئی۔ اس کے سینے کا زیروبم اس کی اعصابی کشیدگی کی گواہی دے رہا تھا۔

''دروازہ بند کر دیں۔'' اس نے کہا۔

میں نے دروازہ بھیڑ دیا۔ اس نے نقاب ہٹا دیا۔ کٹورہ آنکھوں میں افسردگی تھی اور غم کردٹیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے ایک گلاس میں پانی پیش کیا۔ پانی پی کر وہ بولی۔ ''دای! میرے پاس سے کم ہے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ آج اس لئے آ گئی ہوں کہ آج کے بعد آنا بہت مشکل تھا۔''

''کوئی پیغام ملا تھا تمہیں؟؟''

''ہاں شانتی نے ایک مشترکہ سہیلی کے ذریعے سندیسہ بھجوایا تھا۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے امریتا؟'' میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''وہی جو ہماری قسمت میں تھا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے دای! میرا دل

ارباز کیلئے روتا ہے۔ لیکن میں کچھ کر نہیں سکتی۔ میری جگہ کوئی بھی ہندوستانی لڑکی ہوتی شاید اس چویشن میں میری ہی طرح بے بس ہوتی۔''

وہ سسکنے لگی۔ وہ غم زدہ نظر آتی تھی۔ پھر بھی میں اس سے جتنے شدید ردعمل کی توقع رکھتا تھا۔ یہ ردعمل اتنا شدید نہیں تھا۔ اس کی باتوں میں تڑپ کے بجائے مایوسی اور پسپائی کا تاثر تھا۔ شاید اس نے جتنا تڑپنا تھا۔ چند دن پہلے تک تڑپ چکی تھی۔ اب یوں لگتا تھا کہ چڑھتے ہوئے دریا اتر گئے ہیں۔ سرکش ہواؤں نے لگامیں پہن لی ہیں۔

اس نے روتے روتے کہا۔ ''دای! یہ غم میرے لئے ہمیشہ سوہان روح رہے گا کہ ارباز میری خاطر پاکستان سے بھٹکتا ہوا یہاں آیا اور ایک بڑی مصیبت کا شکار ہوا۔ میں واہگرو سے پرارتھنا کرنے کے سوا اس کیلئے کیا کر سکتی ہوں؟ اور میں کر رہی ہوں دن رات پرارتھنا۔ مجھے...... مجھے وشواش ہے دای! ہماری برباد محبت کے صدمے میں ہی سہی' لیکن واہگرو ارباز کی مشکل جلد آسان کرے گا......'' وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں پتہ چلا ہے کہ تمہاری دوست لالہ نے تمہارے اور ارباز کے معاملے میں کیا کردار ادا کیا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گلوگیر آواز میں بولی۔ ''کس کس سے شکوہ کروں؟ کس کس کے رویئے کا گلہ کروں؟ بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب جو کچھ درپیش ہے اسے قبول کرنا ہے۔ اس کے سامنے سیس جھکانا ہے۔''

پھر اس نے اپنے برقعے کے اندر ایک خوبصورت البم نکالی۔ مجھے تھماتے ہوئے بولی۔ ''اسے رکھ لو۔ یہ ارباز کی امانت ہے۔ اسے دے دینا اور اس سے کہنا مجھے شما (معاف) کر دے۔ میں اس کا ساتھ نہیں نبھا سکی۔ میری کمزوریوں اور مجبوریوں نے مجھے لاچار کر دیا ہے۔''

میں نے کانپتے ہاتھوں سے البم کھولی۔ اس میں تصویریں نہیں تھیں۔ اس میں تحریریں تھیں۔ وہ سارے خط جو اب تک ارباز کی طرف سے وقتاً فوقتاً امریتا کو ملتے رہے تھے۔ یہ رنگین خط بڑی ہی نفاست کے ساتھ خوبصورت البم میں سجائے گئے تھے۔ البم کے اوراق پر جو جگہ خالی بچی تھی وہاں امریتا نے اپنے ہاتھ سے منتخب شعر لکھے ہوئے تھے۔ یہ شعر خطوں کی مناسبت سے تھے۔ مثلاً جو خط کسی تہوار پر موصول ہوا تھا اس پر

تہوار کے حوالے سے شعر تھا۔ ناراضی والے خط پر اسی کیفیت کی نسبت سے شعر درج تھا اور اداس خط کا شعر بھی اداس تھا۔

یوں لگتا تھا کہ ان خطوں کو بڑی محبت سے رکھا گیا ہے۔ اور بار بار پڑھا گیا ہے۔ یہاں انڈیا آنے کے بعد امریتا سے جو گفتگو ہوتی رہی تھی۔ اس سے بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ امریتا اور ارباز کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ان خطوط کا بہت حصہ ہے۔ یعنی ان کی محبت میں قلمی محبت یا قلمی دوستی کا کردار بہت زیادہ تھا۔ امریتا میرے اور ارباز کے سامنے گاہے بگاہے ان خطوں کے حوالے دیتی رہتی تھی۔ اب یہ دلپسند خط اور ان خطوں میں بسا ہوا سارا ماضی بڑے درد کے ساتھ وہ خود سے جدا کر رہی تھی۔

پھر اس نے وہی جملہ کہا جو مجبور مشرقی لڑکیاں ایسے موقعوں پر کہا کرتی ہیں۔ نسل در نسل کہا اور سنا جانے والا یہ اشکبار جملہ آج میرے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''وای! ارباز سے کہنا مجھ بدقسمت کو بھول جائے۔ کوئی اچھی سی سندر سی لڑکی دیکھ کر اپنا گھر بسا لے۔ میں اسے اپنی ہر پرارتھنا میں یاد رکھوں گی۔''

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کے برقعے میں یوں چھپے ہوئے تھے جیسے اس کے غم اس کے سینے میں۔ مجھے رب راکھا کہہ کر وہ دروازے کی طرف مڑی۔ لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے رک گئی۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو، کوئی سوال، کوئی بات، کوئی وضاحت لیکن پھر یہ سوال اس کی زبان پر نہیں آیا۔ نہ وہ بات، نہ وہ وضاحت...... اور وہ چلی گئی۔ دروازہ ادھ کھلا رہ گیا۔ ویران دنوں میں اور شبنمی راتوں میں ایک طویل سفر کے آخری موڑ پر لڑکیاں ایسے ہی چلی جاتی ہیں۔ دروازے ادھ کھلے رہ جاتے ہیں۔

میرے سینے میں مد و جزر تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں حالات کا رخ تبدیل کرنے کیلئے کیا کر سکتا ہوں اور اب تو ایسی کسی کوشش کیلئے وقت بھی بہت کم تھا...... نہ ہونے کے برابر تھا۔ شادی میں بس تین دن باقی تھے۔ میرے دل میں آئی کیوں نہ ایک بار...... صرف ایک بار امریتا کے باؤ جی سے ملنے کی کوشش کروں۔ انہیں بتاؤں کہ اپنے مفاد پرست دوست پرتاپ سنگھ کی باتوں میں آ کر وہ ایک نامناسب راستے پر چل نکلے ہیں۔ وہ دو محبت کرنے والے دلوں کو ہمیشہ کیلئے جدا کر رہے ہیں اور

ان میں ایک دل...... ایک روتا ہوا دل ان کی لاڈلی بیٹی کا ہے۔

باؤ جی سے ملنے کی خواہش میرے دل میں اتنی شدت سے پیدا ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس شدت کی کیا وجہ تھی؟ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب وقت کم تھا اور شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ باؤ جی کے حوالے سے مجھے کئی طرح کا حسن ظن تھا۔ پتہ نہیں کیوں ارباز کی طرح میرا دل بھی کہتا تھا کہ باؤ جی دل کے بہت نرم اور انسان دوست شخص ہوں گے۔

امریتا کے والد یعنی باؤ جی سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے...... اس کے علاوہ پارٹ ٹائم ٹیچنگ بھی کرتے تھے۔ وہ جس اکیڈمی میں پڑھاتے تھے اس کا ایڈریس امریتا نے ہمیں بتایا تھا۔ یہ ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت میں اس مصمم ارادے کے ساتھ نکلا کہ باؤ جی سے ایک بار ضرور ملوں گا۔

پگواڑا ٹاؤن سے بس میں بیٹھ کر میں شہر کے وسطی حصے میں پہنچا اور پھر وہاں سے گر جیت نگر آ گیا۔ یہ ایک طرح سے شہر کا بیرونی علاقہ تھا۔ یہاں تک پہنچتے ہوئے میں دیش بھگت میموریل ہال کے سامنے سے بھی گزرا۔ اس مقام کو دیکھ کر دل میں ٹیس اٹھی۔ یوں لگا جیسے اس فضا میں ابھی تک امریتا کے قہقہے گونج رہے ہیں۔ جیسے آئس کریم کے کپ ابھی میرے ہاتھ میں ہیں۔ امریتا' ارباز کے ہاتھ سے خط چھین کر بھاگی ہے۔ وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ امریتا کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ لیکن پھر ایکدم سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور پرتاپ سنگھ کا پھولا ہوا کرخت چہرہ تصور کو مجروح کرنے لگا۔

گر جیت نگر میں خالی اکیڈمی ڈھونڈنے میں مجھے تقریباً آدھ گھنٹا مزید لگ گیا...... اس کے پندرہ منٹ بعد میں اکیڈمی کے ایک علیحدہ کمرے میں امریتا کے باؤ جی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھنے سے پہلے ان کے بارے میں جو تصور کیا جاتا ہے وہ عین اس کے مطابق نکلتے ہیں۔ باؤ جی بھی ان میں سے ایک تھے۔ وہ درمیانے قد کے دبلے پتلے آدمی تھے...... موٹے شیشوں کی عینک لگاتے تھے۔ جس وقت میں نے انہیں دیکھا وہ سفید براق کرتے پائجامے میں تھے۔ سر پر نیلی پگڑی تھی۔ داڑھی اور مونچھوں کے تین چوتھائی بال سفید تھے۔ ان کی آنکھیں ذرا چھوٹی لیکن

مسکراتی ہوئی تھیں۔ ان سے صرف دو چار باتیں کرنے والا شخص ہی اس حتمی نتیجے پر پہنچ جاتا تھا کہ وہ ایک نرم خو' سادہ دل اور شریف النفس شخص سے بات کر رہا ہے...... ہمارے درمیان تعارف کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔

میں نے اپنے اندرونی خوف پر قابو پایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سر! میں خود حیران ہوں کہ میں نے آپ کے پاس آنے کی جرأت کیسے کر لی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل میں سچائی ہے اور میں جو کچھ آپ کو کہنے آیا ہوں وہ سچ کے سوا اور کچھ نہیں۔''

''ہاں کہو۔'' وہ اپنے اندرونی اضطراب کو چھپاتے ہوئے بولے۔

''میں لمبی چوڑی بات کر کے آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا سر! آپ موجودہ صورتحال کے بارے میں سب جانتے ہیں اور شاید مجھ سے زیادہ ہی جانتے ہوں گے۔ مجھے احساس ہے سر کہ میں چھوٹے منہ سے بڑی بات کر رہا ہوں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میرا دوست آپ کی بیٹی سے شادی کا خواہشمند تھا۔ وہ اس غرض سے یہاں انڈیا آیا۔ وہ امریتا سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن شاید اس سے بھی زیادہ آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں آپ کا تصور ایک مہربان اور غمگسار بزرگ کا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب آپ اس سے ملیں گے تو اس کے جذبے کی سچائی اور شدت کو ضرور محسوس کریں گے۔ پھر آپ جو بھی فیصلہ کریں گے اسے قبول ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جس دن ارباز کو آپ سے ملنے کیلئے آنا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے انکل پرتاپ نے ارباز کو دیکھ لیا اور پھر دو چار دن میں ہی وہ سب کچھ ہو گیا جس کے سبب ارباز آپ سے ملاقات سے پہلے ہی آپ کی نظروں میں گر گیا۔ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ پرتاپ صاحب کے بارے میں کوئی رائے زنی کروں۔ صرف اتنا کہوں گا کہ پرتاپ صاحب کے ڈر نے ہمیں آپ سے دور کیا اور دور کئے رکھا۔ بے شک ہم سے بھی غلطیاں ہوئیں' لیکن......''

''سنو بیٹا! باؤ جی نے میری بات نرمی سے کاٹتے ہوئے کہا۔ ان باتوں کیلئے اب سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں' تم مجھے یہ جانکاری دینے کی کوشش کر رہے ہو کہ میری بیٹی اور تمہارا دوست ایک دوسرے کے ساتھ بہت پریم کرتے ہیں۔

انہوں نے جینے مرنے کے وعدے کر رکھے ہیں اور پرسوں ہونے والی شادی انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کا المیہ انجام دے گی' یہی کہنا چاہتے ہو ناں تم؟''

''آپ کی نرم مزاجی سے ہمت پاتے ہوئے میں یہی کہوں گا سر' کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ ارباز کے دوست کی حیثیت سے میں خود بھی امریتا سے ملا ہوں اور ان دونوں کے پرخلوص جذبے کی شدت کو محسوس کیا ہے۔''

باؤ جی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی ہموار ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور انگلش میں بولے۔ ''اگر ایسی بات ہوتی بیٹا! تو امریتا مجھے باخبر کرتی۔ مجھے اپنی مرضی سے آگاہ کرتی اور ممکن تھا کہ ضد کر کے اپنی بات مجھ سے منواتی۔''

میں نے بے حد حیرانی سے باؤ جی کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ امریتا صاحبہ نے آپ سے کبھی بات نہیں کی۔''

''نہیں اس حوالے سے تو کبھی بات نہیں ہوئی...... ہاں شروع شروع میں اس نے پاکستان سے آنے والے کچھ پتر (خط) مجھے دکھائے تھے۔ پڑھ کر بھی سنائے تھے۔ پتروں کے مضمون اور تحریر کے انداز کی تعریف کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ Pen Friendship کا سلسلہ ہے۔ وہ اسے ایک دل پسند قلمی رابطہ قرار دیتی تھی۔''

''لیکن باؤ جی! یہ قلمی رابطہ دھیرے دھیرے مختلف جذبے میں بدل گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے...... میرا مطلب ہے......''

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ لیکن اس مطلب کی تائید نہیں کر سکتا۔ میری بیٹی مجھ سے کوئی بات چھپاتی نہیں ہے۔ عموماً ہر بات کہہ دیتی ہے۔ وہ یہ بات بھی کہہ سکتی تھی...... میرا وچار ہے بیٹا! کہ تم اور تمہارا دوست غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہو۔ ان غلط فہمیوں نے تمہارے ساتھ ساتھ ہمیں بھی مصیبت میں ڈالا ہے۔''

امریتا کے باپو کی بات نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ باؤ جی سچ بولنے والے شخص ہیں...... پھر میرے ذہن میں اس ملاقات کے مناظر گھومنے لگے جو کل میرے اور امریتا کے درمیان ہوئی تھی۔ بے شک امریتا رنجور اور دل گرفتہ نظر آتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر آہیں اور آنکھوں میں ارباز سے ہمیشہ کیلئے بچھڑنے کا غم تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی کیفیت میں شدت نہیں تھی جس کی میں توقع کر رہا

تھا۔ وہ مجھ سے مشورہ کرنے یا کوئی راستہ ڈھونڈنے کیلئے نہیں آئی تھی۔ وہ مجھے اپنی پسپائی کی اطلاع دینے آئی تھی اور یہ بتانے آئی تھی کہ اس کی طرح ارباز کو بھی حالات کے فیصلے کو تقدیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے۔ اب امریتا کے باؤ جی مجھے بتا رہے تھے کہ امریتا نے کبھی بھی ٹھونک بجا کر ان سے ارباز کے بارے میں بات نہیں کی ہے۔ نہ ہی پرسوں ہونے والی شادی کے حوالے سے اس نے کوئی ٹھوس احتجاج کیا ہے۔

پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس معاملے میں کوئی خلا موجود ہے۔ جذبے میں وہ شدت نہیں ہے جو دیواروں میں در بناتی ہے اور انہونیوں کو ہونیوں میں بدلتی ہے۔ کچھ کمی ہے اس معاملے میں۔ میں تقریباً گھنٹہ بھر باؤ جی کے ساتھ رہا۔ انہوں نے مجھے چائے پلوائی اور میری جذباتی کیفیت کے باوجود مجھ سے نرمی سے بات کرتے رہے۔ انہیں اس بات پر بھی بے حد افسوس تھا کہ لڑائی جھگڑے کے سبب ہمیں حوالات جانا پڑا اور پھر سفری کاغذات میں گڑبڑ ہونے کے سبب ہماری مشکلات میں اضافہ ہوا۔

انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ پرتاپ سنگھ سے کہہ کر لڑائی جھگڑے والے کیس میں راضی نامہ کرا دیں گے۔ ان کی باتوں سے یہ خواہش صاف جھلکتی تھی کہ ہم دونوں اس گورکھ دھندے سے نکل کر جلد از جلد بخیریت پاکستان واپس پہنچ جائیں۔ انہوں نے بڑے نرم لفظوں میں مجھے یہ تنبیہہ بھی کی کہ ہم اپنی اور ان کی عزت کا خیال کریں ورنہ پردیس میں ہماری مشکلات ایکدم بہت بڑھ جائیں گی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں باؤ جی! جو باتیں میں کہہ رہا ہوں، انہیں کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن شاید یہ آپ سے پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد آپ سے ہم کلام ہونے کا کبھی موقع نہ ملے......''

''دیکھو! میں نے تم پر کوئی روک نہیں لگائی، تم جو کہنا چاہو کہہ سکتے ہو۔'' وہ ہولے سے بولے۔

''باؤ جی! ظاہر ہے کہ آپ نے اپنی بیٹی کیلئے جو بر ڈھونڈا ہے، وہ سوچ سمجھ کر ہی ڈھونڈا ہوگا۔ لیکن...... مجھے ایک ایسی اطلاع ملی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ......'' میں کوشش کے باوجود بات مکمل نہ کر سکا۔

وہ چند لمحے انتظار کرتے رہے پھر بولے۔ ''تم نے جو کہنا ہے کہہ دو، میں برا نہیں

مانوں گا۔''

میں نے حوصلہ کرتے ہوئے وہ بات کہہ دی جو پرسوں شانتی نے بڑے اخلاص کے ساتھ میرے گوش گزار کی تھی۔ بہرحال باؤ جی کو یہ بات بتاتے ہوئے میں نے اس میں شانتی کا نام نہیں آنے دیا۔ جب میں نے یہ فقرہ کہا کہ......راکیش کے کردار کے بارے میں کچھ سوالات ہیں......تو میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ باؤ جی کے شفاف چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا ہے۔ مجھے لگا کہ میرے فقرے نے باؤ جی کے دل کی گہرائی میں موجود کسی اندیشے کو ابھارا ہے۔ لیکن یہ صورتحال بس ایک یا دو سیکنڈ کیلئے رہی۔ پھر انہوں نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ گہری سانس لے کر بولے۔ ''تمہاری ہمدردی کا شکریہ، تم نے کچھ اور کہنا ہے یا اب مجھے آگیا (اجازت) ہے۔''

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے باؤ جی! یقیناً میری کچھ باتیں آپ کو بری لگی ہوں گی۔ ان کیلئے معافی چاہتا ہوں۔''

اس کے بعد میں امریتا کے ''نرم خو باؤ جی'' سے رخصت ہو کر واپس چلا آیا۔ میں عجیب کیفیت کا شکار تھا۔ پرسوں امریتا کی شادی تھی۔ ارباز حوالات میں بند تھا اور اس کہانی کا ایک نیا رخ میرے سامنے آ رہا تھا۔ نیا اور کافی حد تک غیر متوقع۔ یوں لگ رہا تھا کہ ارباز نے امریتا سے یکطرفہ محبت کی ہے۔ کم از کم یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ اس محبت میں دونوں طرف یکساں شدت نہیں تھی۔ امریتا نے صورتحال کو بڑی آسانی سے قابو کر لیا تھا اور ''محبت'' کی بساط لپیٹ کر پیا دیس سدھار رہی تھی۔ وہ تڑپی مچلی ضرور تھی لیکن یہ ''تڑپ'' اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ حالات میں کوئی رخنہ پیدا کر سکے۔ دل پر عجیب سا بوجھ تھا۔ اور یہ بوجھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وشوا ناتھ ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا میں سوچتا رہا اور اپنی بے بسی کا ماتم کرتا رہا۔

اگلے روز سویرے میں نے ایک قریبی پبلک کال آفس سے پھر امریتا سے ٹیلیفونک رابطے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں نے قطر میں اپنے ایک کزن یوسف سے رابطہ کیا اور اس سے لاہور میں اپنے اہل خانہ کی خیر خیریت دریافت کی۔ میرے اس یوسف نامی کزن نے میرا پہلا پیغام میرے گھر والوں تک پہنچا دیا تھا۔ اس پیغام میں، میں نے کہا تھا کہ میں اور ارباز انڈیا میں اپنا Stay بڑھوانے میں

کامیاب ہوگئے ہیں اور ہم ابھی دو تین ہفتے مزید یہاں رہیں گے۔

کال آفس سے میں ہوٹل واپس پہنچا تو انکل نریندر پہلے سے آئے بیٹھے تھے۔ وہ حوالات سے ہوکر آئے تھے۔ انہیں ارباز سے ایک دو کاغذات پر دستخط کروانا تھے۔ انہوں نے مجھے صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔''سوموار کو ارباز کی پھر پیشی ہے لیکن بیل کی امید اب بھی نہیں ہے۔ شاید اسے جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔''میری آنکھوں میں نمی آگئی۔

میں نے کہا۔''انکل' کل شام کو امریتا کی شادی ہے' میری تو ہمت نہیں ہو رہی کہ ارباز کے سامنے جاؤں اور اسے یہ بتاؤں۔''

وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔''تمہارا یہ کام میں نے کر دیا ہے۔ میں نے مناسب لفظوں میں اسے یہ بات بتا دی ہے۔''

''پھر کیا کہا اس نے؟''

''صدمہ تو اسے ہونا ہی تھا۔ آج بھی ہونا تھا' کل بھی ہونا تھا۔ رو پڑا تھا۔ میں کافی دیر اسے تسلی تشفی دیتا رہا ہوں۔ ہو سکے تو تم بھی آج اس سے مل لو۔ میں انسپکٹر گروجیت سے بات کر آیا ہوں۔ بے شک ایک دو گھنٹے اس کے پاس رہنا۔ اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرنا۔ پھر وہ ذرا توقف سے بولے۔''واہگرو تکلیف دیتا ہے تو اسے سہنے کی شکتی بھی دیتا ہے۔ رب نے چاہا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ دو چار دن میں وہ خود کو سنبھال لے گا۔''

''انکل! کیا اس کے باہر آنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ میرے دل میں ہمیشہ یہ دکھ رہے گا کہ جب امریتا کی شادی ہو رہی تھی تو ارباز حوالات میں تھا اور میں اس کیلئے کچھ نہیں کر سکا تھا۔''

''پتر جی! ہر کام میں واہگرو کی کوئی حکمت ہی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ارباز باہر ہوتا تو حالات اس کیلئے کچھ اور خراب ہو جاتے۔ یہ بات تو بالکل سامنے کی ہے کہ یہ شادی اب ٹلنے والی نہیں ہے۔ اب تو ہمارا سارا دھیان اس بات پر ہونا چاہئے کہ ہم کس طرح جلد از جلد ارباز کو قانونی چکروں سے بچا سکتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ دو تین مہینے سے پولیس رپورٹ کے بارے میں بہت سختی شروع ہو چکی ہے۔ سخت قانون کی وجہ سے

کوئی چھوٹا بڑا افسر بات سننے کو تیار نہیں ہے۔ میں اور روہیل پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن ایک دو ہفتے میں کوئی راستہ نکلتا دکھائی نہیں دیتا۔ کل بھی میں پولیس ہیڈ کوارٹر گیا ہوا تھا لیکن پتہ چلا کہ متعلق ریکارڈ کیپر چار دن کی چھٹی پر ہے......''

انکل نریندر ڈیڑھ دو گھنٹے میرے ساتھ رہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ انہوں نے زبردستی کچھ مزید روپے میرے ہاتھ میں تھمائے اور ضروری ہدایات دیکر واپس چلے گئے۔

انکل نریندر! مجھ سے کہہ گئے تھے کہ میں تھانے جاکر ارباز سے ضرور مل لوں۔ لیکن میری ہمت نہیں ہوئی۔ کوشش کے باوجود میں اس کے پاس نہ جا سکا۔ اسے بتانے کیلئے میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ مایوسی بڑھانے کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا۔

اگلا دن امریتا کی شادی کا دن تھا۔ ایک نادیدہ بوجھ نے صبح سے میرے سینے کو پیسنا شروع کر دیا تھا۔ کتنی جلدی شروع ہوکر کتنی جلدی ختم ہوئی تھی یہ پریم کہانی۔ ابھی چند دن پہلے ہم کرکٹ شائقین کی ایک جماعت کے ساتھ جالندھر میں اترے تھے۔ امریتا سے ملے تھے۔ اس شہر کے باغوں اور تفریح گاہوں میں گھومے تھے اور اب سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔

سہ پہر تک تو میں خود پر جبر کرتا رہا لیکن پھر مزید برداشت کرنے کا چارہ مجھ میں نہ رہا۔ میں ایک سائیکل رکشا پر سوار ہوا اور ارباز کے پاس پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ ارباز کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر رو پڑا۔ میں نے سلاخوں کے اندر سے اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لئے اور دیر تک تھامے رہا۔ میری اپنی آنکھیں بھی لبریز تھیں۔ ہمارا دوست ''مرکیوں والا کانسٹیبل'' ایک طرف سٹول پر خاموش بیٹھا تھا۔ سگریٹ پھونک رہا تھا اور ہمدرد نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

''واقعی آج اس کی شادی ہے؟'' ارباز نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے نظر ملائے بغیر کہا۔

''تمہاری اس سے بات ہوئی؟''

''تین دن پہلے ہوئی تھی۔''

''کیا کہا اس نے۔'' ارباز نے بڑے درد سے پوچھا۔

میں نے اس ملاقات کا سارا احوال اسے بتا دیا...... لیکن جذبے کی اس کمی کا ذکر نہیں کیا جو میں نے اس دن شدت سے محسوس کی تھی۔ میں نے اسے باؤجی سے ملاقات کے بارے میں بھی بتایا اور اس "البم" کا ذکر بھی کیا جو برقعہ پوش امریتا نے ماضی کی یادوں میں لپیٹ کر مجھے واپس کی تھی۔

ارباز سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے توانا ہاتھ بڑی مضبوطی سے آہنی سلاخوں پر جمے رہے۔ جیسے وہ ان سلاخوں کو "چوکھٹ" میں سے اکھاڑ دینا چاہتا ہو' جیسے وہ اپنے قفس کی تتلیاں بکھیر کر امریتا کے گجرال نگر کی طرف نکل جانا چاہتا ہو۔

لیکن سلاخیں اتنی آسانی سے نہیں اکھڑا کرتیں۔ نہ ہی قفس کی تتلیاں بکھرا کرتی ہیں۔ اس رات جالندھر کی خوش رنگ امریتا کی شادی سنگاپور کے راکیش کے ساتھ ہوگئی۔ دونوں پتی پتنی بن گئے۔ میں نے وشوا ناتھ ہوٹل کی کھڑکی میں سے دیکھا مشرقی پنجاب کا قدیم ترین شہر جالندھر اپنی تمام روشنیوں' رنگوں اور خوشبوؤں کے باوجود اداس تھا۔ سوگوار تھا۔



سوموار کے روز کورٹ میں ارباز کی پیشی نہیں ہوسکی۔ سات روز بعد کی تاریخ پڑی۔ لیکن اس سے پہلے ہی ایک غیر متوقع بات ہوگئی۔ ارباز کی ڈپلی کیٹ پولیس رپورٹ بن گئی۔ یہ خوشخبری انکل نریندر نے مجھے ٹیلیفون پر سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ ریکارڈ کی تفصیلی چیکنگ میں رجسٹر پر ارباز کا اندراج مل گیا ہے۔ عجیب انہونی ہوئی تھی۔ نریندر صاحب اور وکیل روہیل صاحب نے بتایا کہ انہوں نے دفتر میں جا کر خود مطلوبہ رجسٹر دو مرتبہ چیک کیا تھا۔ میرا نام موجود تھا۔ لیکن ارباز کی انٹری نظر نہیں آتی تھی۔ دراصل رجسٹر کے درجنوں صفحات پر اندراجات موجود تھے۔ رجسٹر کے آخری صفحے پر بالکل آخری انٹری ارباز کی تھی' جب درجنوں صفحات چیک کر لئے جاتے ہیں تو آخری صفحے تک پہنچتے پہنچتے مایوسی غالب آ جاتی ہے اور اگر آخری صفحے پر اندراج بھی آخری ہو تو وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی دیکھنے والا نفسیاتی طور پر ناکامی تسلیم کر لیتا ہے۔ نریندر اور روہیل صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ بہرطور اب پولیس رپورٹ کی نقل بن گئی تھی اور اس بات کی امید پیدا ہوگئی تھی کہ ضمانت ہو جائے گی۔ اور عین ممکن تھا کہ یہ کیس ہی خارج ہو جاتا۔ اگر پرتاپ سنگھ وغیرہ کے ساتھ صلح نامہ بھی ہو جاتا تو پھر ہمارے پاکستان لوٹنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ میں نے فوراً جا کر ارباز کو یہ اچھی خبر سنائی۔ کئی دنوں بعد اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں مجھے روشنی کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔

بعد کے واقعات کو تفصیل سے بیان کروں گا تو یہ روداد طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ پولیس رپورٹ تیار ہونے کے بعد سارے معاملات دو چار دن کے اندر ہی سیدھے ہوگئے۔ وکیل روہیل صاحب کی معاونت سے انکل نریندر نے بھرپور کردار ادا کیا۔ اپنے

تعلقات اور اپنے بڑے بھائی کی پوزیشن کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے ساری رکاوٹیں تیزی سے دور کر دیں۔ باؤ جی کی کوشش سے پرتاپ سنگھ اور راج سنگھ کے ساتھ بھی باعزت راضی نامہ ہوگیا تھا۔ ہمارا خالی کمرا اور ہماری تلاشی میں پولیس کے پاس جانے والا دیگر سامان بھی واپس مل گیا۔ بہرحال باؤ جی سے پھر دوبارہ میری ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ ہی ارباز ان سے مل سکا۔ تاہم اتنا پتہ ہمیں چل گیا تھا کہ باؤ جی کی سندر بیٹی امریتا' شادی کے بعد تین چار روز جالندھر میں رہی تھی۔ پھر اپنے پتی دیو کے ساتھ سنگاپور سدھار گئی تھی......

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔ اکتوبر کی ایک لہو رنگ شام دھیرے دھیرے قرب و جوار کو ڈھانپ رہی تھی۔ میں اور ارباز اپنے مختصر سامان کے ساتھ واہگہ بارڈر پر موجود تھے۔ آج کوئی قلی ہمارا سامان جھپٹنے کیلئے موجود نہیں تھا۔ نہ ہی منی چینجرز "بنیا پن" کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہم کسٹم اور امیگریشن وغیرہ کے مراحل سے گزر کر پاکستانی سرزمین پر داخل ہوئے تو ایک عجیب سا "احساس تحفظ" اور اطمینان دل و دماغ میں روشنی کی طرح بھر گیا...... یہ بات سمجھ آئی کہ بعض لوگ دیار غیر سے لوٹنے کے بعد مادر وطن پر ماتھا کیوں رکھتے ہیں۔ اس کی مٹی کو آنکھوں سے کیوں لگاتے ہیں۔ کرکٹ میچ کی دید سے شروع ہونے والا سفر ایک "شادی" پر انجام پذیر ہوا تھا۔ اور اس شادی کے ساتھ ہماری کچھ تلخ یادیں ہمیشہ کیلئے وابستہ ہوگئی تھیں۔

لیکن کیا کہانیاں شادی پر ختم ہوجاتی ہیں؟ اکثر کہانیاں شادی پر ختم ہوجاتی ہیں مگر کئی کہانیاں نہیں ہوتیں۔ یہ کہانی بھی دوسری قسم کی تھی۔ کچھ سوالات تھے جو میرے ذہن میں موجود تھے اور یہ سوالات اس کہانی کو آگے چلاتے تھے۔

امریتا! ارباز سے جدا ہوگئی تھی...... اور مجھ سے بھی ہوگئی تھی۔ وہ ارباز ہی کی نہیں میری امریتا بھی تو تھی۔ بلکہ پہلے وہ میری امریتا تھی۔ ارباز کی بعد میں بنی تھی...... ہاں میری امریتا جو خطوں کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی اور لفظوں کی صورت آنکھوں میں سما گئی تھی۔

اس الجھن کو سلجھانے کیلئے ہمیں تھوڑا سا پیچھے جانا پڑے گا۔ تقریباً ڈیڑھ برس پیچھے ہمیں اپریل 1982ء کی اس ترنگ آمیز شام کو چھونا پڑے گا۔ جب ہر طرف بہار کے

رنگ بھرے تھے۔ پھولوں پر تتلیاں منڈلاتی تھیں اور باغوں میں خوشبو کے ڈیرے تھے۔ میں گھر کی چھت پر بیٹھا تھا۔ شعر و شاعری کا موڈ سوار ہو رہا تھا۔ میرے پاس کئی سال پرانی ایک ڈائری تھی۔ اسکول کے زمانے سے شعر موزوں کر کے اس پر لکھتا رہتا تھا۔ آج بھی بہار پر ایک نظم کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک نگاہ سامنے میز پر پھڑپھڑاتے ہوئے ایک انگریزی میگزین پر پڑی۔ یہ کٹا پھٹا میگزین غالباً ردی کاغذوں سے برآمد ہوا تھا۔ اس پر ایک سال پرانی تاریخ تھی۔ لیکن یونہی ورق گردانی کرنے لگا۔ خلیج سے شائع ہونے والے اس انگریزی ماہنامے میں زیادہ تر نوجوانوں کی دلچسپی کا ساماں تھا۔ فلم' ٹی وی' اسپورٹس اور فکشن کے صفحات تھے۔ اس کے علاوہ چھ سات صفحات کا ایک پورشن قلمی دوستی کے حوالے سے تھا۔ اس میں مختلف ممالک کے بہت سے لڑکے لڑکیوں کے ایڈریس اور کوائف موجود تھے۔ کچھ کوائف کے ساتھ فوٹوگراف بھی تھے۔ قلمی دوستی کے خواہش مند نوجوانوں نے اپنی دلچسپیاں بیان کی تھیں۔ اور اس حوالے سے چھوٹے چھوٹے فقرات' اقتباسات اور شعر وغیرہ بھی لکھے تھے۔ میری نگاہ امریتا نامی انڈین لڑکی کے کوائف پر پڑی۔ اکثر لڑکیوں کی طرح امریتا نے بھی تصویر نہیں دی تھی۔ اس کے علاوہ شرط تھی کہ دوستی کیلئے صرف لڑکیاں ہی رجوع کریں۔ امریتا نے اپنے کوائف کے ساتھ ایک دو خوبصورت فقرے لکھے تھے اور اردو کا ایک اقتباس نقل کیا تھا۔ "میں نے شاعروں' مصوروں اور دانشوروں سے پیار کی حقیقت پوچھی۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز میں پیار کی بہت سی تعریفیں کیں' انہوں نے مجھے اور الجھا دیا۔ پھر میں نے ایک چاندنی رات میں ایک پھول سے پوچھا۔ "پیار کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"اے نادان لڑکی! پیار بس پیار ہے۔ اس کا کوئی نام نہیں۔ تم بھی اسے کوئی نام نہ دو۔ بس اسے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرو۔ دیکھو! چاند سے جو نور کی کرن زمین تک آ رہی ہے وہ پیار ہے اور میری پتی پر شبنم کا جو موتی ٹھہرا ہوا ہے' وہ پیار ہے۔" پتہ نہیں یہ بہار کا اثر تھا۔ ماحول کا تھا یا پھر میرے اندرونی موسم کا۔ مجھے امریتا کے الفاظ اور اقتباس کا "انتخاب" بہت اچھا لگا۔ سیدھا میرے دل میں اتر گیا۔ نجانے کیا ترنگ تھی کہ وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے امریتا کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ پہلے چند فقرے انگریزی میں لکھے لیکن پھر انہیں ردی کی ٹوکری میں پھینک کر اردو میں لکھنا شروع کر

دیا۔

‘‘آپ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیسی ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ کچھ معلوم نہیں اور شاید کبھی معلوم ہو بھی نہ سکے گا۔ لیکن آج لاہور کی اس خوش رنگ شام میں' ایک گھر کی چھت پر' اپنے لفظوں میں سما کر آپ مجھ سے ملی ہیں۔ میں نے آپ کو محسوس کیا ہے۔ یہ کاغذ پر کھلے ہوئے لفظ بھی کیا چیز ہوتے ہیں امریتا...... کہنے کو ساکت و جامد ہوتے ہیں لیکن ان میں دنیا جہان کے رنگ' ذائقے' لمس اور جذبے حرکت کرتے ہیں۔ یہ سوچوں اور مزاجوں کا آئینہ بن کر انجانے لوگوں کو ایک دوسرے سے یوں منسلک کر دیتے ہیں جیسے وہ زمانوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ آج اس پر بہار شام میں جو لڑکی اپنے لفظوں کے ذریعے مجھ سے ملی وہ یکسر انجان ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ میں اسے بہت پہلے سے جانتا ہوں۔’’

میں نے ایک بار لکھنا شروع کیا تو پھر لکھتا چلا گیا۔ میں نے کاپی سائز کے تین صفحے بھر دیئے۔ شاید یہ خط کئی دن ایسے ہی پڑا رہتا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پڑے پڑے بیکار ہو جاتا۔ اسے پوسٹ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ لیکن اگلے روز مجھے اتفاقاً پوسٹ آفس جانا پڑا۔ موٹر سائیکل کا لائسنس ‘‘ری نیو’’ کروانا تھا۔ میں پوسٹ آفس گیا تو ساتھ ہی امریتا والا خط بھی پوسٹ کر آیا۔

مجھے اس بات کی امید دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں تھی کہ جواب آئے گا۔ ایک تو میں نے جس رسالے سے ایڈریس دیکھا تھا وہ سال سے زیادہ پرانا تھا۔ دوسرے یہ کہ کوائف کے ساتھ ‘‘صرف لڑکیوں’’ والی شرط درج تھی۔ تیسرے کچھ پتہ نہیں تھا کہ خط بحفاظت سرحد پار کر کے انڈیا میں ‘‘لینڈ’’ کر پائے گا یا نہیں۔ لہٰذا جب بیس بائیس روز بعد جواب آیا تو مجھے خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے احتیاط کے طور پر اپنے ایڈریس میں اپنے بجائے ارباز کا نام لکھا تھا۔ دراصل میرے نام کے خطوط عموماً بڑے بھائی شرارت سے کھول لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ارباز کے خط بھی میرے ایڈریس پر آ جاتے تھے۔ انہیں اس طرح کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا۔ خط پر ارباز کا نام اور لفافے کی ساخت وغیرہ دیکھتے ہی میں جان گیا کہ یہ انڈیا سے آیا ہے۔

میں نے خط کھولا۔ امریتا کور نے اردو کی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا

تھا۔ ‘‘ارباز صاحب! ست سری اکال' اسلام وعلیکم' پاکستان کے شہر لاہور سے آپ کا پتر ملا۔ شاید آپ نے ٹھیک لکھا ہے۔ کاغذ پر اتارے جانے والے لفظ درپن ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں بہت کچھ دکھا دیتے ہیں اور صرف دکھاتے ہی نہیں' سناتے اور محسوس بھی کراتے ہیں۔ تحریر کی شکتی نے دنیا بدلی ہے۔ کہیں تخت و تاج گرائے ہیں اور کہیں ریگزاروں میں پریم کے گلستان کھلائے ہیں۔ اس شکتی کے سبب خون کے رشتے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں اور بدترین دشمن ایک دوسرے کیلئے پران دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جی ہاں آپ نے ٹھیک لکھا ہے۔

ارباز صاحب! میگزین میں میرے کوائف ایک سال پہلے شائع ہوئے تھے۔ کئی پتر مجھے آئے۔ ان میں سے فقط دو لڑکیوں کے ساتھ میری دوستی آگے بڑھی تھی۔ ایک انڈیا کی تھی' دوسری ابوظہبی کی۔ ابوظہبی والی سے اب بھی خط و کتابت ہوتی ہے۔ لیکن انڈیا والی سے ختم ہو گئی ہے...... کیونکہ وہ لڑکی نہیں لڑکا تھا۔ ایسی چکر بازیاں ‘‘پین فرینڈ شپ’’ میں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ آپ کا پتر ملنے سے پہلے میں نے ہرگز یہ نہیں سوچا تھا کہ کسی ‘‘میل’’ کو جواب دوں گی۔ مگر پھر وہی لفظوں کی شکتی والی بات کہوں گی۔ آپ کے لفظوں نے مجھے متاثر کیا۔ مجھے ان میں ایک ہم ذوق شخص کے اخلاص کی خوشبو آئی اور میں جواب لکھنے بیٹھ گئی۔

امریتا کا خوبصورت خط بھی تین صفحات پر مشتمل تھا۔ اس نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں سلجھی ہوئی باتیں لکھی تھیں اور ایک دو جگہ اپنے خوبصورت شعری ذوق کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ آخر میں اس نے لکھا تھا۔

من کی آگ میں جلتے ہیں' اور انگاروں پہ چلتے ہیں
اجڑے اجڑے شہروں کو جو لوگ بسانے آتے ہیں

اس خط کے بعد خطوط کا سلسلہ چل نکلا۔ میں بڑے شوق سے امریتا کو خط لکھتا اور پھر شوق سے ہی اس کے جواب کا انتظار کرتا۔ شعر و شاعری کا شوق بتدریج خط لکھنے کی طرف منتقل ہو گیا۔ ایم اے کے بعد میں نے ادب اور شاعری کا مطالعہ تسلسل سے کیا تھا۔ اس مطالعے کے سبب میری ‘‘تحریر’’ میں بھی نکھار آیا تھا۔ امریتا کو خط لکھتے ہوئے مجھے لطف محسوس ہوتا اور اس کا جواب بھی مجھے لطف اندوز کرتا۔ وہ اچھے ذوق کی مالک

تھی۔ انڈیا کے علاوہ پاکستان کی شاعری بھی گاہے بگاہے اس کی نظر سے گزرتی تھی۔ جوان نسل کے پسندیدہ پاکستانی شاعر احمد ندیم قاسمی' احمد فراز اور امجد اسلام امجد وغیرہ کو اس نے پڑھا تھا۔ میں اسے خط لکھتے ہوئے خاصا محتاط رہتا تھا۔ اس نے اپنے ایک خط میں مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے والد' جنہیں وہ باؤ جی کہتی ہے سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس نے یہ خطوں والا معاملہ بھی ان سے چھپایا نہیں ہے۔ اکثر خط وہ انہیں دکھا دیتی ہے اور وہ بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

میرے اور امریتا کے درمیان خط وکتابت کا یہ سلسلہ تقریباً چھ سات ماہ جاری رہا۔ دھیرے دھیرے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اس ان دیکھی لڑکی کا عادی ہوتا جارہا ہوں۔ جیسے ایک نامعلوم سا بندھن دھیرے دھیرے مجھ پر اپنی گرفت قائم کر رہا ہے۔ جب اس کا خط نہیں آتا تھا تو اپنے اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔ اور جب خط آجاتا تھا تو اپنا آپ اور اپنے اردگرد کی ہر شے مکمل لگنے لگتی تھی۔

پھر ایک دن امریتا نے مجھے لکھا: اَرباز! ایک اچھی خبر ہے۔ ننکانہ صاحب میں میرے ایک ماماں جی رہتے ہیں۔ ان کی بیٹی کی شادی ہے۔ باؤ جی اس شادی میں شریک ہونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اگر پروگرام فائنل ہوگیا اور ویزہ لگ گیا تو ہوسکتا ہے کہ اگلے مہینے کے آخر تک ہم پاکستان آئیں۔ سنا ہے کہ لاہور' ننکانہ صاحب سے زیادہ دور نہیں ہے۔ کیا پتہ تم یہ تھوڑا سا فاصلہ پاٹنے کی ہمت کر ہی ڈالو۔ وہ کیا شعر ہے

رہِ وفا میں میری جاں بڑے جھمیلے ہیں
ہزار کوس کی منزل ہے ہم اکیلے ہیں

لاہور سے ننکانہ صاحب ہزار کوس کی منزل نہیں ہے' اور نہ ہی اس میں زیادہ جھمیلے ہوں گے۔

مذکورہ خط پڑھ کر مجھے جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک سہانا سپنا دیکھتے ہوئے اچانک جاگ گیا ہوں۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ میں کیا کر رہا تھا؟ ایسا تو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ نہ میں ایسا کرسکتا تھا؟ میرا رشتہ بچپن سے ہی میری خالہ زاد ارسہ سے طے ہو چکا تھا۔ میری ماں' ارسہ پر جان چھڑکتی تھی۔ رات دن اسے اپنے گھر میں لانے کے سپنے دیکھ رہی تھی اور یہ سپنے دیکھتے ہوئے اسے تقریباً سولہ برس ہوگئے تھے۔ وہ راتوں کو

نیند میں بڑبڑاتی تھی تو بھی اس کے ہونٹوں پر بہو کی حیثیت سے ارسہ کا نام ہی آتا تھا۔ ارسہ روٹی پکا لو' ارسہ بارش آرہی ہے' الگنی سے کپڑے اتار لو' ارسہ دائم آیا ہے دروازہ کھولو۔ چھ سات سال پہلے ایک موقع پر والد صاحب نے اس رشتے کے حوالے سے معمولی سی مخالفانہ بات کہہ دی تھی۔ والدہ بستر سے لگ گئی تھیں۔ بعدازاں والد صاحب کو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا پڑی تھی ...... اور ارسہ میرے لئے بھی غیر اہم نہیں تھی۔ میں اس کی سالگرہ یاد رکھتا تھا۔ تہواروں پر اسے چھوٹا موٹا تحفہ بھی بھیجتا تھا۔ میں ذہنی طور پر اسے تسلیم کر چکا تھا کہ وہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اور مجھے امید تھی کہ وہ میری زندگی میں آئے گی تو زندگی پہلے سے بہتر محسوس ہونے لگے گی۔

اور اب...... یہ نیا سلسلہ درمیان میں آرہا تھا۔ ابھی تو ابتداء تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اگر صورتحال برقرار رہی تو کیا معاملات میرے بس سے باہر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ کوئی ایسا سفر شروع ہوجائے گا جس میں رکنا یا واپسی کا سوچنا بہت مشکل ہوگا۔ ابھی تو کچھ نہیں بگڑا تھا ایک معمولی سی غیر اہم سی کسک تھی۔ ایک دلیرانہ کوشش سے اس کسک کو' دل و دماغ سے جھٹکا جاسکتا تھا...... اور پھر میں نے اس کسک کو جھٹک دیا۔ انہی دنوں ارسہ کچھ دنوں کیلئے ہمارے ہاں رہنے آگئی۔ چھٹیوں کی وجہ سے میری بہن اور دو چار کزن بھی آدھمکے' خوب ہلا گلا شروع ہوگیا۔ انہی دنوں وی سی آر نیا نیا متعارف ہوا تھا۔ وی سی آر کی وجہ سے یہ ہنگامہ اور بھی پرشور ہوگیا۔ میں نے خود کو اس ہنگامے میں گم کر دیا۔



پھر ایک روز ارباز سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ تنہائی اور بوریت کا شکار تھا۔ والدین اس کیلئے مناسب رشتہ ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن کہیں بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ یعنی شادی تو دور رہی ابھی منگنی بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں رات دس بجے کے قریب اس کے گھر گیا تو وہ اپنے کمرے میں ٹیلیفون پر ''وقت گزاری'' کر رہا تھا۔ کسی خوبصورت آواز کی تلاش میں سوڈیڑھ سو روپے کے رانگ نمبر وہ ملا چکا تھا اور ابھی مزید ملانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ ''اوئے باندر! تھوک سے پکوڑے تلنا چھوڑ...... چل آ میں تجھے ایک کام کی بات بتاؤں۔

''کیا بکواس ہے؟''

''بکواس نہیں لڑکی ہے۔ اس سے گل بات شروع کر۔ تیرا دل بھی لگا رہے گا اور کیا پتہ بات آگے تک پہنچ جائے۔''

''کون سی لڑکی؟ کہیں وہی تو نہیں جالندھر والی؟''

''ہاں وہی ہے۔''

''اپنا جوٹھا مجھے کھلا رہے ہو۔''

''بکواس بند کر۔ جوٹھا کیسے ہو گیا۔ میں اس سے ملا نہیں۔ اسے دیکھا نہیں۔ اس سے بات نہیں کی اور تو اور وہ میرا نام نہیں جانتی۔ تجھے پتہ ہی ہے باندر! اسے خط بھی تیرے نام سے ہی لکھے ہیں اور خط بھی کیا لکھے ہیں بس شاعری کے نٹ بولٹ ہی کستا رہا ہوں۔ بہت ہوئے تو آٹھ دس خط لکھے ہوں گے اب تک۔ اب اس سے آگے تو لکھنا شروع کر دے۔ نام تو پہلے ہی تیرا چل رہا ہے اب کام بھی تیرا چلے گا۔''

''یار! یہ کس جنجال میں ڈال رہے ہو مجھے' مجھ سے نہیں ہو گا یہ سب کچھ۔''

''اوئے کر کے تو دیکھ' ٹیلیفون پر بھونڈی کرنے سے ہزار درجے بہتر ہے یہ۔'' میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بحث ہوئی۔ آخر وہ بولا۔ ''چل تیری اور ارسہ کی خاطر یہ بور اور بے فائدہ کام میں سنبھال لیتا ہوں۔ مگر اس میں مسئلہ بھی تو ہو گا۔''

''کیا مسئلہ؟''

''گھامڑ' میں اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھوں گا۔''

''یار! تھوڑی سی کوشش کرنا ہینڈ رائٹنگ کی نقل بھی ہو جائے گی۔ وہ کون سی خط شناسی کی ماہر ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں یہ ٹھیک نہیں' اس نے سر ہلایا۔ کم از کم پہلے تین چار خط تو تمہاری ہینڈ رائٹنگ میں ہی ہونے چاہئیں۔ اس دوران میں' میں تحریر اور ہینڈ رائٹنگ کی نقل کی کوشش کروں گا۔''

''نہیں یار! اب مجھے اس کام میں مت گھسیٹو۔ میں نے اب کچھ لکھنا وکھنا نہیں ہے۔ ویسے بھی پیپرز کی تیاری کرنی ہے مجھے۔''

''اوئے گھوڑے۔ لکھنے کو کون کہہ رہا ہے تجھے؟ لکھ میں لیا کروں گا۔ تو بس اپنے انداز میں اسے ری رائٹ کر دینا۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر تو چاہتا ہے کہ میں اس جھمیلے میں پڑوں تو پھر پہلے کچھ خط تو تجھے ری رائٹ کرنا پڑیں گے۔''

اس نے مجھے منا ہی لیا۔

امریتا اور اصلی ارباز کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے پہلے تین خط میں نے ری رائٹ کیے۔ ارباز کی تحریر میں کہیں املا' کہیں گرامر اور کہیں مضمون کی غلطیاں تھیں۔ وہ میرے انداز میں لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اکثر چوک جاتا تھا۔ مجھے تصحیح کرنا لکھنے سے زیادہ دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

امریتا کے ننکانہ صاحب آنے والی بات بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ارباز نے خاصا بولڈ انداز اختیار کیا تھا اور ایک خط میں صاف لکھ دیا تھا کہ جب وہ ننکانہ کے تفریحی

پارک میں اپنے اور امریتا کی ملاقات کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے دل کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگتی ہیں۔ اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بات پین فرینڈ شپ سے آگے بھی کچھ ہے۔

مجھے اندیشہ تھا کہ امریتا اس بات کا برا منا جائے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر اتفاقاً یوں ہوا کہ امریتا اور اس کے باؤ جی کا پاکستان آنے کا پروگرام کینسل ہو گیا۔ اس کا ویزہ بروقت نہیں لگ سکا تھا۔ اس اطلاع کو بمشکل بیس پچیس روز گزرے تھے کہ ایک دن ارباز تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے پاس آیا۔ اس کے گلے کی رگیں جوش میں پھولی ہوئی تھیں۔

''کیا بات ہے ہیرو صاحب! آج باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔''

''اوئے لومڑ! آج تیری بھابی سے بات کر کے آ رہا ہوں۔''

''بھابی سے۔ گھاس تو نہیں چر گیا۔ وہ تو جالندھر میں بیٹھی ہے' تکیے سے ٹیک لگا کر۔''

جالندھر میں نہیں نیپال کے شہر ''ارنا پونا'' میں' ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے فون آیا ہے اس کا۔ تجھے پتہ ہی ہے۔ پچھلے سے پچھلے خط میں' میں نے اسے یونہی اپنا فون نمبر لکھ ڈالا تھا۔ بس وہ فون نمبر کام کر گیا۔ فون پر رابطہ ہونے کے بعد اس نے کافی دیر تک مجھے سسپنس میں رکھا۔ میرا نام تو اس نے پوچھ لیا تھا۔ اپنا نہیں بتا رہی تھی۔ پھر ایک دو حوالے دیئے اس نے۔ ایک شعر پڑھا۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے خوشی سے چیخ کر کہا ''تم امریتا ہو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔ آٹھ دس منٹ بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ باؤ جی کے ایک پرانے شاگرد نے انہیں اپنے خرچے پر یہاں بلایا ہے۔ باؤ جی کے ہاتھوں سے اپنے ایک اسکول کا افتتاح کرانا چاہتا ہے۔ وہ لوگ دو تین ہفتے یہاں رہیں گے اور سیر وغیرہ کریں گے۔''

اگلے دو ہفتوں میں ایک بار امریتا کا فون آیا اور دو مرتبہ ارباز نے اسے فون کیا۔ ارباز نے دل کھول کر باتیں کیں اور امریتا کو واضح الفاظ میں بتایا کہ وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے ملنا چاہتا ہے۔ وہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کے دل و دماغ پر سوار ہو رہی ہے۔ اس ٹیلیفونک گفتگو میں ارباز نے امریتا کو آمادہ کر لیا کہ وہ اسے اپنی تصویر

بھیجے گی۔ اپنی تصویر وہ اسے پہلے ہی ارسال کر چکا تھا۔

تقریباً تین ہفتے بعد امریتا اور باؤ جی نیپال سے انڈیا واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ارباز نے بڑی بے تابی سے امریتا کی تصویر کا انتظار شروع کیا۔ مگر تصویر نہیں آئی۔ امریتا شاید اس صورتحال سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک دن ارباز میرے پاس آیا۔ بڑا سٹپٹایا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ''یار اپنے اسٹائل میں ایک دھانسو قسم کا خط لکھ اسے۔ بس پڑھ کر تڑپ جائے اور پہلی فرصت میں تصویر روانہ کر دے۔''

''کیا اسے تڑپانے بھڑکانے کیلئے خط میں کوئی زہریلی چیز ڈال دوں۔''

''اوئے مرزا غالب کی دم۔ تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ اپنے لفظوں میں زہر بھی ڈال سکتا ہے اور شہد بھی۔ چل فٹافٹ لکھ دے ایک تھرتھلیاں ڈالنے والا خط.....''

آج کل اس نے خود خط لکھنے والا کام چھوڑا ہوا تھا۔ اس کے والد (انکل نفیس صاحب) الیکٹرانکس کے سامان کی ایک بڑی کھیپ لینے کیلئے تھائی لینڈ گئے ہوئے تھے۔ ارباز کو دکان اور فیکٹری پر زیادہ توجہ دینا پڑ رہی تھی۔ جو تھوڑا بہت ٹائم بچتا تھا۔ اس میں اسے باڈی بلڈنگ کیلئے ''جم'' بھی بہر صورت جانا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ یاروں دوستوں کی مصروفیات بھی تھیں۔ خط لکھوانے کیلئے وہ تھوڑا سا وقت نکال کر میرے پاس آجاتا۔ وہیں میرے پاس بیٹھ کر خط لکھواتا اور پھر جمائی لے کر کہتا۔ ''یار دادی! اس میں شاعری اور ادب شدب' اب اپنی طرف سے ڈال لو۔''

''اس روز دو اڑھائی صفحات کا خط میں نے پوری توجہ سے لکھا اور تصویر کیلئے ارباز کی ساری بے تابی اور جھنجھلاہٹ کو اچھے طریقے سے لفظوں میں سمونے کی کوشش کی' اس خط کا اختتام اس شعر پر ہوا۔

چلنے کا حوصلہ نہیں' رکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھے نڈھال کر دیا

خط ارسال کرنے کے چند دن بعد ہی انڈیا سے وہ اہم خط آ گیا تھا۔ جس میں امریتا نے ارباز کی ضد کے سامنے ہار مانتے ہوئے اپنی تصویر ارسال کی تھی۔ ارباز کیلئے وہ بے حد مسرت کا دن تھا۔ میں نے بھی تصویر دیکھی۔ ہماری رائے تھی کہ اگر یہ واقعی امریتا ہی کی تصویر ہے تو بہت اچھی ہے۔ اس تصویر میں جو چیز چہرے سے بھی پہلے نظر

آتی تھی وہ سادگی اور معصومیت تھی۔ نقوش متاثر کن اور تاثر میں بناوٹ نہیں تھی۔

اگلے تین چار ماہ میں ارباز اور امریتا کے رومانی تعلق نے کئی مدارج طے کئے۔ میں وقتاً فوقتاً ارباز کیلئے خط لکھتا رہا اور امریتا کی طرف سے آنے والے جوابات ارباز مجھے پڑھ کر سناتا رہا۔ وہ بڑی تیزی اور بڑی شدت سے امریتا کے خیالوں میں الجھتا جارہا تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش دن بدن شدت پکڑ رہی تھی کہ وہ کسی طرح انڈیا پہنچے اور اپنی جان جاں سے ملے۔ اس کے جذبے کی تیزی متاثر کن تھی۔ وہ محبت کی تلاطم خیز لہروں کے نرغے میں تھا۔ اسے ان لہروں میں' میں نے ہی دھکیلا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ ان لہروں کو چیر کر نکلے اور کسی طرح کنارے پر پہنچے۔ کنارہ دور تھا' لہریں ہی مخالف نہیں تھیں' راستے میں ایک کانٹے دار باڑ بھی تھی۔ مگر میرے دل سے آواز آیا کرتی تھی کہ اگر جذبے توانا اور ارادے مضبوط ہیں تو آگے بڑھنے کا راستہ نکلے گا۔

اور پھر ایک دن کیا ہوا تھا؟ ایک دن یہ ہوا تھا کہ ارباز تیزی سے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے اٹھا کر دو چار پھیریاں دی تھیں۔ اور یہ خوشخبری سنائی تھی کہ ہم کرکٹ میچ دیکھنے کیلئے جالندھر جارہے ہیں۔ جالندھر جہاں امریتا رہتی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات قارئین پڑھ ہی چکے ہیں۔ جالندھر میں خوش ادا امریتا سے ارباز کی ملاقات' ہماری سیر و سیاحت اور پھر نہایت سنگین مشکلات کا احوال میں قلمبند کر چکا ہوں۔ اور اب......اب ایک بار پھر ہم پاکستان میں تھے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اکثر کہانیاں شادی پر ختم ہوجاتی ہیں۔ لیکن کئی نہیں بھی ہوتیں اور امریتا کی کہانی دوسری قسم میں سے تھی۔ کچھ سوالات تھے جو اس کہانی کو آگے بڑھاتے تھے۔

ماضی میں جو کچھ بھی ہوا تھا۔ لیکن چند دن پہلے تک حقیقت یہی تھی کہ میں دل کی گہرائی سے امریتا اور ارباز کا ملاپ چاہتا تھا۔ انڈیا میں قیام کے دوران میں ایک لمحے کیلئے بھی میرے دل میں نہیں آیا تھا کہ میں نے "امریتا" ارباز کو سونپ کر کوئی غلطی کی ہے۔ نہ ہی کسی طرح کا پچھتاوا مجھے لاحق ہوا تھا۔ ارباز مجھے اپنے معاون کے طور پر ساتھ لے کر گیا تھا۔ اور میں نے صدق دل سے معاون اور ہمراز دوست کا کردار ادا کیا

تھا۔ اب ہم یہ بازی ہار کر واپس آچکے تھے۔ امریتا' ارباز سے چھن گئی تھی۔ اور وہ بے حد مایوس تھا۔ اس مایوسی نے اسے بالکل الگ تھلگ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی طاری ہوگئی تھی اس پر۔ مجھے تو لگتا تھا کہ فی الوقت وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا۔ امریتا کے بارے میں بھی نہیں۔ لیکن میں سوچ رہا تھا۔ مجھے سوچنا پڑ رہا تھا۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ اگر امریتا کی ازدواجی زندگی نے اسے کوئی دکھ پہنچایا تو اس کی ذمے داری کسی نہ کسی طور مجھ پر بھی عائد ہوگی۔ اس معاملے کی شروعات تو مجھ سے ہی ہوئی تھی۔ پھر میں ارباز کو سامنے لے آیا۔ امریتا کی چاہت میں ڈوب کر ارباز انڈیا جا پہنچا۔ وہاں حالات ایسے ہوئے کہ امریتا کے باؤجی کو فوراً پرتاپ سنگھ کی بات ماننا پڑی اور امریتا کی شادی کرنا پڑی۔

یہ سب کچھ ایک ناروا تیزی سے عمل میں آیا تھا۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر شانتی کی باتیں گونجتی تھیں۔ اس نے کہا تھا۔ راکیش کا کردار مشکوک ہے۔ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے (اپنی گفتگو میں شانتی نے اس بات کی بھی تردید کی تھی کہ پرتاپ سنگھ وغیرہ سے ان کی کوئی قریبی رشتے داری ہے۔ جس طرح پرتاپ کی دوستی باؤجی سے تھی۔ اس طرح شانتی کے پتا سے بھی تھی) پھر جب میں نے باؤجی سے ملاقات میں راکیش کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا تھا۔ تو باؤجی کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا تھا۔ مجھے وہ رنگ نہیں بھولا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ کوئی ایسی بات ہے جو نہیں ہونی چاہئے۔

ایک دن میں نے اپنے اس خدشے کا ذکر ارباز سے کیا تو وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر سخت بیزاری سے بولا۔ "یار دامی! جب تم یہ موضوع چھیڑتے ہو تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ کیا تم مجھے تکلیف دینے کیلئے میرے گھر آتے ہو؟"

"تم کیا سمجھتے ہو' اس کا ذکر نہیں ہوگا تو تم اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دوگے۔ نہیں یار ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہاری صورت دیکھ کر بتا سکتا ہوں تم رات دن اس کے خیال میں غرق رہتے ہو۔"

"تمہاری غلط فہمی ہے۔ جو کچھ وہ میرے ساتھ کر چکی ہے اس کے بعد اسے بھولنا میرے لئے بہت زیادہ مشکل نہیں رہا۔"

''اس نے کچھ نہیں کیا۔ جو کچھ کیا' حالات نے کیا۔ میں سمجھتا ہوں اس کی جگہ کوئی لڑکی بھی ہوتی تو ایسے طوفان میں پاؤں جما کر کھڑی نہ رہ سکتی۔ سب کچھ اس کیخلاف چلا گیا تھا۔ لالہ نے آستین کے سانپ والا کردار ادا کیا۔ مسلسل تین دفعہ اس نے پرتاپ سنگھ کے سامنے امریتا کی مخبری کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تم مجرم بننے سے پہلے ہی مجرم بن گئے......''

''چل یار چھوڑو اس قصے کو' جو بھی ہونا تھا ہو چکا ہے۔''

''لیکن یہ ''ہونا'' اپنے پیچھے کچھ سوال چھوڑ رہا ہے ارباز! اور یہ خاصے سنگین سوال ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ پرتاپ سنگھ اور راج سنگھ نے سیدھے سادھے باؤجی اور ان کی بیٹی کے ساتھ کوئی گیم کھیلی ہے......''

''تم زیادہ جیمز بانڈ بننے کی کوشش نہ کرو۔ جاؤ اور اپنے انٹرویو کی تیاری کرو۔ کہیں سروس لگ جائے گی تو ڈھنگ سے سوچنے بھی لگو گے۔''

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال لیا۔ یہ ایک خط تھا جو مجھے انڈیا سے آج صبح ہی موصول ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' ارباز نے پوچھا۔

''وشوا ناتھ ہوٹل میں جب شانتی سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نے اپنے ایڈریسز کا تبادلہ کیا تھا۔ یہ شانتی کا خط ہے۔ آج صبح کی ڈاک سے ملا ہے۔''

وہ حیرانی سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''کیا ہے اس میں؟''

''پڑھ کر دیکھ لو۔''

وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''تم پڑھو۔''

میں نے پڑھنا شروع کیا۔ شانتی نے رسمی کلمات اور تمہید کے بعد لکھا تھا۔

''......دائم صاحب' امریتا کی شادی کو تین ہفتے ہو گئے ہیں۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ راکیش کے بارے میں میرے من میں جو اندیشے تھے وہ غلط نہیں تھے۔ دو دن پہلے میں گجرال نگر جا کر باؤجی سے ملی ہوں۔ وہ بہت نراش اور گم صم تھے۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ سنگا پور سے تین چار بار امریتا کا فون آیا ہے۔ لیکن اب پچھلے دس پندرہ دن سے اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ ایک فون نمبر راکیش نے دیا تھا۔ اس پر بھی کوئی

رابطہ نہیں ہو رہا حالانکہ راکیش کا کہنا تھا کہ وہ ہر روز فون کیا کریں گے۔ انکل پرتاپ کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ پرسوں باؤجی نے انکل پرتاپ کے فلیٹ پر فون کیا تھا۔ وہاں سے جانکاری ملی کہ انہیں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اچانک کولمبو جانا پڑ گیا ہے۔ باؤجی کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ انہیں ملے بغیر اور آگاہ کئے بغیر اچانک نکل گئے۔ بہرحال یہ کوئی ایسی اچنبھے والی بات نہیں ہے۔ یہ دونوں بھائی پہلے بھی کئی کئی ماہ انڈیا سے غائب رہتے ہیں۔''

''آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں یہ ساری باتیں آپ کو کیوں بتا رہی ہوں؟ کیا اپنی پریشانی بیان کرنے کیلئے اپنے اردگرد کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ ایسی بات نہیں ہے دائم صاحب! لیکن ہر کسی سے ہر بات تو نہیں کی جا سکتی نا۔ باؤجی کی سادگی اور امریتا کی معصومیت کا سوچ سوچ کر میرا من ہولتا ہے۔ سوچتی ہوں اگر پردیس میں اس بے چاری کو کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ کانچ کی طرح ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ کچھ بھی نہیں جھیل سکتی ہے وہ۔ بھگوان کرے اس کے بارے میں جلد کوئی اچھی خبر آئے۔ میں اس کیلئے بڑی پریشان ہوں۔ ایک اور بات ذہن میں آ رہی ہے۔ آپ نے ملاقات کے دوران میں بتایا تھا کہ ملائیشیا میں آپ کے ایک قریبی دوست رہتے ہیں جو وہاں پرائیویٹ کام کرتے ہیں...... جہاں تک میری جانکاری ہے' سنگا پور اور ملائیشیا کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔ لوگ خشکی کے راستے بآسانی ایک سے دوسرے ملک میں آتے جاتے ہیں۔ سنگا پور کوئی بہت بڑی جگہ نہیں ہے۔ ممکن ہے وہاں کسی شخص کا پتہ ڈھونڈنا زیادہ کٹھن کام نہ ہو۔ اتفاق سے میرے پاس سنگا پور میں راکیش کا ایک ایڈریس موجود ہے۔ میں وہ ایڈریس آپ کو لکھ رہی ہوں۔ اگر چند دن تک مزید امریتا کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تو میں آپ کو پھر پتر لکھوں گی۔ ایسے میں آپ کے دوست تھوڑا سا کشٹ اٹھا کر سنگا پور جا سکیں تو وہ اس پتے پر امریتا اور راکیش کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکتے ہیں......''

میں نے امریتا کا سارا خط پڑھ کر سنا دیا۔ ارباز کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ بس خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا رائے ہے تمہاری؟''

وہ بولا۔ ''اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ فون آئے ہوئے پندرہ دن

ہوئے ہیں پندرہ مہینے تو نہیں۔ کئی وجوہات ہوسکتی ہیں فون کے نہ آنے کی۔ ہوسکتا ہے جوڑا ہنی مون پر کسی اور ملک نکل گیا ہو۔''

''افریقہ کے جنگلوں میں تو نہیں گیا ہوگا جہاں سے فون ہو ہی نہ سکے۔ اور انہوں نے روزانہ فون کرنے کی بات کی تھی۔ پھر وہ کیدو پرتاپ سنگھ بھی کہیں دستیاب نہیں ہو رہا۔ گڑبڑ والی بات کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا میرے جگر۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟''

''ہوسکتا ہے یار! یہ کہانی ابھی ختم نہ ہوئی ہو۔ انڈیا جانے سے پہلے ریگل میں جو فلم دیکھی تھی یاد ہے تمہیں؟''

''تھوڑی بہت۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

مجھے یاد تھا وہ ایک موضوعاتی انگلش فلم تھی۔ ایک اندھیری رات میں ایک ٹرین کے ڈبے میں ایک نوجوان' نئے شادی شدہ جوڑے سے ملتا ہے۔ تینوں گھل مل کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ رات پچھلے پہر جوڑا ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر جاتا ہے۔ نوجوان کو شک ہے کہ نوبیاہتا لڑکی کسی مصیبت میں ہے۔ وہ تجسس اور ہمدردی سے مجبور ہوکر اپنا سفر ادھورا چھوڑتا ہے اور خود بھی اتر جاتا ہے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں اس پر ثابت ہوجاتا ہے کہ نوبیاہتا نوجوان ایک جنونی قاتل ہے۔ وہ لڑکی کو ایک خاص وقت میں اور خاص مقام پر قتل کرنے کیلئے یہاں لایا تھا۔ وہ لڑکی کی جان اس جنونی سے چھڑاتا ہے۔ اگلی رات وہ دونوں اس اسٹیشن سے اسی ٹرین پر سوار ہوکر نئی منزل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ اور کہانی ہیپی اینڈ کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ میرے یاد دلانے پر ارباز کو بھی یقیناً یہ کہانی یاد آگئی تھی۔ تاہم اس کے بیزار تاثرات میں کسی طرح کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

میں کافی دیر تک اس سے شانتی کے خط اور اپنے تاثرات کے حوالے سے بات کرتا رہا...... آخر وہ بولا۔ ''تو تم چاہتے کیا ہو؟''

میں نے کہا۔ ''تم مجھے انڈیا لے کر گئے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ ملائیشیا چلو۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! میں تو یہاں انٹرویو دے دے کر تنگ آگیا ہوں۔ ہفتے کو بھی عرفات کا فون آیا تھا ملائیشیا سے۔ کہہ رہا تھا۔ ''بس ایک بار چند ہزار روپے خرچ کر کے ملائیشیا آجاؤ۔ ایک مہینے کا ویزہ تو لگ جاتا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کر کے اسے تین مہینے کا کرالیں گے۔ ان تین مہینوں کے اندر تمہیں مناسب نوکری ڈھونڈ کر دینا میری ذمہ داری ہے۔ میں نے ابا جی سے بھی بات کرائی۔ انہیں بھی نیم قائل کرلیا ہے اس نے۔ بڑے بھائی بھی یہی رائے دیتے ہیں۔ میں تو سوچتا ہوں ایک چکر لگا ہی لوں۔ عرفات کے پاس۔ اگر تم بھی ساتھ چلو تو بڑی زبردست بات ہے۔ تمہیں پتہ ہی ہے عرفات KLUANG میں رہتا ہے۔ وہاں سے سنگاپور جانا ایسے ہی ہے جیسے برآمدے سے صحن میں جانا۔ یار! کیا پتہ وہاں امریتا! واقعی کسی مصیبت میں ہو یا مصیبت میں پڑنے والی ہو۔ ہم اس کے لئے ...... بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ خاص طور پر تم۔ اس کیلئے بہت مددگار ثابت ہوسکتے ہو۔''

''میں اس کیلئے جتنا ذلیل ہوچکا ہوں' یہ کافی ہے۔'' وہ پر درد لہجے میں بولا۔

''یہ عشق نہیں آساں...... یہ عشق نہیں۔'' میں نے مصرعہ کہا۔

وہ سگریٹ ٹرے میں مسل کر ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''کبھی کبھی تم بالکل چغدوں جیسی باتیں کرتے ہو۔''

''تم بھی تھوڑے سے چغد ہوجاؤ۔ محبت کرنے والوں کیلئے یہ مفید ہوتا ہے۔''

''محبت' اس نے چبا کر کہا۔ میں کر چکا ہوں محبت اور اب اسے دفنا بھی چکا ہوں۔''

''تم نے دفنایا نہیں۔ صرف اسے خود سے دور کیا ہے۔ اور جو دور ہوجاتے ہیں وہ کبھی کسی انہونی کے سبب پلٹ بھی تو آتے ہیں۔''

''اب پلٹنے نہ پلٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ پھر وہ ذرا سے توقف کے بعد عجیب لہجے میں بولا۔ ''...... اور تمہیں پتہ ہے میں جوٹھا نہیں کھاتا۔''

لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ دروازے سے نکل گیا۔

اس کا فقرہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ''تمہیں پتہ ہے میں جوٹھا نہیں کھاتا۔''

یہ معمولی سا فقرہ' اپنے اندر بہت گہرے معنی رکھتا تھا۔ اس فقرے نے ارباز کے اندرونی

احساسات کی عکاسی بڑے عجیب ڈھنگ سے کی تھی۔ ارباز کے کہنے کا مطلب شاید یہ تھا کہ امریتا اب قصہ پارینہ ہے۔ اب اگر کسی وجہ سے کسی انہونی کے سبب وہ اسے پھر سے مل بھی جاتی ہے تو یہ ملنا بالکل بے کار اور لاحاصل ہے۔ وہ ایک الہڑ دوشیزہ نہیں بلکہ شادی شدہ عورت ہوگی۔ وہ اس چبائے ہوئے لقمے کو پھر سے اپنے منہ میں رکھنا نہیں چاہے گا۔

ارباز کی بات نے مجھے سناٹے میں چھوڑ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے امریتا سے ارباز کی محبت صرف جسمانی محبت تھی۔ وہ محبت جو کاکل و رخسار سے شروع ہو کر پتلی کمر اور چکنے نشیب و فراز پر ختم ہو جاتی ہے۔ مرد و زن کی محبت میں جسمانی عنصر کو یکسر نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کچھ لوگوں کے معاملے میں یہ عنصر اتنا حاوی ہوتا ہے کہ سچے خوشبودار جذبے دور کہیں پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ مجھے بتدریج یہ احساس ہو رہا تھا کہ شاید امریتا سے ارباز کا رومانی تعلق بھی اسی نوعیت کا تھا۔ یہ تعلق بلند لہروں کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ طوفان کی طرح چھایا تھا...... اور پھر...... شاید جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا...... مجھے عجیب سی کوفت کا احساس ہوا۔ گھر آ کر میں بہت دیر تک کمرے میں بند رہا اور اس نئی صورتحال کے بارے میں سوچتا رہا۔

وہ سرخ مخملی البم میرے سامنے پڑی تھی۔ جو میرے ہی لکھے ہوئے خطوں سے سجی تھی اور وشوا ناتھ ہوٹل کی آخری ملاقات میں امریتا نے مجھے دی تھی۔ میں بستر پر نیم دراز ہو کر اس البم کو دیکھنے لگا۔ البم کے پہلے پنے پر امریتا نے یہ شعر اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

یہ کوئی اڑھائی درجن خط تھے۔ ہر خط پر تاریخ موجود تھی۔ نیلے، گلابی اور سبز رنگ کے دیدہ زیب لیٹر پیڈز پر یہ خط میں نے بڑی توجہ سے لکھے تھے۔ اپنی تعریف آپ نہ ہو جائے تو میں کہوں گا کہ میں خوش خط بھی تھا۔

میں نے ترتیب وار خط پڑھنے شروع کیے۔ گزرا ہوا ایک پورا دور نگاہوں کے سامنے زندہ ہو گیا۔ پہلے چھ مہینے کے خط وہ تھے جو میں نے اپنے طور پر قلمی دوستی کے

حوالے سے لکھے تھے۔ ان خطوں میں روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات تھے۔ زندگی کے بارے میں فلسفیانہ باتیں تھیں۔ لطائف تھے، اشعار تھے۔ یہ خط میں نے دوبارہ سے پڑھے تو مجھے اور بھی اچھے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان خطوں میں چلتی ہوئی پرخلوص دوستی کی لہر بھی محسوس ہوئی۔ بعد کے وہ خط جو میں نے ارباز کے کہنے پر لکھے تھے یا ری رائٹ کیے تھے، کچھ مختلف ہو گئے تھے۔ لیکن ان خطوں میں بھی میں نے شائستگی، ادبیت اور لطافت کو تحریر سے جوڑے رکھا تھا۔ ان خطوں میں ارباز کی بے باکی اور پرتپش رومانیت شامل ہونے کے باوجود، تحریر معیار سے گری نہیں تھی۔ شاید یہ میرے منتخب کردہ لفظوں کا اثر تھا کہ امریتا نے ارباز کی کئی تحریری بے باکیاں، نہ صرف برداشت کی تھیں بلکہ انہیں بتدریج اپنے دل میں بھی جگہ دی تھی۔

میرے ذہن میں جالندھر میں گزارے ہوئے روز و شب گھومنے لگے۔ ٹیسٹ میچ دیکھنے کیلئے ہمارے پاس فقط چند دن کا ویزہ تھا۔ ارباز کو بھی اس مختصر مہلت کا پتہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے امریتا کے ساتھ بے باک رویہ اپنایا تھا۔ اور بڑی بڑی ''جستوں'' کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔ سینما ہال میں فلم دیکھنے کے دوران شاید اسی وجہ سے امریتا کچھ بے آرام بھی ہوئی تھی۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ ذرا جز بز نظر آنے لگی تھی۔ بہر طور یہ اس کا ظرف تھا کہ کسی موقع پر بھی اس نے ارباز کی دل شکنی نہیں ہونے دی تھی۔ اب میں نے تسلی سے البم کے خطوں کو پڑھا اور پھر ان میں پائے جانے والے دھیمے پن کا موازنہ اس عجلت سے کیا جو ارباز نے جالندھر میں روا رکھی تھی تو مجھے اس سارے معاملے میں کئی جھول اور جمپ نظر آئے۔ کچھ ناقابل تردید خلا تھے۔ جو ان خطوں اور ''امریتا ارباز'' کے تعلق کے درمیان موجود تھے۔ شاید یہی خلا تھے جنہوں نے امریتا ارباز کے تعلق کو اتنا توانا نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کسی دیوار میں در بنا سکتا۔

میں نے امریتا کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی بے نام سا ناطہ ہے۔ جو امریتا کے حوالے سے شروع سے اب تک موجود ہے۔ اس ناطے کے نشان اپنے دل کی گہرائی میں میں اب بھی تلاش کر سکتا تھا۔ کوئی بات جو ختم ہو کر بھی ختم نہیں ہوئی تھی، کوئی ڈور جو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں اپنے دوست سے بے وفائی کر رہا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں اسے اپنے ساتھ ملائیشیا

لے جانا کیوں چاہتا۔ میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ خواہش ابھرتی کہ ارباز میرے ساتھ ملائیشیا جائے۔ ہم امریتا کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں اور اگر بالفرض حالات ویسے ہی ہیں جیسے شانتی کہہ رہی ہے تو پھر ہم امریتا کی مدد کی کوشش کریں اور کیا پتہ کہ ابھی امریتا کی زندگی کا کوئی راستہ ارباز کی زندگی کی طرف جاتا ہو؟ پھر وہ ڈور کیا تھی؟ وہ ناطہ کیا تھا؟ اس کا واضح جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔ میں تو ارسہ کا ہونے والا شوہر تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اچھے لگتے تھے...... اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ میں امریتا کو کسی اور نگاہ سے دیکھوں۔ پھر یہ ڈور شاید ہم ذوقی اور ہم مزاجی کی ڈور تھی۔ یہ انسیت اور ہمدردی وہی تھی جو ایک انسان ایک دوسرے اچھے انسان کیلئے محسوس کرتا ہے۔ یا پھر یہ کوئی ایسا تعلق تھا۔ جو تحریری لفظوں کے تبادلے سے پروان چڑھتا ہے۔

بیس بائیس دن بعد جالندھر سے شانتی کا ایک اور خط آ گیا۔ یہ خط میرے اندیشوں کے عین مطابق تھا۔ شانتی نے صاف لفظوں میں لکھ دیا تھا کہ باؤجی کے دوست انکل پرتاپ سنگھ نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ سنگاپور سے امریتا کی کوئی خبر نہیں آئی۔ نہ ہی جالندھر میں پرتاپ سنگھ اور راج سنگھ کا کوئی سراغ مل رہا ہے۔ باؤجی مارے مارے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے پرتاپ سنگھ کی جان پہچان والوں سے رابطہ کیا ہے۔ دونوں بھائیوں کے بارے میں کسی کو علم نہیں اور نہ وہ بتا کر گئے ہیں۔ ان دونوں کے بارے میں اور خاص طور سے راج سنگھ کے متعلق کئی الٹی سیدھی باتوں کا پتہ بھی چلا ہے۔ ان کا کرائے کا فلیٹ بھی خالی پڑا ہے۔ شانتی نے بڑے درد سے لکھا تھا کہ امریتا کا کوئی ایسا والی وارث نہیں جو اس کی بپتا کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے۔ اگر میں اپنے ملائیشیا مقیم دوست کے ذریعے ازخود معلوم کرسکوں تو یہ بہت بڑی نیکی ہوگی۔

شانتی نے آخر میں لکھا تھا۔ ''تین دن پہلے باؤجی نے ایک فون کال سنی تھی۔ دوسری طرف امریتا بول رہی تھی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے صرف دو تین فقرے بولے۔ باؤجی کا حال پوچھا اور کہا کہ وہ خیریت سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی مرد بھاری آواز میں بولا اور فون بند ہوگیا۔''

میں نے شانتی ملہوترا کا لکھا ہوا یہ خط دو تین بار پڑھا اور دل میں فیصلہ کرلیا کہ میں اور ارباز سنگاپور ضرور جائیں گے۔

اگلے تین دن تک میرے اور ارباز کے درمیان گاہے بگاہے زوردار بحث ہوئی۔ میں نے شانتی کا خط اسے دکھا دیا تھا۔ ارباز کو یہ بھی معلوم تھا کہ میرے ملائیشیا جانے کا پروگرام تقریباً فائنل ہوچکا ہے اور عرفات کے فون پر فون آ رہے ہیں کہ میں جلد از جلد ملائیشیا پہنچ جاؤں۔ یہ ایک طرح سے ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ تھا۔ اگر ارباز بھی میرے ساتھ چل پڑتا تو ہم ایک سفر سے دو فائدے حاصل کر سکتے تھے۔ یہ حقیقت میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ ارباز ایک نڈر، تیز اور باتدبیر شخص کا نام تھا۔ اپنی کاروباری سمجھ اور تجربے کی وجہ سے وہ اکثر ہر قسم کی صورتحال کو ہینڈل کر لیتا تھا۔ جالندھر میں تو سچویشن ہی ایسی بن گئی تھی کہ ہماری ساری صلاحیتیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ ورنہ ہم دونوں ساتھ ہوتے تھے تو عموماً کٹھن ترین کام بھی کر گزرتے تھے۔

ان تین چار دنوں میں، میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ارباز ٹس سے مس نہیں ہوا...... لگتا تھا کہ اسے اس موضوع میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کیوں آج کل اس پر نئی نئی شرٹس خریدنے کا بھوت سوار تھا۔ وہ مہنگی شرٹس لاتا تھا۔ ایک دو روز پہنتا تھا پھر وارڈ روب میں پھینک دیتا تھا۔ ''جم'' بھی اس نے ایک بار پھر باقاعدگی سے جانا شروع کر دیا تھا۔ جس میں اس کا کسی سے زوردار جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اس نے ایک سابق مسٹر لاہور کا جبڑا توڑ ڈالا تھا اور بات تھانے کچہری تک پہنچی تھی۔ شاید یہ سب اسی ڈیپریشن کا شاخسانہ تھا۔ جو وہ جالندھر سے لے کر لوٹا تھا۔ جم میں اندھا دھند ورزش کرنا اور نئی نئی شرٹس خریدنا بھی شاید اسی ڈیپریشن کو کم کرنے کی کوششوں کا حصہ تھا۔ ایک بات بیان کرنا میں شاید بھول گیا۔ انڈیا میں ہم پر جو گزری تھی اس کا احوال ہم لاہور میں اپنے لواحقین سے چھپانے میں کامیاب رہے تھے۔ میری پرزور درخواست پر ''مسکراتے چہرے والے'' انکل نریندر نے بھی اس بارے میں بڑے بھائی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

ایک دن صبح سویرے میں نے ارباز کو فون کیا تو دوسری طرف سے اس کے ابوجی کی آواز آئی۔ ''انکل! ارباز کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنسے۔ ''بھئی! اب ہمیں بنانے کی کوشش تو نہ کرو۔''

''کیا مطلب انکل؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھئی! کہ وہ دو تین ہفتے کیلئے کراچی جائے اور تمہیں پتہ نہ ہو۔''

''کراچی! بائی گاڈ انکل! مجھے کچھ خبر نہیں۔''

''حیرت ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی حیرت ہے۔''

''کوئی رابطہ ہے اس کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی ہوٹل میں ہی ٹھہرا ہوگا۔ کہتا تھا میں خود جا کر فون کردوں گا۔ اصل میں اسے دو تین جگہ جانا ہے۔ گودی پر کچھ سامان آرہا ہے وہ بھی ریلیز کروانا ہے۔ کافی ٹائٹ شیڈول ہے اس کا۔''

مجھے لگا کہ ارباز جان چھڑا کر چلا گیا ہے۔ اب آسانی کے ساتھ اس سے رابطہ نہیں ہو پائے گا۔ اب مجھے اکیلے ہی جانا تھا۔ ہاں مجھے اکیلے جانا تھا۔



وہ نومبر 83ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ سردی نے وقت کے حساب سے جلدی شدت پکڑ لی تھی۔ میں پی آئی اے کی پرواز کے ذریعے لاہور سے کوالالمپور روانہ ہوا۔ یہ کل تقریباً پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ گھر والوں کو یہی معلوم تھا کہ کوالالمپور سے میرے دوست عرفات کے فون پر فون آرہے ہیں اور وہ وہاں مجھے دو تین ہفتوں میں اچھی نوکری دلانے کی پوزیشن میں ہے۔ میں اپنی گفتگو میں ارباز کو بھی یہی بتاتا رہا تھا۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف تھی۔ عرفات کا بس ایک فون آیا تھا اور اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں مجھے آنے اور قسمت آزمائی کرنے کی دعوت دی تھی۔ درحقیقت میں نوکری کی تلاش میں ملائیشیا نہیں جا رہا تھا۔ اور نہ مجھے وہاں نوکری ملنے کی زیادہ امید تھی۔ میں تو کسی نادیدہ ڈور سے بندھا ہوا تھا۔ اور یہ ڈور مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں اس کشش کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا مگر یہ اپنی جگہ موجود تھی۔ میں امرتا کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس کو کھوجنا چاہتا تھا۔

کوالالمپور ایئرپورٹ پر عرفات شاہد نے میرا استقبال کیا۔ عرفات چھوٹے قد کا تھا۔ سر نیم گنجا تھا لیکن چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی اور یہی مسکراہٹ اس کی بظاہر عام سی شخصیت کو جاذب نظر بناتی تھی۔ عرفات یہاں ایک چھوٹی سی شاپ یا کہنا چاہئے کہ ورکشاپ چلا رہا تھا۔ لاہور ایف سی کالج میں ارباز، میں اور عرفات اکٹھے ہی پڑھتے تھے۔ ہم تینوں میں دوستی بھی تھی۔ ارباز اور عرفات کی دوستی میں کالج کے دور میں ایک واقعہ کی وجہ سے ڈیڑھ دو سال کا وقفہ بھی آیا تھا۔ ارباز کے والد نے اسے نئی ڈاٹسن گاڑی لے کر دی تھی۔ عرفات ضد کر کے گاڑی چلانے کیلئے لے گیا تھا اور پھر نہر کے

کنارے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے دو "ڈینٹ" ڈلوا لایا تھا۔ تین دن بعد ارباز نے گاڑی کم قیمت پر بیچ دی تھی۔ نئی اور ان ٹچ چیز کے حوالے سے اس کا رویہ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا تھا۔

عرفات چھوٹتے ہی بولا۔ "یار! تم تو کہتے تھے۔ کمانڈو تمہارے ساتھ آئے گا۔ اب اکیلے ہی پہنچ گئے ہو؟" (وہ ارباز کو ہمیشہ کمانڈو کہتا تھا۔)

"تو کیا میں اسے اٹھا کر لے آتا۔ اس کا نہیں دل چاہ رہا تھا۔"

"نہیں بھی دل چاہ رہا تھا تو لے آتے۔ بے چارے کے ساتھ دیوداس والی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ ادھر آتا تو دل بہل جاتا۔ شاید کوئی چندر مکھی ہی اسے مل جاتی۔ یہاں کے "نائٹ کلب" بڑے بڑے دیوداسوں کا غم غلط فرما دیتے ہیں۔"

"واقعی؟"

"آزمائش شرط ہے۔ لیکن مجھے پتہ ہے تم اس آزمائش میں نہیں پڑو گے۔ تمہاری ساری سیاحت ارسہ بھابی...... میرا مطلب ہے ہونے والی ارسہ بھابی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی ہے۔"

"اس سیاحت کیلئے جس ویزے کی ضرورت ہے وہ ابھی میرے پاس موجود نہیں۔ اور تمہیں پتہ ہے۔ میں چوری چھپے بارڈر کراس کرنے والا نہیں ہوں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس نے گہری سانس لے کر میرے ہاتھ سے اٹیچی کیس لیا اور بولا۔ "کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے تم بس کنویں کے مینڈک ہو۔ سیر و سیاحت کا تمہیں شوق ہی نہیں۔ یا پھر تمہیں ارسہ بھابی کے تاریخ جغرافیے میں خاص دلچسپی ہی نہیں۔"

وہ بولتا چلا گیا۔ میں نے اس کی طرف سے کان بند کر لئے اور کوالالمپور کے حسن میں کھو گیا۔ صاف شفاف سڑکیں، بلند عمارتیں، لشکارے مارتی نہایت مہنگی گاڑیاں اور سبزے سے ڈھکے ہوئے راستے۔ بڑا دلکش شہر تھا۔ میں نے انڈیا کے جالندھر کا موازنہ کوالالمپور سے کیا اور وہی فرق محسوس ہوا جو کراچی اور روہڑی میں ہو سکتا ہے۔

ایک صاف ستھری کشادہ سڑک کے کنارے چمکیلے نیلے رنگ کی امپالا کار

کھڑی تھی۔ عرفات نے میرا مختصر سامان ڈکی میں رکھا اور ہم روانہ ہو گئے۔

"اوئے عرفات! یہ تمہاری کار ہے؟" میں نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

"ابھی میں نے ڈاکے شاکے مارنے شروع نہیں کئے۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔ "اپنے لینڈ لارڈ سے مانگ کر لایا ہوں، ایک دن کیلئے۔"

یہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ کوالالمپور کی سڑکوں پر ابھی زیادہ رش نہیں تھا۔ عظیم شہر انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا اور کسی بھی وقت پوری طرح جاگ سکتا تھا۔ ہم بس اس کی چند جھلکیاں ہی دیکھ پائے۔ بلند و بالا عمارتیں، پرشکوہ ٹاور، جدید ڈیزائن کے اوور ہیڈ برج اور باغیچے، ہم کوالالمپور کے نہایت وسیع و عریض "چڑیا گھر" کے پاس سے گزرے اور چائنہ ٹاؤن کی جھلکیاں دیکھتے ہوئے آگے نکل گئے۔ جلد ہی ہماری گاڑی مضافات میں پہنچی اور پھر ہائی وے پر آ گئی۔ ملائیشیا کے خوبصورت مناظر نگاہوں میں جذب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ہم سفر کے ساتھ ساتھ موسیقی سنتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ زیادہ تر گفتگو پاکستان کے حالات اور پھر ارباز کو پیش آنے والے واقعات کے حوالے سے تھی۔ کوالالمپور سے KLUANG تک تقریباً اڑھائی تین سو کلومیٹر کا سفر ہم نے صرف چار گھنٹے میں طے کر لیا۔ اور دوپہر سے ذرا پہلے منزل پر پہنچ گئے۔ راستے میں سیرم بن، مالاکا، میور اور باتو جیسے شہروں سے گزرے اور دور سے ان کے حسین نشیب و فراز کو دیکھا۔

KLUANG ملائیشیا کی جدید اور دلکش آبادیوں میں سے ایک ہے۔ سنگاپور کے بارڈر سے اس کا فاصلہ بہت تھوڑا ہے۔ اسی دلکش شہر کے ایک متوسط علاقے جورنگ روڈ پر عرفات کی ایک چھوٹی سی شاپ تھی۔ یہاں وہ کارپینٹری کرتا تھا۔ عرفات نے بی ایس سی کرنے کے بعد لاہور ہی سے کارپینٹری کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا اور یہاں ملائیشیا آ گیا تھا۔ پہلے پہل وہ خود کام کرتا رہا تھا۔ لیکن اب اس نے دو کاریگر رکھے ہوئے تھے۔ اور شاپ کو کچھ کشادہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں عرفات کی شاپ کا تصور وہی تھا۔ جو پاکستان میں ہو سکتا ہے۔ ہر طرف لکڑی کے کٹ پیس بکھرے ہوئے۔ لکڑی کا اڈا یعنی پلیٹ فارم، نامکمل کھڑکیاں اور مختلف اشیاء دیواروں سے ٹنگی ہوئی اور دھوتی بنیان

پہنے ہوئے دو مستری رندا چلانے میں مصروف۔ لیکن جو رنگ روڈ پر عرفات کی شاپ
دیکھ کر حیرت ہوئی۔ یوں لگا جیسے کسی ایئر لائن کے دفتر میں داخل ہو گیا ہوں' شیشے لگے
ہوئے تھے۔ اوزار اور لکڑی کے چرائی شدہ تختے بڑے سلیقے سے رکھے تھے۔ ایک سکھ
نوجوان وردی پہنے چند پینٹنگز کو فریم کرنے میں مصروف تھا۔

مجھے اور عرفات کو دیکھ کر نوجوان اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''ست سری اکال'
گڈ نون سر۔'' وہ بتیسی نکال کر بولا۔

''یہ پرنام ہے۔ یہاں میرے پاس کام کرتا ہے۔'' عرفات نے تعارف
کرایا۔ ''دوسرا پاکستانی ظہیر ہے۔ وہ کام پر گیا ہوا ہے۔''

''یار! یہ تمہاری دکان ہی ہے نا' کہیں مجھے غلط جگہ پر تو نہیں لے آئے۔''

''یہ میری دکان ہی ہے۔ لیکن اگر تمہیں کسی ''غلط جگہ'' پر جانے کا شوق ہے تو
وہ بھی پورا کر دوں گا۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

عرفات شروع سے ہی رومان پسند واقع ہوا تھا۔ ابھی تک غیر شادی شدہ بھی
تھا۔ میں جانتا تھا اس نے یہاں ایک دو گرل فرینڈز بھی پال رکھی ہیں۔ بہرحال نشے
وغیرہ سے وہ ہمیشہ دور رہا تھا۔ اور اب بھی تھا۔ میں سامنے سڑک پر رواں دواں ٹریفک
کو دیکھتا رہا' اور نظم و ضبط کے مظاہرے پر حیران ہوتا رہا۔ کہیں کوئی افراتفری نظر نہیں
آئی۔ یہ لنچ کا وقت تھا۔ فٹ پاتھوں پر پیدل لوگ رواں دواں تھے۔ ملائیشیا میں زیادہ تر
مسلمان آباد ہیں۔ اس کے علاوہ انڈین اور چائنیز وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں۔ مسلمان
خواتین میں سے جو آزاد خیال ہیں اسکرٹ پہنتی ہیں۔ لیکن اکثریت اسکارف اوڑھتی
ہے۔ ایک چغہ نما لبادہ جسم کو ڈھانپے رہتا ہے۔ مجھے عام لوگ صحت مند اور چاق و
چوبند نظر آئے۔ کہیں دور کسی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

میں واش روم سے منہ ہاتھ دھو کر نکلا ہی تھا کہ سامنے فارمیکا کی خوبصورت
میز پر کھانا پڑا نظر آیا۔ شیشے کے کیبن میں بیٹھ کر میں نے ملائیشیا کا پہلا کھانا تناول
کیا...... عرفات سے جب کبھی فون پر بات ہوتی تھی۔ ملائیشیا کے چٹ پٹے اور دھواں
دھار کھانوں کا ذکر ضرور رہتا تھا۔ آج میں اور کھانا آمنے سامنے تھے۔ چاول کی پلیٹ

پر ابلا ہوا انڈا' مچھلی' چٹنی اور پتہ نہیں کیا کچھ دھرا تھا۔ ایک طرف پاکستانی ڈش یعنی دال
گوشت بھی موجود تھا۔ میں نے کہا۔ ''اتنا کچھ تو ہے' دال گوشت کی کیا ضرورت تھی؟''

''ہوسکتا ہے ضرورت پڑ ہی جائے۔'' عرفات نے عام سے لہجے میں کہا۔

میں نے ملائیشین چاولوں کا پہلا لقمہ منہ میں دھرا اور یوں لگا جیسے زمین آسمان
ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ ناک اور کانوں سے دھواں نکلتا محسوس ہوا۔ شاید
میں نے غلطی سے چاولوں کی بجائے ''بارود'' منہ میں رکھ لیا تھا۔ ''پانی'' میں نے پھنسی
پھنسی آواز میں کہا۔

عرفات نے گلاس تھمایا۔ میں اوپر تلے کئی گلاس پی گیا۔ لیکن زبان' مرچوں کی
وجہ سے اب بھی سنسنا رہی تھی۔ جی چاہا زبان نکال کر ٹھنڈے ٹھار پانی میں ڈبو دوں۔
عرفات اور پرنام زیر لب مسکرانے لگے۔ دو چار منٹ بعد اوسان قدرے بحال ہوئے تو
میں نے آنسو پونچھ کر عرفات کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''کیا خیال ہے' دال گوشت
رہنے دوں یا واپس بھجوا دوں؟''

میں نے دال گوشت کی پلیٹ اپنی طرف گھسیٹ لی۔

کچھ دیر بعد عرفات کے دوسرے کاریگر ظہیر سے بھی ملاقات ہو گئی۔ یہ
چھریرے جسم کا قدرے لمبا نوجوان تھا۔ عینک پہنتا تھا۔ یہ بھی یونیفارم میں تھا۔
اوزاروں والا صاف ستھرا اسٹاکش بیگ اس نے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ عرفات نے
اس کا بھی تعارف کرایا۔ میں نے کہا۔ ''یار! تم ظہیر ہو یا ظہیر عباس ہو۔ نام کے ساتھ
ساتھ تمہاری شکل بھی اسٹار کرکٹر سے ملتی ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''بہت سے لوگ یہی کہتے ہیں۔''

''ان لوگوں میں کئی ایک لڑکیاں بھی ہیں۔'' عرفات نے لقمہ دیا۔ ''اور ایک
لڑکی تو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ انڈین ہے اور مزے کی بات یہ ہے
کہ خود بھی کرکٹ کھیلتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی کرکٹ کھیلتی ہے...... اور کیا مطلب...... ہاکی اور فٹ بال کی طرح

لڑکیاں اب کرکٹ کی طرف بھی آ رہی ہیں۔ یہ شریمتی جو ظہیر کی پرستار ہے یہاں ہمارے بازو میں ہی رہتی ہے۔ ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتی ہے اور شام کو ایجنسی کی ٹیم کے ساتھ باقاعدہ نیٹ پریکٹس کرتی ہے بلکہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''چپ کیوں ہو گئے؟'' میں نے کہا۔

عرفات ذرا شرارت سے مسکرایا اور بولا۔ ''دو چار دفعہ تو ظہیر بھی اس کے ساتھ کھیلا ہے۔ وہ سپین باؤلنگ کراتی ہے اور جب ظہیر کے ساتھ کھیلتی ہے تو پھر تو اتنے پولے پولے بال کراتی ہے کہ خوامخواہ چھکا مارنے کو دل چاہے۔ لیکن ہمارا یہ بیٹسمین ہی ماٹھا ہے۔ آہستہ کھیلنے میں حنیف محمد کو بھی ملت دے گیا ہے۔''

ظہیر کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ وہ جانتا تھا کہ عرفات کس رخ پر بات کر رہا ہے۔ ہم شام تک دلچسپ گفتگو میں مصروف رہے۔ ظہیر کی صورت واقعی کرکٹر ظہیر عباس سے بہت ملتی تھی۔ اس کا نام ظہیر نہیں صادق حسین تھا۔ لیکن شکل وصورت کی وجہ سے یار لوگوں نے اسے ظہیر عباس کہنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے صادق پس منظر میں چلا گیا اور ظہیر سب کی زبان پر آ گیا۔ اب وہ خود بھی اپنا تعارف ظہیر صادق کے طور پر کراتا تھا۔ وہ ظہیر عباس کا پرستار بھی تھا اور ظہیر عباس کے ساتھ دو تین تصویریں بھی کھنچوا چکا تھا۔ اس کی نظر کمزور نہیں تھی صرف معروف کرکٹر کے ساتھ اپنی مشابہت بڑھانے کیلئے وہ سادہ شیشوں کی عینک لگاتا تھا۔ اور اپنے بال اوپر کی طرف بناتا تھا۔ وہ مجھے ایک شرمیلا' کم گو اور دلچسپ شخص لگا۔

شام کے فوراً بعد عرفات نے اپنی شاپ بند کر دی اور ہم KLAUNG کی سیر کو نکل گئے۔ سواری کے طور پر ہمارے پاس عرفات کی ذاتی ''ہنڈا'' کار تھی۔ ماڈل قدرے پرانا تھا۔ لیکن خوب چل رہی تھی۔ ظہیر بھی ہمارے ساتھ تھا اور پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ گاڑی میں پاکستانی نغمے گونج رہے تھے۔ ''گا میرے منوا' گاتا جارے' جانا ہے ہم کا دور'' کلانگ (KLAUNG) میں عمارتیں بہت اونچی نہیں تھیں۔ مگر بہت صاف ستھری اور آراستہ تھیں۔ ایک دو بڑے بڑے کیسینوز پر بھی نظر پڑی۔ سڑکوں پر چلنے والی گاڑیاں قیمتی اور ان دیکھے ماڈلز کی تھیں...... شہر کی سیر کے دوران ہی میں نے

جیب سے وہ کاغذ نکال لیا جس پر شانتی نے مجھے سنگاپور کا ایڈریس لکھوایا تھا۔ یہ وہ ایڈریس تھا جس پر راکیش اور امریتا کے ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی...... میں نے کاغذ عرفات کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس ایڈریس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

اس نے گاڑی چلاتے چلاتے ایڈریس پڑھا۔ ''آرچرڈ روڈ' لین F-26 سنگاپور' ہوٹل سکائی ویو' سوئٹ نمبر 118' یہ کس کا ایڈریس ہے بھئی؟''

''ایک بندے کا' اس سے جلد ملنا ضروری ہے۔''

''بندے کا یا بندی کا؟''

''بندے کا۔ مذاق چھوڑو اور بتاؤ۔ کیا کر سکتے ہو؟''

''لیکن یہ بندہ ہے کون؟''

''بس یہ سمجھ لو کہ ارباز کو مطلوب ہے۔ اس کا کچھ سامان لے کر بھاگا ہوا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے الیکٹرانکس کا سامان۔''

''ہاں...... یہی سمجھ لو۔''

''کتنے کا ہو گا؟''

''صحیح قیمت معلوم نہیں۔ لیکن خاصا مہنگا ہے۔ اس نے ساری تفصیل مجھے بھی نہیں بتائی۔ بس کراچی سے فون کر کے مجھے کہا ہے کہ اس بندے کو ڈھونڈنا ہے۔'' میں نے بات بنائی۔

''یہ تو پھڈے والا معاملہ لگتا ہے۔ کمانڈو صاحب کو خود آنا چاہئے تھا۔ مار دھاڑ میں وہ ہیرو نمبر ایک ہے۔''

''تو کیا ہم ہیجڑے ہیں؟''

''مجھے اپنا تو پتہ ہے۔ لیکن تم ہو بھی سکتے ہو۔''

میں نے اس کی گردن دبائی۔ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ گاڑی بری طرح لہرائی اور فٹ پاتھ پر چڑھتے چڑھتے بچی۔ عریاں پنڈلیوں والی ایک حسینہ نے سریلی چیخ بلند کی۔ میں نے گردن چھوڑ دی۔ وہ گاڑی سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''اسے لاہور کا بند روڈ نہ

سمجھو۔ یہاں ٹریفک والوں نے پکڑ لیا تو سیدھا پھانسی لگا دیں گے۔"

ہم رات گئے تک گھومتے رہے۔ عرفات مجھے شہر دکھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ رواں تبصرہ کر رہا تھا۔ یہ فلاں مارکیٹ ہے' یہ فلاں اوور برج اور یہ فلاں نائٹ کلب ہے۔ شہر واقعی دیکھنے کے قابل تھا اور میں دیکھ بھی رہا تھا۔ لیکن ذہن کا ایک حصہ مکمل طور پر راکیش اور امریتا میں الجھا ہوا تھا۔ ذہن میں لاتعداد سوال کلبلا تے تھے۔ امریتا کہاں اور کس حال میں ہوگی؟ پرتاپ سنگھ اور راج سنگھ غائب کیوں ہیں؟ امریتا یا راکیش نے جالندھر میں باؤ جی سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ کہیں امریتا کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو چکی؟ میں ہزاروں میل کا سفر کر کے امریتا کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ مگر اب بھی اس سے دور تھا۔

اگلے روز ہفتہ تھا۔ دو پہر کے وقت عرفات نے اپنی شاپ ہرنام سنگھ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "دو پہر کے وقت کسی سردار کو ذمے داری تو نہیں سونپنی چاہئے لیکن میں سونپ رہا ہوں' دھیان سے رہنا۔"

ہمارا رخ اب سنگا پور کی طرف تھا۔ عرفات اور ظہیر کے پاسپورٹوں پر سال بھر کا ویزہ لگا ہوا تھا۔ وہ دن میں دس بار سنگا پور آ اور جا سکتے تھے۔ سنگا پور اور ملائیشیا میں امیگریشن کے قوانین ان دنوں بے حد نرم تھے۔ ہم پہلے آخری سرحدی شہر "جوہر بارو" پہنچے۔ وہاں سے ہم نے وڈ لینڈ چیک پوسٹ سے سرحد پار کرنا تھی۔ عرفات کی تھوڑی سی کوشش کے بعد میرے پاسپورٹ پر بھی انٹری لگا دی گئی۔ آگے سمندر تھا۔ سمندر پر تقریباً دو کلومیٹر لمبا ایک عظیم الشان پل ہے جو ملائیشیا کو سنگا پور سے ملاتا ہے۔

نیلگوں سمندر کے درمیان سنگا پور ایک جگمگاتا جزیرہ ہے۔ ملائیشیا کے حسن نے مجھے متاثر کیا تھا۔ لیکن سنگا پور کو دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ یقین نہیں آیا کہ میں مشرق بعید کے کسی ملک میں کھڑا ہوں۔ یہ شہر تو یورپ اور امریکہ کو مات دیتا محسوس ہوتا تھا۔ یہ ایک اور ہی دنیا لگ رہی تھی۔ عمارتیں اتنی فلک بوس اور گنجان تھیں کہ ان کے درمیان آسمان کی بس جھلک ہی دکھائی دیتی تھی۔ لوگوں سے لے کر عمارتوں تک اور سڑکوں سے لے کر سبزے تک ہر شے دھلی دھلائی اور چمکدار تھی۔ ایک دو بار دائیں بائیں تھوکنا چاہا

لیکن کوچہ و بازار کی صفائی دیکھ کر ارادہ بدل دیا۔ عرفات نے جملہ کسا۔ "کیا بات ہے؟ پری پیکروں کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر رہا ہے؟"

"نہیں پری پیکروں کیلئے تمہاری للچائی ہوئی نظریں دیکھ کر دل کچا ہو رہا ہے۔"

ہم آرچرڈ روڈ جانے کیلئے ایک بس اسٹاپ پر کھڑے ہوگئے۔ دو انڈین عورتیں اور ایک بچہ بڑی دیر سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سات آٹھ سالہ بچہ اپنی ننھی سی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے ہماری طرف آیا اور میرے سامنے پہنچ کر بولا۔ "آٹوگراف پلیز!"

میں دنگ رہ گیا۔ دیار غیر میں ہماری اتنی قدر دانی؟ پاکستان میں کوئی نوکری کو نہیں پوچھتا اور یہاں آٹوگراف مانگے جا رہے ہیں۔ دوسرا خیال ذہن میں بجلی کی طرح یہ کوندا کہ ہماری کس کارکردگی کی بنیاد پر ہم سے آٹوگراف مانگا جا رہا ہے...... بہرحال اگلے ہی لمحے یہ ساری غلط فہمی دور ہوگئی۔ آٹوگراف ہم سے نہیں ہمارے عین پیچھے کھڑے ظہیر صادق سے مانگا جا رہا تھا۔ ظہیر نے بھی اس عزت افزائی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور مسکراتے ہوئے آٹوگراف عنایت کر دیا۔

"آپ ظہیر عباس ہی ہیں ناں۔" بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

"آپ کو کوئی شک ہے؟" ظہیر نے بھاری آواز میں کہا۔

لڑکا تھینک یو کہتا ہوا واپس بھاگ گیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس صورتحال سے لطف اندوز ہوتا۔ مگر اب تو اندرونی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ جوں جوں ہم آرچرڈ روڈ کے قریب پہنچ رہے تھے۔ دل و دماغ میں کھلبلی بڑھتی جا رہی تھی۔ راکیش مجھے شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن اگر پرتاپ یا راج سنگھ اس کے آس پاس موجود تھے تو میرے لئے سخت مشکل ہو سکتی تھی۔ میں نے ایک سبز رنگ کی پی کیپ پہن رکھی تھی۔ چوڑے شیشوں والی رنگدار عینک لگا رکھی تھی اور شیو بھی پچھلے سات دن سے بڑھی ہوئی تھی۔ یہ حلیہ مکمل طور پر میری شناخت تو نہیں چھپا سکتا تھا۔ تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور تھا کہ "پہلی نظر" میں مجھے فوری طور پر پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ ایک سوال میرے ذہن میں بار بار یہ بھی اٹھ رہا تھا کہ اگر امریتا نے مجھے دیکھا اور پہچانا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ کیا وہ

خوفزدہ ہو جائے گی؟ مجھے پہچاننے سے انکار کر دے گی؟ یا پھر راکیش کو میرے بارے میں بتا دے گی؟

مجھے گہری سوچ میں گم دیکھ کر عرفات نے کہا۔ ”میرا شک پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ یہ معاملہ صرف لین دین کا نہیں ہے۔“ اس نے چند لمحے توقف کیا۔ اور بولا۔ ”کہیں یہ وہی کمانڈو کی میرا مطلب ہے دیوداس کی ٹریجڈی والا معاملہ تو نہیں؟“

”دیکھو خوامخواہ قیافے لگانے کی کوشش نہ کرو۔ اور اگر بالفرض کوئی ایسی بات ہے بھی تو میں اسے چھپانے کا حق رکھتا ہوں۔“

”بتانے کا حق بھی تو رکھتے ہو۔“ وہ اپنے نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ واقعی بہت موثر تھی۔

میں نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ابھی یہ موضوع چھوڑو پھر بات کریں گے۔“

اس دوران میں بس آ گئی۔ یہ ڈبل ڈیکر بس تھی۔ سنگاپور کی ڈبل ڈیکر بسیں مرسیڈیز کاروں کی طرح آرام دہ محسوس ہوئیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان بسوں میں عوام ہی نہیں خواص بھی بڑی بے تکلفی سے سفر کر رہے تھے۔ میں نے ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کو اپنے ہینڈ بیگ کے ساتھ بس میں سوار ہونے کیلئے قطار میں کھڑے دیکھا اور یہ صرف ایک مثال ہے۔



بس آرچرڈ روڈ پہنچی۔ چمکتی دمکتی فلک بوس عمارتوں کے درمیان راستہ ڈھونڈتے ہم سکائی ویو ہوٹل تک پہنچ گئے۔ ہم نے ریسپشن سے رجوع کیا۔ میں لابی میں بیٹھ گیا۔ عرفات نے جا کر سوئٹ نمبر 118 کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ فی الوقت اس سوئٹ میں ایک عمر رسیدہ ملائیشین جوڑا مصطفیٰ احمد اور مسز مصطفیٰ احمد قیام پذیر ہیں۔ رجسٹر سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ پچھلے تقریباً ڈیڑھ مہینے سے یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان سے پہلے یہ سوئٹ تھائی لینڈ کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے ہائر کر رکھا تھا۔ اور ان کے آفیشل دو اڑھائی ماہ تک یہاں قیام کرتے رہے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ راکیش کا جو ایڈریس شانتی کو ملا وہ غلط تھا۔ مایوسی کی لہر سی میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ لیکن ایڈریس میں سکائی ویو ہوٹل کا ذکر موجود تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ لوگ اس پندرہ منزل ہوٹل کے کسی اور حصے میں موجود ہوں۔ یا پھر ان مسٹر اینڈ مسز مصطفیٰ کا ہی راکیش سے کوئی تعلق ہو۔ پتہ نہیں کیوں میرے جی میں آئی کہ ایک بار اس ملائیشین جوڑے سے مل کر دیکھوں۔ میں نے عرفات سے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا۔ اور وہ مان گیا۔ ہم نے ظہیر کو وہیں چھوڑا اور بذریعہ لفٹ چھٹی منزل پر سوئٹ 118 پر پہنچ گئے۔ یہ فور اسٹار ہوٹل تھا۔ لیکن فائیو اسٹار کے معیار کو چھوتا ہوا نظر آتا تھا۔ راہداری کے دبیز قالینوں پر پاؤں دھرتے ہم مطلوبہ دروازے کے سامنے پہنچے۔ میں آبنوسی دروازے کے پاس لگی شاندار کال بیل کو دبانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ راہداری میں دو عورتیں نظر آئیں۔ دونوں نے ٹی شرٹس اور جین کی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ دونوں کی عمریں تیس اور چالیس کے درمیان تھیں۔ شکلیں بھی بالکل واجبی سی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ انڈین یا پاکستانی ہیں۔ وہ بھی شاید ہمارے بارے میں

یہی سوچ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جو عمر میں نسبتاً چھوٹی نظر آتی تھی ہمارے پاس آئی اور عرفات سے مخاطب ہو کر انگریزی میں بولی۔ ''آپ پاکستانی ہیں؟''

''الحمدللہ۔'' عرفات نے ترت جواب دیا۔

وہ دونوں خوش اخلاقی سے مسکرانے لگیں۔ ''ہم بھی پاکستانی ہیں۔ راولپنڈی سے تعلق ہے۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

''لاہور کے۔'' میں نے کہا۔

اس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے باتوں کا سلسلہ اتنی شدت سے شروع ہوا کہ ہم سوئٹ نمبر 118 کی کال بیل بجانا ہی بھول گئے۔ ہم ان کے ساتھ ہوٹل کی شاندار لابی میں آبیٹھے۔ یہاں کی دیوار گیر کھڑکیوں سے جگمگاتا ہوا سنگاپور بہت دور تک دکھائی دیتا تھا۔ سمندر میں تیرتے ہوئے رنگین نقطے کشتیوں اور بجروں کی نشاندہی کرتے تھے۔ دونوں خواتین کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ہوٹل کے کوکنگ کے شعبے میں کام کرتی ہیں اور عرصہ دو سال سے یہیں موجود ہیں۔ اسی فلور کے عقبی حصے میں ان کا رہائشی سوئٹ بھی تھا۔

راولپنڈی اور لاہور کی باتوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ دونوں شہروں کے ہر ہر علاقے اور سڑک کو یاد کیا گیا۔ ان میں سے جو خاتون قدرے چھوٹی نظر آتی تھیں ان کا نام زیب النساء تھا۔ ان کی ساتھی خاتون ریحانہ انہیں زیب کہہ کر پکارتی تھی۔ اچانک جیسے زیب کو کچھ یاد آیا۔ وہ بولی۔ ''آپ تو سوئٹ نمبر 118 کی بیل بجانے جا رہے تھے شاید...... وہ کام تو وہیں رہ گیا۔''

''ہاں...... وہ بس۔'' میں ہکلا کر چپ ہو گیا۔

''بھئی! ہم تو آپ کے اپنے ہیں۔ ہم سے تو کچھ نہ چھپائیں۔ کوئی مسئلہ ہے تو بیان کریں؟'' اور میں نے مسئلہ بیان کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں یہاں ایک انڈین راکیش کی تلاش ہے۔ میرے پاس اس کا ایڈریس ہے جو راکیش کے ایک دوست نے دیا ہے۔ میں نے ایڈریس والی چٹ زیب اور ریحانہ کے سامنے کر دی۔ وہ دونوں دھیان سے چٹ دیکھتی رہیں۔ زیب کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے تراشیدہ بالوں کو ہلکا سا جھٹکا

دیا اور بولی۔ ''کہیں اس لڑکے کا پورا نام راکیش پانڈے تو نہیں۔ یہاں ایک لڑکا پانڈے کے نام سے رہتا تھا۔ اور جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ سوئٹ نمبر 118 یا 117 میں ہی رہتا تھا۔''

ریحانہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کا نام راکیش ہی ہوگا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ آر پانڈے لکھتا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ خود اس کا نام لکھا ہوا دیکھا تھا۔ لیکن یہ تو ایک سال سے بھی زیادہ پرانی بات ہے۔ اب وہ یہاں نہیں رہتا۔ ہاں دو چار بار اسے مسز فو کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔''

''یہ مسز فو کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں لانڈری کی انچارج ہے۔ بڑی تیز لڑکی ہے۔'' ریحانہ کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھرے۔

''کیا راکیش مسز فو سے......؟''

''ہاں۔'' زیب نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''وہ شوہر کی پرواہ نہیں کرتی۔ اس کی مار پیٹ سے بھی نہیں ڈرتی۔ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی کئی مردوں سے ملتی جلتی ہے۔ یہ پانڈے بھی ان میں سے ایک تھا۔ ایک بار مسز فو سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو لاتیں اور گھونسے مارے تھے۔ پانڈے یہاں پھنے خانوں کی طرح رہتا تھا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ تو ''جان یانگ'' والا معاملہ ہو گیا۔ ورنہ اس نے یہاں اپنی ٹھیک ٹھاک دہشت بنائی ہوئی تھی۔

''جان یانگ کا نام تو شاید میں نے بھی سنا ہوا ہے۔'' عرفات چونک کر بولا۔ ''کوئی بہت بڑا تھائی سیٹھ ہے۔ بڑا اثر و رسوخ بھی ہے اس کا۔''

''ہاں...... ہاں وہی۔'' زیب نے تائید کی۔ ''بعض لوگ تو اسے سنگاپور کے امیر ترین غنڈوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس نے یہاں اسی فلور پر اسی لابی کے سامنے پانڈے کی یادگار ٹھکائی کی تھی۔ مار مار کر حشر کر دیا تھا۔ یہ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ بس تین چار مہینے ہی ہوئے ہیں۔''

''مسز فو والا معاملہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یہ کوئی اور جھگڑا تھا۔ لین دین کا تنازع تھا۔ پانڈے کو مارنے پیٹنے کے

بعد جان اسے ٹانگوں سے گھسیٹتا ہوا لفٹ کی طرف لے گیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا...... ہوٹل کے مالکوں میں سے ایک دو بندوں نے بیچ میں آ کر اس کی جان بچائی تھی۔ بعد میں ایک بند کمرے میں لمبی چوڑی بات ہوئی تھی اور معاملہ طے ہوا تھا۔ اس واقعہ کے بعد پانڈے کم از کم ہمیں تو یہاں کہیں نظر نہیں آیا۔ کیوں ریحانہ؟ زیب نے اپنی ساتھی سے پوچھا۔

''ہاں ہم نے تو نہیں دیکھا۔ جتنی بے عزتی اس کی ہو چکی تھی' اس نے آنا بھی نہیں تھا۔''

عرفات کے پوچھنے پر زیب نے ہمیں پانڈے کا حلیہ بتانا شروع کر دیا۔ مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے پانڈے یا راکیش پانڈے کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہاں زیب صاحبہ کی باتوں سے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ اونچا لمبا اسمارٹ سا شخص ہے۔ ایک اور کام کی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ کبھی کبھار ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر سکھ بھی پانڈے کو ملنے آتا تھا۔ اس کی آنکھیں نشے کی وجہ سے اکثر سرخ ہوتی تھیں۔ یہ ادھیڑ عمر سکھ کا تذکرہ پرتاپ سنگھ کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ میرے دل میں امید کی ڈور بندھنے لگی۔ میں نے زیب سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے اگر ہم مسز فو سے ملیں تو پانڈے کے بارے میں کچھ اور معلومات مل سکتی ہیں؟''

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''وہ ہے تو یہیں پر...... لیکن موڈی لڑکی ہے۔ پتہ نہیں کیسے بات کرے۔ بہرحال اگر تم ضروری سمجھتے ہو تو مل لو۔ میرا خیال ہے کہ پانڈے کے بارے میں مسز فو کے سوا شاید ہی تمہیں کوئی اور شخص کچھ بتا سکے۔ وہ بہت کم آمیز بلکہ کسی حد تک پراسرار بندہ ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''تم مسز فو کو یہ ہرگز نہیں بتانا کہ اس کے بارے میں تمہیں ہم نے آگاہ کیا ہے۔''

''آپ اس حوالے سے بے فکر رہیں۔'' میں نے کہا۔

میں نے اور عرفات نے آپس میں مشورہ کیا۔ پھر عرفات وہیں لابی میں بیٹھا رہا جبکہ میں' زیب اور ریحانہ کے بتائے ہوئے سوئٹ پر پہنچ گیا۔ آزاد خیال مسز فو اسی سوئٹ میں رہتی تھی۔ اس کا نام ہاؤسنگ معلوم ہوا تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس قسم کے اندیشہ ناک مواقع پر اکثر میں اور ارباز ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن آج اس

نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے بیل بجائی۔ اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ زیب نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت مسز فو سوئٹ میں اکیلی ہے۔ اس کا شوہر کچن کے عملے میں شامل ہے اور ویک اینڈ اسپیشل ڈنر کے سلسلے میں مصروف ہے۔

تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور مجھے اپنے سامنے مسز فو نظر آئی۔ آنکھیں جیسے چند لمحوں کیلئے چندھیا گئیں۔ اسے ویسا ہی پایا جیسا اس کے بارے میں سنا تھا۔ وہ اس کم سے کم لباس میں تھی جو ایک واہیات عورت پہن سکتی ہے۔ ایک باریک سا گاؤن اس نے خانہ پری کیلئے کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ وہ اپنے نقوش سے تھائی لگتی تھی۔ عمر میرے اندازے کے مطابق پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ نقوش اچھے تھے۔ اس نے اپنی گردن اور سینے کے درمیانی علاقے میں ایک ''ٹیٹو'' بنوا رکھا تھا۔ اس میں ایک سانڈ کو سر جھکا کر کسی نادیدہ شے پر جھپٹتے دکھایا گیا تھا۔ اس ٹیٹو کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ آ بیل مجھے مار۔ سرخ کپڑا تو یہ لڑکی خود تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی ''سانڈ'' مشتعل ہو سکتا تھا۔ یا پھر اس ٹیٹو کا مطلب یہ تھا کہ کوئی مجھ سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے ورنہ میں اس سانڈ کی طرح بپھر سکتی ہوں۔

وہ پہلے تھائی لہجے میں بولی لیکن جب میں سمجھ نہیں پایا تو اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔ ''میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں؟''

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہے۔ صرف ایک شخص کے بارے میں آپ سے کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

''کون شخص؟''

''پانڈے صاحب۔ ان سے ایک مرتبہ جالندھر میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے اصرار سے کہا تھا کہ کبھی سنگاپور آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ مستقل طور پر ہوٹل سکائی ویو میں قیام پذیر ہیں۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' لڑکی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''بات تو کافی پرانی ہے۔ سال سے اوپر ہو گیا ہے۔''

"تمہیں میرے بارے میں کس نے بتایا کہ میں اسے جانتی ہوں؟"

"در......دراصل انہوں نے خود ہی باتوں میں ذکر کر دیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح ہیں۔ انہوں نے آپ کا نام بھی بتایا تھا جو میرے ذہن میں رہ گیا۔"

مسز فو نے مجھے سر سے پاؤں تک تیز نظروں سے گھورا۔ جیسے پورے جسم اور دماغ کا ایکسرے لے رہی ہو۔ اس کی نگاہ واقعی ایکس ریز جیسی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ ایک لمحے میں بھانپ گئی ہے کہ میں یہاں پانڈے کے خیر خواہ کی حیثیت سے نہیں۔ بد خواہ کی حیثیت سے موجود ہوں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"توقیر......احمد" میں نے پہلے سے سوچا ہوا نام بتایا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"لاہور سے۔"

"یعنی پاکستانی ہو۔ لیکن تم تو کہہ رہے ہو پانڈے سے جالندھر میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"در......دراصل' میں ان دنوں انڈیا گیا ہوا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں کی ایکس ریز مجھ پر پھینکیں۔ اس کی سرد مہری کچھ اور بڑھ گئی۔ شکستہ انگریزی میں بولی۔ "یہ بہت بڑا ہوٹل ہے۔ یہاں کئی پانڈے آتے اور جاتے ہیں۔ میں کسی خاص پانڈے کو نہیں جانتی۔ پھر وہ ایک لحہ توقف کر کے بولی۔ "تم شریف آدمی لگتے ہو۔ تمہیں طریقہ کار معلوم ہونا چاہئے۔ ایسی معلومات کیلئے ریسپشن سے رجوع کیا جاتا ہے' لوگوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹائے جاتے۔ تم تو پانڈے کو ایسے ڈھونڈ رہے ہو......"

اسی دوران میں وہ تھوڑا سا چونکی اور بات روک دی۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ میرے عقب میں ایک اٹھائیس تیس سالہ شخص کھڑا تھا۔ وہ COOK کے لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں دو بڑے لفافے تھے۔ اس نے مجھے سرتاپا گھورا۔ پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر مقامی زبان میں کچھ بولا۔ لڑکی نے بھی جلے کٹے انداز میں

جواب دیا۔ اس شخص نے پھر ملائی میں کوئی بات کہی۔ اس میں پانڈے کا لفظ بھی آیا۔ غالباً یہ شخص ہاؤ سنگ کا شوہر مسٹر فو تھا۔ اور بیوی سے پوچھ رہا تھا کہ پانڈے کی کیا بات ہو رہی تھی' بیوی یعنی ہاؤ سنگ نے ایک بار پھر جلے کٹے لہجے میں کچھ کہا۔ نووارد اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور لفافوں سمیت اندر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہاؤ سنگ نے اپنے جسم پر گاؤن ذرا درست کیا۔ اور بولی۔ "کیا میں اب تم سے اجازت لے سکتی ہوں۔" لہجے میں طنز تھا۔

"ج......جی......میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"او کے......گڈ بائی۔" اس نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

میری ٹانگوں میں ہلکی سی لرزش نمودار ہو چکی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا میں لفٹ کی طرف بڑھا اور پھر سے چھٹے فلور پر آ گیا۔ یہاں عرفات اکیلا بیٹھا تھا اور ٹی وی پر ایک فلپائنی چینل دیکھ رہا تھا۔ "اس نے بتایا کہ دونوں خواتین ابھی دو منٹ پہلے چلی گئی ہیں۔" انہیں کہیں پہنچنا تھا۔ جاتے جاتے وہ عرفات کو اپنا کارڈ دے گئی تھیں۔

"تمہارا لٹکا ہوا چہرہ بتا رہا ہے کہ بات نہیں بنی۔" عرفات نے قیافہ لگایا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"اب کیا کریں؟ کہو تو ریسپشن سے ریکارڈ وغیرہ دیکھنے کی کوشش کریں۔ ویسے یہ لوگ اتنی آسانی سے ریکارڈ دکھائیں گے نہیں۔"

"تم تو کوشش سے پہلے ہی ہار رہے ہو۔"

"بھئی اپنی کرکٹ ٹیم کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا ہے نا ہم پر بھی۔"

ہم گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ یہاں ظہیر موجود تھا اور حسب توقع ایک انڈین لڑکی سے شرما شرما کر بات کر رہا تھا۔ غالباً یہاں اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ وہ ظہیر عباس نہیں ہے۔ اب لڑکی ایشین بریڈ مین کے ساتھ اس کی حیرت انگیز مشابہت کی تعریف کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ گیا اور لڑکی سے مصافحہ کر کے ہماری طرف آ گیا۔ ہم وہیں کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ استقبالیہ والوں سے کس طرح بات کی جائے۔ اسی دوران میں میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میں چونک گیا۔ یہ وہی COOK تھا جس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ مسٹر فو ہے۔ وہ اب اپنی مخصوص

ٹوپی کے بغیر نظر آ رہا تھا۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ سے ملی اس نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور پھر درمیانی رفتار سے چلتا ہوا ہوٹل کے داخلی دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے ظہیر کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور عرفات کے ساتھ COOK کے پیچھے گیا۔ وہ ہوٹل سے باہر فٹ پاتھ پر جا رہا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر ایک سٹیشن ویگن کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا اور ہمیں بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد ہم وین میں چلے گئے۔ عقبی اسکرین پر پردہ کھچا ہوا تھا۔ وین میں سے مچھلی کی باس آتی تھی اور اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کچن کے کاموں کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

COOK نے اپنا تعارف کرایا تو اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ یہی مسٹر فو ہے۔ مسٹر فو کا پورا نام خاصا مشکل تھا۔ اس نام کا ایک حصہ انگلش اور ایک چینی تھا۔ مسٹر فو نے ہم سے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ ہم پانڈے سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ ہمیں مسٹر فو سے دوسرے زاویے سے بات کرنی چاہئے۔ میں نے کہا۔

”محترم! بات یہ ہے کہ پانڈے کے ساتھ ہمارا لین دین کا معاملہ چل رہا ہے۔ کچھ باتیں طے ہو چکی ہیں لیکن کچھ ہونی ہیں۔ ہم کافی دنوں سے کوشش کر رہے ہیں لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ میرے بڑے بھائی صاحب نے اب مجھے اسپیشل طور پر یہاں بھیجا ہے۔“

”اندازاً کتنی رقم کا چکر ہے؟“ فو نے پوچھا۔ اس کی انگریزی بیوی سے بہتر تھی۔

”تقریباً ایک لاکھ سنگاپوری ڈالر سمجھ لیں۔“

”اوہ خاصی بڑی رقم ہے۔“ فو نے کہا۔ پھر اس نے ہم سے اس معاملے کی تھوڑی سی تفصیل پوچھی۔ آخر میں سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہنے لگا۔ ”یہ پانڈے اچھا بندہ نہیں ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ جتنا تم نے سوچ رکھا ہے اس سے کہیں زیادہ برا ہو۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا غلط کار لوگوں میں ہے۔ اکثر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لڑکیوں کا کاروبار کرتا ہے۔“

مسٹر فو کا آخری فقرہ میرے سر پر بم کا دھماکہ ثابت ہوا۔ یوں لگا جیسے میرے

ذہن کی اتھاہ گہرائی میں موجود کوئی خدشہ آتش فشاں کی طرح پھٹ گیا ہے۔ میں نے لرزاں لہجے میں کہا۔

”آپ کا مطلب ہے..... عصمت فروشی۔“

مسٹر فو نے اپنا نیم گنجا سر تائیدی انداز میں ہلایا۔ ”تم نے دیکھا ہی ہوگا۔“ یہ خبیث شکل صورت کا اچھا ہے۔ لڑکیوں کو جلدی سے پھانس لیتا ہے۔ ان کو اپنی امارت اور شرافت کے سبز باغ دکھاتا ہے اور پھر اپنی راہ پر لگا لیتا ہے۔ یہ خود بھی پرلے درجے کا عیاش ہے اور ہوس کاری کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ تمہیں پتہ ہے عورتوں کی عقل تو ویسے بھی گھاس چرنے گئی ہوتی ہے۔ مرد کے تعریفی فقرے انہیں اسی طرح دھکیل کر ”بستر“ تک پہنچاتے ہیں جس طرح تیز ہوا سوکھے پتوں کو اڑا کر ندی میں پھینکتی ہے۔“

میں سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ عرفات میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہوں میں امریتا کی بھولی بھالی..... اجلی صورت تھی۔ مسٹر فو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آر پانڈے کو میں نے آخری بار کوئی بیس دن پہلے دیکھا ہے۔ لیکن یہاں نہیں۔ یہاں سے کافی دور۔ یہاں آرچرڈ روڈ سے آگے نکلیں تو دو اڑھائی کلومیٹر کے فاصلے پر رائفل پیں آتا ہے۔ وہاں سے آگے سٹی ہال آئے گا..... اور پھر بگیز BUGGIS' سٹی ہال اور بگیز کے درمیان ایک نیا ہوٹل نیو براڈ وے بنا ہے۔ میں نے پانڈے کو اسی ہوٹل کی پارکنگ میں دیکھا تھا۔ اب معلوم نہیں وہ وہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔ یا وہاں رہ رہا تھا..... اس کے ساتھ ایک اسمارٹ سی انڈین لڑکی تھی۔ لڑکی کے بال غیر معمولی طور پر لمبے تھے اور دور ہی سے چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ میں بھی گاڑی کو ذرا آہستہ کرنے کے بعد سیدھا آگے نکل گیا۔ اس وقت یہی وین تھی میرے پاس۔“

میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اب تک اگر میرے دل میں پانڈے کے حوالے سے کوئی شک موجود بھی تھا تو رفع ہو گیا تھا۔ یہ پانڈے یا راکیش پانڈے ہی امریتا کا پتی دیو تھا۔ اور اسے جالندھر کے گجرال نگر سے بیاہ کر یہاں سمندر پار سنگاپور کی چمکتی روشنیوں میں لایا تھا۔ مسٹر فو نے راکیش پانڈے کی ساتھی لڑکی کا جو

حلیہ بتایا تھا اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ مسٹر فو نے بھی ہم سے وہی بات کہی جو اس سے پہلے زیب اور ریحانہ نے کہی تھی۔ مسٹر فو نے کہا کہ اگر پانڈے سے ہماری ملاقات ہوتی ہے تو ہم اسے یہ ہرگز نہیں بتائیں کہ اس کا اتہ پتہ کہاں سے معلوم ہوا ہے؟ ہم نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔

فو کے لب و لہجے میں راکیش کیلئے رقابت جھلکتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے جو کچھ بتایا تھا۔ اس میں سچائی نظر آتی تھی۔ راکیش کیلئے فو کی رقابت کی وجہ بھی ہم سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آنٹی زیب اور ریحانہ ہمیں اس بارے میں سب کچھ بتا چکی تھیں۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہم بذریعہ ٹیکسی کار ''سٹی ہال'' کی طرف روانہ ہوئے۔ ٹیکسیاں اور ٹیکسی ڈرائیور سنگاپور کے شایان شان تھے۔ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور کا نام ناصر تھا۔ وہ ملائیشین مسلمان تھا اور دو حج کر چکا تھا۔ وہ ٹیکسی چلانے کے ساتھ ساتھ ہمیں سنگا پور کا تاریخ جغرافیہ بھی بتاتا رہا۔ وہ اس زمانے کی بات کر رہا تھا جب سنگاپور فلک بوس عمارتوں کا جدید شہر نہیں۔ بس مچھیروں کی ایک بستی تھا...... پھر ایک برطانوی یہاں پہنچا تھا اور اس نے شہر کی داغ بیل ڈالی تھی...... وہ بول رہا تھا۔ ٹیکسی چکنی شفاف سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ ہمارے اردگرد ویک اینڈ کی مستی میں ڈوبا ہوا' چمکتا دمکتا شہر تھا۔ نائٹ کلبوں' شراب خانوں اور جواء خانوں کی رونق عروج پر تھی۔ مگر نظم و ضبط کا دامن کہیں بھی اہل شہر کے ہاتھ سے پھسلا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ جوں جوں ہم منزل سے قریب پہنچ رہے تھے۔ میرے اعصاب کشیدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن سچ کہتے ہیں کہ جب بندہ ہمت کر کے چل پڑتا ہے تو قدرت ہمت بھی دے ہی دیتی ہے۔ چند ہفتے تک میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ارباز کے بغیر میں سنگاپور پہنچوں گا اور راکیش کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم نیو براڈوے ہوٹل کے مین دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ یہ زیادہ بڑا ہوٹل نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ مستقبل قریب میں اس کی مزید تعمیر ہوگی اور مزید اوپر کی طرف جائے گا۔ ہم استقبالیہ پر پہنچے۔ خوش خلق خواتین نے ہمارا استقبال کیا۔ عرفات نے پوچھا۔ ''یہاں پانڈے یا آر پانڈے کے نام سے کوئی

صاحب مقیم ہیں۔''

لڑکی نے جلدی سے رجسٹر پر نگاہ دوڑائی اور بولی۔ ''سیکنڈ فلور' روم نمبر 81' جناب مسٹر اینڈ مسز آر پانڈے۔''

میری رگوں میں لہو اچھل کر رہ گیا۔ میں اس شخص کے بہت نزدیک تھا۔ جو متوقع طور پر جالندھر کے باؤجی کو دھوکا دے کر ان کی لاڈلی بیٹی کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ اب یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اگر پرتاپ یا راج سنگھ میں سے بھی کوئی یہاں پایا جاتا تھا تو پھر میرے لئے مزید خطرہ تھا۔ میں نے سبز پی کیپ اپنی پیشانی پر کچھ اور جھکا لی اور اردگرد سے چوکنا ہو گیا۔ ہوٹل لابی کے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھ کر ہم نے آپس میں مشورہ کیا۔ پھر میں نے عرفات کو جائزہ لینے کیلئے اوپر بھیجا۔ عرفات چلا گیا۔ میں اور ظہیر اس کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم اتنی جلدی امریتا کے قریب پہنچ گئے ہیں۔

ہوٹل کے ڈانسنگ فلور پر مخمور نوجوان جوڑے تھرک رہے تھے۔ آرکسٹرا انہیں دھواں دھار اسپورٹ فراہم کر رہا تھا۔ در و دیوار ڈرمز کی تھرتھراہٹ سے گونجتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ''لائیو'' رومانس دیکھا۔ جوڑے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے' کچھ جوشیلے خواتین و حضرات اس سے بھی تھوڑا آگے بڑھ رہے تھے۔

عرفات دو منٹ کے اندر ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ اور لق و دق پیشانی کسی اندرونی جوش کے سبب دمک رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے ساتھ آؤ'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھایا اور اپنے ساتھ کھینچتا ہوا قالین پوش سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''یار! بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے۔ میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ ''بالکل اکیلی بیٹھی ہے۔ ڈرو مت آ جاؤ۔''

جونہی ہم نے سیکنڈ فلور پر قدم رکھا۔ میری حیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی۔ تقریباً پانچ میٹر کے فاصلے پر امریتا بیٹھی تھی۔ امریتا کور جو جالندھر کے گلی کوچوں میں کئی

روز ہمارے ساتھ رہی تھی۔ وہ گلابی رنگ کی شاندار بنارسی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو خم دے کر گود میں رکھا ہوا تھا ورنہ وہ شاید فرش پر جھاڑو پھیرنے لگتے۔ امریتا صوفے پر بیٹھی تھی اور ایسے رخ پر تھی کہ مڑے بغیر ہمیں دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے سامنے ایک میگزین تھا۔ ہم ایک ستون کے ساتھ کھڑے تھے۔

امریتا کو دیکھنے اور پہچاننے کے بعد میں نے فوراً عرفات کا بازو کھینچا اور اسے لے کر واپس نیچے گراؤنڈ فلور کی لابی میں آ گیا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

”وہی ہے نا؟“ عرفات نے آنکھیں چمکائیں۔

”ہاں۔“

”اب کیا کرنا ہے؟“

”ذرا سوچنے دو۔“ میں نے اپنے کشیدہ اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم میں سوچنے کی صلاحیت ہوتی تو ایسا کرتے ہی کیوں۔ تشریف لاتے ہی ’’چکر‘‘ میں پھنس گئے ہو اور ہم معصوموں کو بھی پھنسا دیا ہے۔“ اس نے فقرہ کسا۔

تھوڑی دیر کے مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ میں یہیں لابی کے اس نیم تاریک گوشے میں بیٹھتا ہوں اور کوک وغیرہ پیتا ہوں۔ ظہیر اور عرفات اوپر جاتے ہیں اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے امریتا سے بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ اس گفتگو سے امریتا کے ارگرد کی صورتحال کا کچھ پتہ چل جاتا۔

عرفات اور ظہیر چلے گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ سافٹ ڈرنک کے ساتھ میں نے کچھ اسنیکس منگوا لئے۔ شراب و شباب کا ہنگامہ دم بدم زور پکڑ رہا تھا۔ پینے والوں کے ساتھ پلانے والے یعنی ویٹرز بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ شراب خانہ خراب کی نحوست اچھے بھلے خوبصورت چہروں کی خوبصورتی میں کٹوتی کر رہی تھی۔ ایک لڑکی ایک نوجوان کے فحش اشاروں کا جواب رقص کے دوران میں ہی دے رہی تھی اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی...... میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک انگلش اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا اور اس میں مگن نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

عرفات اور ظہیر کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی۔ یہ خوش آئند دیر تھی۔ مجھے

اندازہ ہو رہا تھا کہ امریتا سے ان کی بات چیت چل نکلی ہے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد عرفات میرے پاس آیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”دائیوں سے پیٹ کبھی چھپے نہیں ہیں۔ اگر تم خود سے مجھے سب کچھ بتا دیتے۔ تمہاری کتنی عزت افزائی ہوتی۔“

”میں تمہاری عزت افزائی کے بغیر بھی عزت دار ہوں اور میں جانتا ہوں امریتا نے تمہیں اپنا نام بتا دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ جالندھر سے راکیش کے ساتھ بیاہ کر یہاں آئی ہے......“

”لہٰذا میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ راکیش پانڈے ہی اپنے کمانڈو کا رقیب روسیاہ ہے۔“ عرفات نے میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”اب مجھے فٹافٹ یہ بتاؤ کہ تم کس چکر میں یہاں وارد ہوئے ہو؟ کیا اس بھولی بھالی سندر ناری کو اس کے پتی سے طلاق دلوانے کا ارادہ ہے؟ یا کوئی اور معاملہ ہے؟“

”یہ سب باتیں بھی تمہیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں لہٰذا مجھ سے پوچھ کر ٹائم ضائع مت کرو۔ مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہوئی ہے اس سے؟“ میں نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس نے گہری سانس لے کر شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”بات یہ ہوئی ہے کہ ہم اوپر گئے تو وہ ظہیر کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ شاید ظہیر عباس ہی سمجھ رہی تھی۔ ظہیر بھی منہ ٹیڑھا کر کے مسکرایا۔ وہ چونک سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم اس کے ساتھ میز پر جا بیٹھے۔ دو تین منٹ تو اس کی یہ غلط فہمی دور کرنے میں لگے کہ یہ ظہیر عباس نہیں ہے۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ خلاصہ ان باتوں کا یہ ہے کہ امریتا کور اپنے پتی راکیش سنگھ عرف پانڈے کے ساتھ بیس پچیس روز سے یہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ خوشگوار اتفاق یہ ہے کہ پتی پانڈے صاحب ہوٹل میں نہیں ہیں۔ وہ بارڈر پار کر کے ایک دن کیلئے ’’جوہر بارو‘‘ گئے ہوئے ہیں۔ کل سہ پہر چار بجے سے پہلے نہیں لوٹیں گے۔ پانڈے کا کوئی ابا یا چاچا‘ ماماں بھی یہاں نہیں ہے۔“

”واقعی؟“

”سو فیصد واقعی۔“ عرفات نے یقین سے کہا۔ پھر کش لے کر بولا۔ ”میں نے امریتا کو بتایا ہے کہ ہمارا ایک لاہوری دوست بھی ہمارے ساتھ ہے۔ نیچے لابی میں کسی

سے بات کر رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ تم بھی چلو' موقع اچھا ہے۔ جو بات اس سے کرنی ہے کر لو۔"

"اور اگر اوپر سے کوئی آ گیا تو؟"

"تو قتل ہو جانا اس کے ہاتھوں' شہیدوں میں نام لکھا جائے گا۔ کمانڈو ناشتے کے بعد ہر روز تمہارے مزار پر اگربتیاں جلانے جائے گا۔"

میں نے حوصلہ جمع کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر خوشگوار اتفاق کے تحت امریتا کا پتی دیو واقعی سنگاپور میں موجود نہیں تھا تو پھر اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ میں نے پی کیپ اتار کر جیب میں ٹھونس لی' عینک بھی اتار لی.....اور عرفات کے ساتھ سیکنڈ فلور کی طرف چل دیا۔

امریتا' ظہیر کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے بڑے دھیان سے مجھے دیکھا اور پھر زرد رنگ اس کے چہرے پر بکھرتا چلا گیا۔ ایک لمحے کیلئے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں چلی جائے گی اور دروازہ اندر سے بند کر لے گی۔ شاید اٹھنے کیلئے اس نے اپنے جسم کو حرکت بھی دی تھی مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اسے ایسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کی موجودگی کا پتہ ابھی چلا ہے۔ اور میں اتفاقاً ہی یہاں آ موجود ہوا ہوں۔

"ست سری اکال امریتا! تم یہاں۔" میں نے اداکاری کی کوشش کی۔

اس نے ہونٹوں کی جنبش سے جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے عرفات اور ظہیر کی طرف دیکھنے لگی۔ "آپ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں؟" عرفات نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دیا اور کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"یہ .....یہ کیا معاملہ ہے دای!؟ تت.....تم یہاں کیسے؟ اور یہ تمہارے دوست؟ آ.....آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔" وہ ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ اب مجھ سے زیادہ عرفات اور ظہیر کی موجودگی اسے پریشان کر رہی تھی۔

میں نے اس ڈرامے کو زیادہ طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور عرفات سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں نیچے جا کر بیٹھو اور اگر کہیں گھومنا پھرنا ہے تو گھوم

پھر لو۔ میں یہیں پر ہوں۔" وہ اٹھے اور امریتا سے سلام کرتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ امریتا اب بھی خوفزدہ نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ ابھی کسی کونے سے ارباز بھی نکل آئے گا۔ اور اس کے سامنے آن بیٹھے گا۔

اور اس کا ڈر واقعی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ اگر خدانخواستہ پرتاپ' راج یا ان کا کوئی ایسا ساتھی جو مجھے شکل سے جانتا تھا۔ مجھے یہاں دیکھ لیتا تو کیا آفت آتی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "میرا دماغ چکرا گیا ہے۔ تم یہاں کیسے پہنچے؟ اور کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"اور کوئی نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں اور اس بات کی پوری تسلی کر کے آیا ہوں کہ تمہارے اردگرد کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو مجھے صورت سے جانتا ہو۔"

"ان دونوں لڑکوں کو تم نے ہی یہاں بھیجا تھا؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ امریتا کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خوبصورت لیکن خشک لبوں پر زبان پھیری اور کہنے لگی۔ "تم کسی اور کام سے آئے ہو یا صرف......؟"

"صرف تم سے ملنے۔" میں نے بڑے جذب کے ساتھ اس کی بات مکمل کی۔

اس کی سیاہ آنکھوں کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ "کیوں؟"

"اس "کیوں" کا جواب تم خود سے پوچھو۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے باؤجی اور تمہارے دوسرے خیر خواہ کتنے پریشان ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"جب تم لوگ جالندھر سے رخصت ہوئے تم نے باؤجی سے وعدہ کیا تھا کہ ہر روز ٹیلیفون کرو گی۔ اب کئی ہفتے گزر گئے تمہارا فون نہیں آیا۔ بس ایک بار مختصری کال تم نے کی وہ بھی ادھوری چھوڑ دی۔ مجھے جالندھر کی ساری صورتحال کا پتہ لاہور میں چلتا رہا ہے......"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ "مجھے لگتا ہے تمہاری جانکاری درست نہیں ہے۔ راکیش ہر دوسرے روز باؤجی اور انکل پرتاپ کو فون کر رہے ہیں۔"

"وہ انکل پرتاپ کو کر رہا ہو گا لیکن باؤجی کو کوئی فون نہیں ملا' تمہارا اور نہ

راکیش کا۔"

امریتا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "تم کیسی باتیں کر رہے ہو' کیا راکیش جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"میں تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکتا امریتا۔ لیکن یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ باؤجی کو کوئی فون نہیں ملا۔ اگر تمہیں میری بات پر بھروسا نہیں تو ابھی انڈیا فون کر کے دیکھ لو۔"

امریتا کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ "یہ...... نہیں ہو سکتا...... میں نہیں جا سکتی۔"

"کہاں نہیں جا سکتی؟"

"فون ایکسچینج...... اوورسیز کال صرف وہاں سے ہی ہو سکتی ہے۔"

"تمہارے جانے میں کیا ڈر ہے؟"

"بب ...... بس کچھ ہے۔ میں نہیں جا سکتی۔ لیکن مجھے پورا وشواش ہے کہ راکیش باؤجی کو فون کرتے رہے ہیں۔ وہ مجھے سب کچھ بتاتے رہے ہیں۔"

"ایسا نہیں ہوا امریتا۔"

وہ ایک دم چڑ سی گئی۔ "کیا تم پاکستان سے مجھے صرف یہ بتانے کیلئے آئے ہو کہ راکیش نے باؤجی کو فون نہیں کئے۔"

میں نے گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں امریتا! میں تمہیں اور بھی بہت کچھ بتانے آیا ہوں۔ کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا جاننا تمہارے لئے بہت ضروری ہے۔"

اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ "کیا تمہیں ارباز نے بھیجا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیوں؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔ اس سوال میں ایک شادی شدہ عورت کے سارے اندیشے جھلک رہے تھے۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "اس لئے امریتا! کہ ارباز اب بھی تمہارا خیر خواہ ہے۔ تمہارے اچھے برے کے بارے میں سوچتا ہے۔ تمہاری خوشیوں سے اس کا ناتا نہ سہی لیکن تمہارے دکھوں سے اس کا واسطہ ضرور ہے۔ اسے لاہور میں تمہارے پتا کی پریشانیوں

کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ ایک دم بے قرار ہو گیا۔ شاید...... شاید وہ خود یہاں چلا آتا لیکن اس خیال سے کہ تم اس سے کوئی غلط مطلب نہ لے لو۔ اس نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا' تم کن پریشانیوں کی بات کر رہے ہو۔"

"تمہارے پتا جی کی پریشانیوں کی۔ انہیں تمہارے پتی دیو کے حوالے سے کچھ باتیں بتائی گئی ہیں اور یہ ایسی باتیں ہیں امریتا جو کسی بھی باپ کا سکھ چین برباد کر سکتی ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ہفتوں گزر جانے کے بعد بھی تم سے کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ انکل پرتاپ اور راج وغیرہ بھی کہیں نہیں مل رہے۔ تمہارے باؤجی انہیں جگہ جگہ ڈھونڈ چکے ہیں۔"

"واہگرو یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ سر پکڑ کر بولی۔ "اس طرح بات کا بتنگڑ کیوں بنایا جا رہا ہے؟"

"میں جانتا ہوں میں ایک غیر بندہ ہوں امریتا! اگر تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ غلط بیانی کر رہا ہوں تو کسی بھی طرح جالندھر میں باؤجی یا اپنے کسی دوسرے عزیز سے رابطہ کر کے دیکھ لو۔"

وہ بہت دیر تک سر ہاتھوں میں پکڑے گم صم بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ اس کے غیر معمولی لمبے بال ننھے بچے کی طرح بل کھا کر اس کی گود میں آرام کر رہے تھے۔ غالباً ان بالوں کو کسی خاص کنڈیشنر سے ٹریٹ کیا گیا تھا۔ یہ پہلے سے زیادہ چمکیلے نظر آتے تھے۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "دای! بات یہ ہے کہ...... راکیش یہاں ایک مشکل کا شکار ہو گئے ہیں۔ لین دین کا کوئی پرانا تنازع ہے جس کی وجہ سے ایک مقامی بندہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ خاصا بااثر شخص ہے۔ بیس پچیس دن پہلے راکیش کے ساتھ اس کا باقاعدہ جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ راکیش اس سے لڑنا نہیں چاہتے اس لئے خاموشی کے ساتھ مجھے یہاں لے آئے ہیں۔ سنگاپور میں راکیش کے ایک دو دوستوں کے سوا کسی کو پتہ نہیں کہ ہم کہاں ہیں؟ وہ صرف انڈیا فون کرنے کیلئے ہوٹل

سے باہر جاتے رہے ہیں اور وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ۔ آج پہلی بار وہ کہیں دور گئے ہیں۔ وہ اپنے وکیل کے ساتھ مل کر ایک دو دن میں قانونی کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں......"

امریتا نے جھگڑے کی بات کی تو میرا ذہن فوراً آنٹی زیب اور ریحانہ کی بات کی طرف منتقل ہوگیا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ چند ماہ پہلے ہوٹل سکائی دیو میں راکیش پانڈے کا کسی مقامی شخص سے جھگڑا ہوا تھا۔ لیکن دین کے اس تنازع میں مقامی شخص نے مار مار کر راکیش کو ادھ موا کر دیا تھا' اس کا نام جان یانگ بتایا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "امریتا اس شخص کا نام جانتی ہو تم؟ جس نے راکیش سے جھگڑا کھڑا کر رکھا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

میں نے کچھ دیر غور کیا اور پھر تیزی سے ایک فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر میں امریتا کے سامنے اس کے پتی کیخلاف کچھ کہتا سنتا تو یقیناً یہ سب کچھ اسے اچھا نہ لگتا۔ ممکن تھا کہ وہ مجھے دوست کے بجائے دشمن سمجھنے لگتی۔ اس موقع پر راکیش کے خلاف کوئی بھی داشگاف بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اپنا لہجہ دھیما رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں صحیح سلامت اور مطمئن دیکھ کر جو تسلی ہوئی ہے۔ میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح تم اپنے باؤجی سے بات کر کے انہیں بھی تسلی دے سکو۔ ان کے بارے میں ارباز کو شانتی سے جو اطلاع ملی ہے اس کے مطابق وہ کچھ بیمار بھی ہیں......"

میرے آخری جملے نے امریتا کو ایکدم پریشان کر دیا۔ "لیکن راکیش نے تو مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"میں بتا تو رہا ہوں امریتا! میری اطلاع کے مطابق انہیں سنگاپور سے کوئی فون نہیں گیا۔"

امریتا نے بے چینی سے پہلو بدلا پھر کہنے لگی۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں باؤجی کو فون کروں؟"

"موجودہ حالات میں یہ مناسب ترین بات ہے۔"

"لیکن تم جانتے ہو فون کرنے کیلئے ایکسچینج کی بلڈنگ میں جانا پڑے گا۔ اور باہر جانے سے مجھے راکیش نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔"

"اگر راکیش خود ہوٹل سے باہر جانے کا رسک لیتا ہے تو تم بھی چھپ چھپا کر ایسا کر سکتی ہو۔"

"نہیں وہ بہت خفا ہوں گے۔" امریتا نے نفی میں سر ہلایا۔

"امریتا! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ حالات تمہارے اردگرد ٹھیک نہیں ہیں۔ میں اپنے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا جس سے تمہیں دکھ ہو۔ لیکن شاید چند دنوں میں تم خود ہی کافی کچھ جان جاؤ گی۔"

"دای! کیا تم مجھے ڈرانے کیلئے یہاں آئے ہو......تمہاری باتوں سے میرا من ہول رہا ہے۔ فار گاڈ سیک ایسی باتیں نہ کرو۔"

میں بحث سے بچنا چاہتا تھا۔ مگر گفتگو پھر بحث کے رخ پر جا رہی تھی۔ دو چار منٹ میں گفتگو تلخ تر ہوگئی۔ امریتا کی آنکھوں میں ایکدم آنسو آگئے۔ کراہ کر بولی۔ "دای! میں اب ایک بیاہتا لڑکی ہوں۔ تمہیں یا ارباز کو کوئی ادھیکار نہیں کہ اس طرح میری لائف کو ڈسٹرب کرو۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب فار گاڈ سیک مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہاں کچھ مسئلے مسائل ہیں بھی تو میں ان سے نمٹ سکتی ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے میں چلا جاؤں یہاں سے؟"

"ہاں چلے جاؤ۔ اور جا کر اپنے دوست سے کہہ دو کہ اگر اس کے من میں میرے لئے کچھ محبت یا عزت باقی ہے تو میرا دھیان چھوڑ دے' ہمیشہ کیلئے۔"

"کیا ابھی چلا جاؤں؟"

"ہاں ابھی چلے جاؤ۔ میرے بیاہتا جیون کیلئے خطرہ مت بنو۔"

"اتنی دور سے آیا ہوں۔ اتنی گلیوں کی خاک چھانی ہے۔ کیا چائے کیلئے بھی نہیں پوچھو گی؟"

اس نے ٹشو پیپر سے اپنے آنسو پونچھے اور دائیں بائیں تلاش کرنے کے بعد ویٹرس کو اشارہ کیا۔

میں ایکدم کھڑا ہوگیا۔ "نہیں امریتا......کہہ کر چائے پی تو کیا پی؟"

اس کے ہونٹ تھرائے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں تیزی سے گھوما اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ”سنو“ اس کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی لیکن میں رکا نہیں۔

نیچے لابی میں عرفات اور ظہیر آرام دہ صوفوں میں دھنسے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے جو کرنا تھا۔ وہ میں پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں، میں نے انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ وہ دونوں ایک سستے ہوٹل میں ٹھہرنے کیلئے ”بگیز“ کی طرف نکل گئے۔ جاتے جاتے عرفات نے بڑی فراخدلی سے 800 سنگاپوری ڈالر میرے حوالے کر دیئے تھے۔ میں نے 140 سنگاپوری ڈالر یعنی تقریباً ڈیڑھ ہزار پاکستانی روپے میں سیکنڈ فلور پر ایک ڈبل بیڈ کمرا کرائے پر لے لیا۔ یہ کمرا امریتا کے کمرے سے بمشکل 20 میٹر دور تھا۔



اگلے روز سنگاپور میں موسم بے حد سہانا تھا۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ دھلا دھلایا شہر مزید نکھرا ہوا نظر آتا تھا۔ چھٹی کے سبب سڑکوں پر رش کم تھا۔ لابی میں ایک مدھم دھن بج رہی تھی۔ بارش کی رم جھم کے ساتھ مل کر یہ دھن جیسے دل کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا، دس بجے کے قریب امریتا کڑھائی والی شلوار قمیص میں ملبوس اپنے کمرے کی طرف سے آئی اور کھڑکی کے پاس والی میز پر بیٹھ گئی۔ بے حد اداس دکھائی دیتی تھی وہ۔ اس کی آنکھیں رونے سے سوجی ہوئی تھیں۔ ناک بھی سرخ نظر آتی تھی۔

میں کچھ دیر تک اسے محویت سے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھ کر دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگتا تھا۔ میں خود کو ملامت کرتا تھا۔ اپنی سوچ کو کچوکے دیتا تھا۔ کسی وقت مجھے لگتا تھا کہ میں اپنی ہی نظروں میں گرنے لگا ہوں۔ میں ایک گہری سانس لیتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ دھیمے قدموں سے چلتا میں اس کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اپنی سرخ پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ معصوم آنکھوں میں حیرت آمیز مسرت ابھری لیکن اگلے ہی لمحے چہرے کو سنجیدگی نے ڈھانپ لیا۔

”وای! تم ابھی یہیں ہو؟“

”ہاں مجھے لگا کہ ابھی مجھے جانا نہیں چاہئے۔“

”کب آئے ہو؟“ وہ نارمل لہجے میں بولی۔

”میں گیا ہی کب تھا؟ اس سامنے والے کوریڈور میں روم نمبر 64 میں قیام پذیر ہوں۔“

”مجھے لگتا تھا کہ تم میرے لئے کوئی بڑی ”مصیبت“ بنا کر واپس چلے جاؤ گے۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔

''مصیبت بنائی نہیں جاتی' کھڑی کی جاتی ہے۔''

''تو تم مصیبت کھڑی کر کے جاؤ گے۔''

''نہیں امریتا! میں صرف چند دن یہاں رہوں گا۔ میرے دل کے وسوسے دور ہو جائیں گے تو چپ چاپ چلا جاؤں گا۔ تمہیں خدا حافظ بھی نہیں کہوں گا۔''

''پتہ نہیں' تم کن وسوسوں کی بات کرتے ہو۔ میرے لئے تو سب سے بڑا وسوسہ تم خود ہی ہو۔ بندۂ خدا اگر راکیش کو پتہ چلا کہ تم ارباز کے دوست ہو تو پھر......''

''اچھا میں چلتا ہوں۔ دس بجے والی فلائٹ سے نکل جاؤں گا۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

''اچھا بیٹھ جاؤ۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

میں بیٹھ گیا۔ وہ کافی کے کپ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گہری سوچ میں کھو گئی۔

''دای! پتہ نہیں کیوں کل تم سے کٹھور باتیں کر کے اور تمہیں جانے کا کہہ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ تم چلے گئے تو میں دیر تک روتی رہی۔ رات بھی ٹھیک سے سو نہ سکی۔ مجھے لگا جیسے میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں' پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا؟''

''ایسا اس لئے ہوا کہ میں بڑے اخلاص کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ اپنے دل میں تمہارے لئے سچی ہمدردی لایا ہوں۔''

''اس نے بے ساختہ میرا ہاتھ تھام لیا۔ تم اچھے دوست ہو دای! میں نے تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ خلوص دیکھا ہے۔''

''میں شکریے کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''کل تم نے' راکیش کے حوالے سے کچھ باتیں کی ہیں۔ ان میں سے ساری باتیں صحیح نہیں ہیں لیکن کچھ ہو بھی سکتی ہیں۔ لیکن میرا وچار ہے کہ راکیش میں خود کوئی برائی نہیں ہے۔ وہ...... کسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نکلنا چاہتے ہیں لیکن فی الوقت نکل نہیں پا رہے۔''

''شریمتی جی! اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے دھکے دے دے کر اس شہر خرابی سے مت نکالئے۔ چند دن رہنے دیجئے۔ رستے میں پڑا ہوا پتھر بھی کسی وقت کام آ جاتا ہے۔ پھر تسلی کی بات یہ ہے کہ راکیش صاحب میری صورت نہیں جانتے۔ رہے پرتاپ اور راج سنگھ صاحب تو وہ آپ کے ارشاد کے مطابق انڈیا میں ہیں۔''

''نہ صرف انڈیا میں ہیں' بلکہ ہسپتال میں ہیں' انکل پرتاپ کی گاڑی کا ممبئی میں ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ان کی ایک ٹانگ میں ملٹی پل فریکچر ہو گئے ہیں۔ انکل راج' ان کی تیمار داری میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے خود فون پر ان سے بات کی تھی۔''

یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔

اس دوران میں باوردی ویٹرس نے آ کر امریتا کو مخاطب کیا اور انگریزی میں بتایا کہ کاؤنٹر پر اس کی فون کال آئی ہے۔ امریتا نے میرا ہاتھ چھوڑ اور اپنا آنچل سنبھالتی ٹھک ٹھک ایڑی بجاتی کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ میرے ہاتھ میں ایک عجیب سی سنسناہٹ باقی رہ گئی۔ کھڑکیوں سے باہر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ سفید گلاب گملوں میں مہک رہے تھے۔ امریتا تقریباً پانچ منٹ بعد واپس آئی ''لو جی نئی سماچار سنو'' وہ بڑے اسٹائل سے بولی۔

''یعنی کوئی تازہ خبر۔''

''جی...... راکیش آج واپس نہیں آ رہے۔ نہ کل اور پرسوں آ رہے ہیں۔ وہ بدھ کی رات کو آئیں گے۔ انہیں وکیل کے ساتھ مل کر کچھ پیپر تیار کرنے ہیں۔ جو ہر بارو سے بول رہے تھے۔ میں نے کہا نئی نویلی پتنی کو اکیلا چھوڑ رہے ہیں۔ کہنے لگے یہ جالندھر یا ممبئی نہیں سنگاپور ہے۔ دو ماہ بھی اکیلی ہوٹل میں رہو گی تو کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ ہاں ہوٹل سے باہر نہ نکلنا۔ کیونکہ وہاں خطرہ ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس فون کال کے بعد امریتا پریشان ہونے کے بجائے کچھ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ شاید اس کے ذہن پر اس سوچ کا بوجھ نہیں رہا تھا کہ اگر میری موجودگی میں پتی دیو آ گیا تو وہ کیا اثر لے گا۔

ہم کچھ دیر تک لابی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ امریتا اپنے کمرے کی فریج سے اناناس لے آئی اور اپنے ہاتھ سے کاٹ کاٹ کر میری پلیٹ میں رکھتی رہی۔ اس کا قرب میرے دل میں ہلچل پیدا کر رہا تھا۔ دوپہر کو کمرے میں آ کر میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میری سوچ کا رخ صحیح نہیں۔ مجھے اس انداز میں نہیں سوچنا چاہئے تھا۔ ارباز کا دوست ہوتے ہوئے مجھے اس انداز میں نہیں سوچنا چاہئے تھا۔ میں خود کو اور اپنے دل کو ملامت کرنے لگا۔ ارباز نے اسے پیار کیا تھا۔ وہ

اس کی نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن محبوبہ کسی اور کی ہو جائے' پھر بھی رہتی تو محبوب ہی ہے۔ میں اپنے دوست ارباز کی محبوبہ کو کسی اور نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں غلط کر رہا تھا۔ عجیب سی آتش میرے دل و دماغ میں بھرنے لگی۔ میں اٹھ کر بے قراری سے کمرے میں ٹہلتا رہا..... ٹہلتا رہا' کرب انتہا کو چھونے لگا۔ ایک عجیب ہیجانی کیفیت کے زیر اثر میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو پشت کی طرف سے تین چار بار زور سے اندرونی دروازے کی پتھریلی چوکھٹ سے ٹکرایا۔ ہاتھ کی پشت چھل گئی۔ خون رسنے لگا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو تھوڑی دیر پہلے امریتا کے ہاتھ میں رہا تھا۔ اس ہاتھ نے امریتا کے لمس سے سرور محسوس کیا تھا۔ اس کو سزا تو ملنی چاہئے تھی۔ کچھ عجیب ذہنی کیفیت ہو رہی تھی میری۔

کچھ دیر میں نے چوٹوں پر ٹیلکم پاؤڈر چھڑک کر خون کا رساؤ بند کیا اور اوپر اپنا رومال لپیٹ لیا۔ اس طرح کا جذباتی پن مجھ سے زندگی میں پہلی بار سرزد ہوا تھا اور میں اس پر حیران تھا۔ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس پر عملدرآمد کے لئے میں ہوٹل سے نکل آیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سنگا پور کی اجلی سڑکوں پر گاڑیاں بے آواز رواں دواں تھیں۔ زیبرا کراسنگ پر لوگ اطمینان سے سڑک پار کر رہے تھے۔ مجھے کہیں کسی سڑک پر موٹر سائیکل یا اسکوٹر دکھائی نہیں دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ شیطانی چرخے یہاں ممنوع ہیں۔

میں ٹیلیگرام و ٹیلیفون آفس کی بلڈنگ میں پہنچا اور وہاں سے پاکستان فون کیا۔ ان دنوں فون کرنے کا طریقہ کار پیچیدہ تھا اور مہنگا بھی۔ یاد رہے کہ یہ 83ء کے اواخر کی بات ہے۔ میں نے تقریباً پچاس پاکستانی روپے فی منٹ کے حساب سے بات کی۔ جس شخص سے میں نے بات کی وہ ارباز تھا۔ وہ کراچی گیا ہوا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس سے بات ہو جائے گی۔ میں نے اس کے والد سے اس کا فون نمبر معلوم کرنے کیلئے کال کی تھی مگر ریسیور پر دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی وہ ارباز کی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ اتفاقاً صرف ایک دن کیلئے لاہور آیا ہے۔ کل پی آئی اے کی فلائٹ سے واپس کراچی چلا جائے گا۔

میں نے کہا۔ ''یار! تم پی آئی اے کی فلائٹ سے کراچی نہ جاؤ' سیدھے یہاں سنگا پور کے چانگی ایئر پورٹ پر آ جاؤ۔''

''کیوں؟ میرا دماغ چل گیا ہے؟''

''دماغ تو میرا چل گیا ہے یار! جو تیرے لئے یہاں سنگا پور میں سڑکیں ناپ رہا ہوں..... بہرحال سڑکیں ناپنے کے بعد جو کچھ بھی ہوا ہے وہ بے حد حیران کرنے والا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں نے یہاں امریتا کو ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ یہاں سے تقریباً آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوٹل میں موجود ہے۔ میں تمہیں فون پر زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ بس یہ سمجھ لو کہ ہمارے اندیشے درست ہیں۔ وہ یہاں سخت مصیبت میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی تک اسے ٹھیک سے اس مصیبت کا احساس نہیں ہوا ہے۔ مختصر لفظوں میں کہوں گا کہ راکیش نے شادی کے نام پر باؤجی اور امریتا سے بدترین دھوکا کیا ہے۔ میرے اب تک کے جائزے کے مطابق وہ بندہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ امریتا جیسی لڑکی کو اس کی کسٹڈی میں چھوڑا جائے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم جذباتی ہو رہے ہو۔ اتنی جلدی تم نے اتنے حتمی نتیجے کیسے نکال لئے ہیں۔''

''یہاں حالات ہی کچھ ایسے ہوئے ہیں کہ نتیجے خود بخود نکل گئے ہیں۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو؟'' میں کوٹ کے نیچے پستول لگا کر سنگا پور پہنچوں اور اس کے سسرالیوں سے دنگا کروں۔''

''یار! وہ نہیں ہیں اس کے سسرالی..... تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ امریتا کو ان لوگوں سے نجات دلانا نیکی کا کام ہوگا۔ اگر.....''

''دای! میں ایک بات کلیئر کر دینا چاہتا ہوں۔''

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس ہونے میں امریتا کا قصور زیادہ تھا یا میرا۔ میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا' یہ دکھ میں نے اب جھیل لیا ہے' اب اس چیپٹر کو بند کر دینا چاہتا ہوں۔ مکمل طور پر اور..... اور میرا خیال ہے کہ اگر تمہاری اس معاملے میں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تو تم بھی یہ چیپٹر بند کر دو۔ خدا حافظ۔''

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ میں اپنی جگہ ساکت جامد کھڑا تھا۔ کان سائیں

سانسیں کر رہے تھے۔ ارباز کا آخری فقرہ آتشیں تیر کی طرح سماعت میں پیوست تھا......اگر تمہاری اس معاملے میں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تو تم بھی یہ چیپٹر بند کر دو۔

''ذاتی دلچسپی'' کے الفاظ اس نے قدرے توقف کے ساتھ ادا کئے تھے۔ اگر وہ فون بند نہ کرتا تو میں اس سے پوچھتا۔ ''اگر میری کوئی ذاتی دلچسپی میرے لئے اتنی ہی اہم ہوتی تو میں تمہیں اپنے ساتھ کھینچ کھینچ کر سنگاپور لانے کی کوشش کیوں کرتا۔ یہاں کئی گھنٹے تک امریتا سے صرف تمہاری باتیں کیوں کرتا اور اب تمہیں فون پر یہاں کے حالات بتا کر تمہیں یہاں کیوں بلاتا؟

میں نے ایک بار پھر ارباز کا نمبر ٹرائی کیا۔ تیسری چوتھی کوشش پر اس کی آواز پھر سنائی دی۔ ''ہیلو کون؟''

''ارباز میری بات سنو......فون بند نہ کرنا۔''

''پلیز دامی! مجھ سے اب اس موضوع پر کوئی بات نہ کرو۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ یہ سب ختم ہو چکا ہے۔'' اس نے فون پھر بند کر دیا۔

اس نے ایک آخری فقرہ ادا نہیں کیا تھا۔ لیکن میں یہ فقرہ ایک بار پہلے بھی سن چکا تھا۔ لہٰذا یہ میرے کانوں میں گونجنے لگا تھا اور یہ فقرہ تھا۔ ''......میں جوٹھا نہیں کھاتا۔''

ہاں وہ جوٹھا نہیں کھاتا تھا......اور وہ جوٹھی ہو چکی تھی۔ اس کیلئے بے معنی ہو چکی تھی۔ یہ کیسا پیار کیا تھا۔ اس نے؟ یہ تو بس ''لمس'' کا پیار تھا۔ یہ تو کھال سے آگے جاتا ہی نہیں تھا۔ اس نے دل اور روح تک کیا پہنچنا تھا۔ پیار کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے۔ جسم کی حیثیت تو ثانوی ہوتی ہے۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا میں کب ٹیلیگرام و ٹیلیفون کی عمارت سے باہر نکل آیا ہوں اور فٹ پاتھ پر آن کھڑا ہوا ہوں۔ میرے بال سہ پہر کی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ میں نے ایکدم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا...... مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر بہت گہرائی میں سویا ہوا کوئی جذبہ دھیرے دھیرے انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا ہے۔ کوئی نادیدہ شے بے نام بندھنوں سے آزاد ہو رہی ہے۔ میں حرکت میں آیا اور فلک بوس عمارتوں کے درمیان سبزے سے گھرے ہوئے راستوں پر چلنے لگا۔ یونہی بے مقصد...... بے سمت...... پام جھوم رہے تھے۔ پھول مہک رہے تھے۔ ہوا جسم کو گدگدانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں

تقریباً ایک گھنٹے تک اسی طرح چلتا رہا۔ یہ ایک گھنٹہ میرے جسم اور ذہن کی کیمسٹری میں حیرت انگیز تبدیلیوں کا گھنٹا تھا۔ میں پھولوں سے ڈھکے ہوئے ایک اوور ہیڈ برج پر سے گزر رہا تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میں ایک خوش قسمت انسان ہوں کیونکہ میں امریتا کور سے محبت کر رہا ہوں اور یہ محبت کرنے کیلئے پوری طرح آزاد ہوں۔ کم از کم ارباز کی طرف سے آزاد ہوں۔

اتنی جلدی کیسے ہوئی تھی یہ محبت؟

نہیں، یہ اتنی جلدی نہیں ہوئی تھی۔ یہ میرے اندر کہیں بہت گہرائی میں پروان چڑھی تھی۔ اور شاید بہت پہلے سے موجود تھی۔

''دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ہُو''

میں چلتا رہا۔ میرے پاؤں جیسے زمین پر پڑنے کے بجائے ہوا پر پڑ رہے تھے میں اڑ رہا تھا......ارگرد کی ہر شے میں جیسے ایک بے نام ترنگ دوڑ گئی تھی۔

پھر میں ہوٹل نیو براڈوے کی طرف لوٹ آیا......وہ لابی میں بیٹھی تھی۔ اپنی کلائی کے طلائی کنگنوں سے کھیلتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھی۔ ایک جرمن سیاح اس کے لمبے بالوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے گزر رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں نے آج اسے پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ سندر تھی۔ دل موہ لینے والی سادگی رکھتی تھی۔ میری آہٹ پا کر اس نے مجھے دیکھا۔ پھر چونک کر میرے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

''ہائے ربا، یہ کیا ہوا؟''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک بیوقوفی ہو گئی تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''بس، زخمی ہو گیا ہے؟''

''کس نے کیا؟''

''تم نے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''دراصل، میں جب باہر نکلا تو امریکن بینک کے سامنے ایک انڈین لڑکی کھڑی تھی۔ مجھے لگا جیسے تم کھڑی ہو۔ میں اس پر غور کرتا ہوا آگے بڑھا ایک کار کا ''سائیڈ مرر''

ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوا گزر گیا۔" میں نے بات بنائی۔

"ہائے ربا! زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔" اس نے بڑی "پیاری بے تابی" سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں کچھ زیادہ تو نہیں۔"

"کہاں گئے تھے؟"

"یونہی ذرا شہر اور شہر والوں کو دیکھنے نکل گیا تھا۔"

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ "کہیں شہر والیوں کو دیکھنے تو نہیں گئے تھے؟"

"میں ایک شریف بندہ ہوں امریتا۔"

"وہ تو شکل سے ہی لگتے ہو۔ لیکن شرافت میں یہ پابندی تو نہیں ہوتی کہ کسی کو دیکھا نہ جائے، کسی کو چاہا نہ جائے۔"

"شاید تم کچھ پوچھنا چاہ رہی ہو۔"

"ہاں...... کوئی ہے تمہارے جیون میں یا......؟"

"ہے بھی...... اور نہیں بھی۔"

"یہ تو بڑا گول مول سا جواب ہے۔"

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "دیکھو امریتا! جالندھر میں ایک خوبصورت سا چانس تو بنا تھا میرا...... لالہ نے بھی ایک دو بار بڑی دلربائی سے میری طرف دیکھا تھا۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ وہ ہیروئن نہیں، ولن ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے ویمپ۔"

امریتا کے چہرے پر دُکھ کا رنگ سا آ کر گزر گیا۔ "اس کی بات چھوڑو داؤ! تکلیف ہوتی ہے، جو اتنا قریب ہوا اتنا دور نکلے تو من رونے لگتا ہے۔"

شام کو موسم خوشگوار تھا۔ سنگاپور ہمیشہ سے زیادہ جگمگاتا اور گنگناتا محسوس ہوتا تھا۔ لابی میں دلنشیں دھنیں گونج رہی تھیں۔ نو بجے کے لگ بھگ میں کمرے سے نکلا تو حسب توقع امریتا سامنے ہی موجود تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والی میز پر بیٹھی تھی۔ گاہے بگاہے وہ رخ پھیر کر نیچے سنگاپور کی چمکتی دمکتی بے آواز ٹریفک کو دیکھ لیتی تھی۔ وہ گہری سوچ میں تھی۔ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد

پوری رات کا چاند مشرق سے اُبھرتا دکھائی دیا۔ رنگین شیشوں والی کھڑکی میں سے اس چاند کا نظارہ دلربا تھا۔ دو فلک بوس عمارتوں کے درمیان سے یہ چاند دھیرے دھیرے یوں اوپر آ رہا تھا جیسے عمارتوں کا سہارا لے کر بلند ہو رہا ہو۔ ایلوس پریسلے کا ایک گانا فضا میں گونج رہا تھا۔

میرے دل سے آواز آتی ہے

محبت میں خدا تم ہو

میں نے کہا۔ "امریتا! اگر برا نہ مناؤ تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"باؤ جی سے مل کر مجھے اندازہ ہوا ہے کہ وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اُن کی زندگی بس تمہارے گرد ہی گھومتی ہے۔ ایک سوال بار بار میرے ذہن میں آتا ہے۔ اگر تم باؤ جی سے اصرار کرتیں، اُن سے کہتیں کہ تم صرف ارباز سے ہی شادی کرو گی، تو پھر......؟"

امریتا نے طویل سانس لے کر کہا۔ "داؤ! پہلی بات تو یہ ہے کہ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب اُسے دُہرانے سے فائدہ نہیں۔ باقی جہاں تک باؤ جی کے سامنے ڈٹ جانے والی بات ہے تو میں نے...... پہلے دن ہی ارباز سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنی جان تو گنوا سکتی ہوں لیکن باؤ جی کو دکھ نہیں دے سکتی۔ تم نے دیکھ ہی لیا تھا داؤ! حالات وہاں ایسے ہو گئے تھے کہ میرے اور باؤ جی کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ شاید جو ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ ارباز بھی بہت بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہو سکتا تھا۔"

وہ بات ختم کر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اُبھرتے ہوئے چاند کی کرنیں جیسے اس کی شفاف پیشانی پر منعکس ہو رہی تھیں۔ اس شفاف پیشانی پر ایک سلوٹ کسی بے نام اُلجھن کی طرح نظر آتی تھی۔

میں نے کہا۔ "جو البم تم نے جالندھر کے ہوٹل میں دیا تھا، عجیب و غریب تھا۔ تصویروں، ٹکٹوں اور آٹو گرافز وغیرہ کے البم تو میں نے دیکھے ہیں لیکن خطوں کا البم؟"

"بس، میں ایسی ہی اوٹ پٹانگ ہوں۔"

"البم کی پیشانی پر تم نے اپنے ہاتھ سے ایک شعر لکھ رکھا ہے۔ پتہ ہے کون سا؟"

"کون سا؟"

"ہاتھ اُلجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں"

"ہاں، پتہ نہیں کس موڈ میں لکھا تھا۔"

"اس شعر سے تمہارے اندر کی بے یقینی اور اُلجھن کا سُراغ ملتا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں، بس کسی وقت مجھے عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے ارباز سے اتنا پیار نہیں کیا جتنا اس کے خطوں سے کیا ہے۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ تعجب کا ایک لمحہ اس کی شیشہ آنکھوں میں اُبھرا اور اوجھل ہو گیا۔ پھر اس نے رخ پھیرا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ جیسے اس سوال کا جواب چاندنی میں اور چاند میں تلاش کر رہی ہو۔ وہ چاند جو دو فلک بوس عمارتوں کے درمیان آہستہ آہستہ سرکتا ہوا کسی کیپسول کی طرح اوپر جا رہا تھا۔ کتنی ہی دیر بعد اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کہتے ہیں کہ ان دیکھی شے کا تصور زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ یہ کاغذ پر لکھے لفظ بھی تو ان دیکھی شے کا تصور ہی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ تصور اتنا شکتی والا ہوتا ہے کہ خود علیحدہ سے ایک حقیقت بن جاتا ہے۔" اس نے ذرا توقف کیا، پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "ٹھہرو، میں تمہیں ایک چیز دکھاتی ہوں۔"

اپنے لمبے بالوں کو سنبھالتی اور اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی وہ کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت ہندی میگزین تھا۔ اس نے میگزین کے صفحے اپنی حنائی انگلیوں سے پلٹے اور ایک صفحہ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ میرے ہی ایک خط کا اقتباس تھا۔ وہی خط جو میں نے پہلی بار لکھا تھا۔ اقتباس یوں تھا۔

"یہ کاغذ پر لکھے لفظ بھی کیا چیز ہوتے ہیں؟ کہنے کو ساکت و جامد ہوتے ہیں۔

لیکن ان میں دنیا جہاں کے رنگ، ذائقے، لمس اور جذبے حرکت کرتے ہیں۔ یہ سوچوں اور مزاجوں کا آئینہ بن کر انجانے لوگوں کو ایک دوسرے سے یوں منسلک کر دیتے ہیں جیسے وہ زمانوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ آج اس پُربہار شام میں جو لڑکی اپنے لفظوں میں سما کر مجھ سے ملی ہے۔ وہ یکسر انجان ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ میں اُسے بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ میں نے پہلے پہل کہاں دیکھا تھا اُسے؟ شاید ساون کی پہلی بارش میں، شاید سرما کی اس دھوپ میں جو کئی دن کے بعد نکلی تھی، یا پھر گرمیوں کی ایک ٹھنڈی چاندنی رات میں، یا پھر کسی رنگا رنگ تہوار کی آمد سے ایک دن پہلے جب میرے اندر خوشی ناچ رہی تھی۔ ہاں میں نے دیکھا ہے اُسے......"

"یہ کیا ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے امریتا سے پوچھا۔

"بس ایک اقتباس تھا، لفظوں کے بارے میں۔ مجھے اچھا لگا میں نے رکھ لیا۔ ہم لفظوں کی بات کر رہے تھے نا" میں نے سوچا، تمہیں یہ بھی دکھاؤں؟"

"لگتا ہے کہ یہ سطریں پہلے بھی کہیں پڑھی ہیں۔"

وہ دھیرے سے مسکرائی اور بال جھٹک کر بولی۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ ہاتھ میں زیادہ تکلیف تو نہیں۔ اگر ہے تو اس والے کمرے میں ایک تھائی ڈاکٹر صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"نہیں، ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

وہ ایک بار پھر گہری سوچ میں کھو گئی۔ چہرے پر وہی تاثرات تھے جو میرے یہاں آنے سے پہلے تھے۔ خوبرو پیشانی پر تفکر کی شکنیں تھیں۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"شانتی نے تمہیں کیا بتایا تھا؟ کیا ہوا ہے باؤ جی کو؟"

"بہتر تھا کہ میں وہ خط ساتھ لے آتا، لیکن غلطی ہوئی...... شانتی نے لکھا تھا کہ باؤ جی کئی دنوں سے جالندھر میں دربدر پھر رہے ہیں۔ پرتاپ سنگھ یا راج سنگھ میں سے کسی سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ چند دن پہلے باؤ جی کو بخار ہو گیا تھا۔ جواب تک جاری ہے۔ کافی کمزوری بھی محسوس کر رہے ہیں۔"

"لیکن راکیش نے تو......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ پیشانی پر اُلجھن کی

سلوٹیں گہری ہوگئیں۔ اس نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی اور انگلیوں کو مروڑتی ہوئی بولی۔

''فون آفس بڑی سڑک پر ہے یا اندر کسی اسٹریٹ میں؟''

''ہے تو بڑی سڑک پر لیکن زیادہ دور نہیں۔ مشکل سے پانچ چھ سو میٹر فاصلہ ہو گا۔''

اس کے چہرے پر تذبذب تھا۔ اُنگلیاں ایک دوسری میں اُلجھ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''خود کو اتنا پریشان مت کرو۔ اگر تمہیں ڈر ہے تو ہم سامنے کے بجائے ہوٹل کی پچھلی طرف سے نکل جاتے ہیں۔ میں نے یہ دوسرا راستہ بھی دیکھ لیا ہے۔ ویسے بھی رات کا وقت ہے۔''

''لیکن...... راکیش نے سختی سے منع کیا تھا۔''

''اگر سچ جاننا چاہتی ہو تو پھر اتنی سی حکم عدولی تو تمہیں کرنا پڑے گی۔ شک رشتوں کا دشمن ہوتا ہے۔ اگر کچھ رسک لے کر بھی اس شک کو دور کرنا پڑے تو کر لو۔'' میں نے دلیل پیش کی۔ وہ ایک عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے داس! میں تمہارے ساتھ چلوں گی لیکن ہم پچھلی طرف سے نکلیں گے۔ بڑی سڑک پر تب مڑیں گے جب آفس بالکل قریب آ جائے گا۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد ہم دوسری منزل سے گراؤنڈ فلور کی طرف جا رہے تھے۔ امریتا شلوار قمیص میں تھی۔ اس نے ایک چادر سے اپنا جسم اور اپنے لمبے بال ڈھانپ لئے تھے۔ شولڈر بیگ اس کے کندھے پر تھا۔ میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے خط کے اقتباس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یقیناً یہ اقتباس امریتا نے ہی میگزین میں چھپوایا تھا اور پھر اپنے شوق کے مطابق سنبھال کر رکھ لیا تھا۔

ہم ساتھ ساتھ چلتے' ہوٹل کے عقبی دروازوں کی طرف سے نکلے۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ فٹ پاتھ صاف ستھرا تھا۔ دُکانوں کے شوکیس جگمگا رہے تھے۔ ایک شوکیس میں پھل یوں رکھے تھے جیسے الیکٹرانکس کا سامان یا قیمتی کھلونے رکھے ہوں۔ مختلف پھلوں پر قیمتوں کی چٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک مالٹے کی قیمت پڑھ کر چودہ

طبق روشن ہوئے اور لاہور میں سڑک کے کنارے مالٹوں کے ڈھیر یاد آ گئے۔ قریباً پانچ منٹ میں ہم ٹیلی فون و ٹیلی گرام آفس میں پہنچ گئے۔ یہاں رش تھا۔ ٹورسٹ خواتین و حضرات دور دراز کی کالیں ملانے میں مصروف تھے۔ امریتا واضح طور پر گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے سرخ و سپید ہاتھ میں فون انڈکس تھا اور میں اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ امریتا نے ایک کالنگ کارڈ کی مدد سے اوورسیز کال ملائی۔

یہ اس کے باؤجی کا فون نمبر تھا۔ اس گھر کا فون نمبر جہاں وہ پلی بڑھی تھی۔ جہاں کے ایک ایک گوشے میں اس کے باؤجی کی اور اس کی یادیں رچی بسی تھیں۔ بیٹیوں کو خود سے جدا کرنا پڑتا ہے اور اچھے رشتوں کی تلاش میں یہ جدائی کبھی کبھی بہت طویل اور ناروا بھی ہو جاتی ہے۔

وہ کافی دیر تک کوشش کرتی رہی لیکن باؤجی سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ ہار کر اس نے اپنی ایک خالہ کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ خالہ بھی جالندھر کی رہائشی تھیں۔ ''ہیلو خالہ! میں امریتا بول رہی ہوں سنگاپور سے۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔ ''ہاں ہاں...... خالہ...... میں بالکل ٹھیک ہوں...... نہیں نہیں...... آپ سے کس نے کہا...... لیکن مجھے تو راکیش نے بتایا تھا کہ وہ فون کرتے رہے ہیں...... باؤجی سے بھی بات ہوتی رہی ہے...... جی جی...... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ خود ملی ہیں باؤجی سے......؟''

وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے بتائی جانے والی تفصیل سنتی رہی۔ میں اس کے چہرے کا تفکر پڑھ رہا تھا۔ پھر وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''او گاڈ...... میں یہ کیا سن رہی ہوں خالہ...... میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ باتیں صحیح ہوں لیکن یہ ساری صحیح نہیں ہو سکتیں۔ راکیش اس طرح کے نہیں ہیں؟''

پھر وہ خالہ سے باؤجی کی بیماری کی تفصیل پوچھنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی کٹورہ آنکھوں سے آنسو بھی پونچھتی جا رہی تھی۔ آخر میں وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''اچھا خالہ! آپ ابھی باؤجی سے مل کر اُنہیں میری خیریت سے آگاہ کریں۔ اُنہیں بتائیں کہ کل انڈین وقت کے مطابق پانچ بجے میں پھر فون کروں گی۔ وہ اپنا فون کھلا رکھیں۔ ضروری تاکید ہے۔ اچھا کال کا سے ختم ہو رہا ہے۔ کل تک کے لئے

ست سری اکال۔گڈ بائے۔"

اس نے ریسیور واپس رکھا تو اس کے چہرے پر حیرت آمیز تفکر کی گہری پرچھائیاں تھیں۔میری طرف دیکھ کر اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو داجی! جالندھر میں میرے بارے میں کوئی جانکاری نہیں ہے......لیکن یہ کیسے ہوا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔راکیش مجھ سے غلط بیانی کیوں کرتے رہے ہیں۔اگر کوئی خاص مجبوری تھی تو وہ مجھے بتاتے۔میں ان کی پتنی ہوں۔مجھے ان کی پریشانیاں شیئر کرنی چاہئیں۔اور میں کرسکتی ہوں' وہ کیوں اکیلے اکیلے فیس کر رہے ہیں سب کچھ۔"

"وہ کیا فیس کر رہا ہے اور کیا نہیں......اس کا فیصلہ تو آنے والے چند دنوں میں ہوگا۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں جو کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھا۔وہ میں تم سے کہہ چکا ہوں۔مزید کہنے سے بہتر ہے کہ وقت کا انتظار کیا جائے۔"

"ایک بار پھر ٹرائی کر کے نہ دیکھ لوں باؤجی کو۔" اس نے ایکدم موضوع بدلا۔

"ہاں کرلو کوشش۔"

وہ پھر نمبر ملانے لگ گئی۔یہ طویل کوشش بھی ناکام رہی۔آخر یہ کام کل پر چھوڑ کر ہم دونوں آفس کی بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔باہر ہوا ٹھنڈی تھی' ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلنے والے جوڑے اس ہوا سے خصوصی طور پر لطف اندوز ہو رہے تھے۔امریتا کچھ کھوئی کھوئی سی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ہوا کے ایک شریر جھونکے نے اس کے لمبے بالوں کو چادر سے نکال کر ہوا میں اڑانا شروع کر دیا۔وہ انہیں سنبھالنے میں لگ گئی۔جیسے شریر بچوں کو بھری سڑک پر اِدھر اُدھر بھاگنے سے روک رہی ہو۔قریب سے گزرتے ہوئے چند راہگیروں نے تعجب سے اس کے طویل تر بالوں کو دیکھا۔ہم نے ایک زیبرا کراسنگ سے بڑی سڑک پار کی اور عقبی سڑک پر آگئے۔ابھی ہم تیس چالیس قدم ہی

چلے تھے کہ اچانک ایک نیلی جیگوار گاڑی تیزی سے ہمارے قریب رکی۔اس کے بائیں جانب والے دونوں دروازے مخدوش تیزی کے ساتھ کھلے۔ایک ہٹا کٹا شخص اگلے دروازے سے برآمد ہوا۔اس نے پلک جھپکتے میں امریتا کا بازو پکڑا اور اُسے کھینچ کر گاڑی میں بٹھانا چاہا۔

میں چند لمحے تو سکتے کی کیفیت میں رہا پھر میں نے آگے بڑھ کر اس شخص کا راستہ روکا "چھوڑو......کون ہو تم؟" میں نے چلا کر پوچھا۔

مجھے جو ایک لفظ سمجھ میں آیا وہ "پولیس" تھا۔ہٹا کٹا شخص مجھے بتا رہا تھا کہ اس کا تعلق پولیس سے ہے۔

میں نے تیزی سے گاڑی میں نگاہ دوڑائی۔وہاں دو افراد اور موجود تھے لیکن اُن میں سے بھی کوئی پولیس کی وردی میں نہیں تھا۔میرا ذہن بہت پہلے سے خطرے کی گھنٹی بجا چکا تھا۔یقیناً ان غنڈہ صورت افراد کا تعلق اُسی قبیلے سے تھا جس نے راکیش اور امریتا کو "ہوٹل نیو براڈوے" میں محصور کر رکھا تھا۔ہٹا کٹا شخص بڑی پھرتی اور طاقت سے امریتا کو گھسیٹ کر گاڑی کے دروازے میں پہنچا چکا تھا۔اب وہ ایک زوردار جھٹکا مزید دیتا تو امریتا گاڑی کے اندر ہوتی۔

میرے جسم کی اندرونی کمزوری پر اچانک ایک غیر مرئی توانائی غالب آگئی۔آج شاید زندگی میں پہلی بار ارباز میرے ساتھ نہیں تھا اور مجھے ایک مشکل صورت حال کا سامنا تھا۔ایسے موقعوں پر ہمیشہ مرکزی کردار ارباز ہی کا ہوتا تھا۔میں صرف اس کے معاون کا کردار ادا کیا کرتا تھا۔لیکن آج مجھے خود مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔اگر میں نہ کرتا تو امریتا بدترین مصیبت سے دوچار ہو جاتی اور اس کی ساری ذمے داری مجھ پر آتی۔کیونکہ میں ہی اصرار کر کے اُسے اپنے ساتھ ہوٹل سے باہر لایا تھا۔

ہاں' زندگی میں پہلی بار...... مجھے ارباز کے بغیر اس ہنگامی صورت حال سے نمٹنا تھا۔میں نے دل کڑا کر کے ایک زوردار لات ہٹے کٹے شخص کے چہرے پر رسید کی۔وہ اس وار کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔شاید اُسے توقع ہی نہیں تھی کہ میں اس نوع کی مزاحمت کروں گا۔چوٹ شدید تھی۔امریتا کا بازو اس شخص کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کا سر بڑی شدت کے ساتھ جیگوار کے درمیانی پلر سے ٹکرایا۔پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا

ایک ملائی عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ اس کا طوفانی گھونسا میرے منہ پر پڑا۔ مجھے یوں لگا کہ جبڑا ٹوٹ گیا ہے۔ میں اُلٹ کر سڑک پر گرا لیکن جتنی تیزی سے گرا تھا' اتنی ہی تیزی سے اُٹھ کر پھر امریتا کی طرف جھپٹا۔ اب ملائی نے امریتا کے دونوں بازو پکڑ لئے تھے اور اُسے اندر کھینچ رہا تھا۔ دوسرا شخص امریتا کے عقب میں دروازہ بند کرنے کی کوشش میں تھا۔ امریتا دہشت سے چیخ رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ گاڑی کے اندر نہ پہنچے۔ میں نے امریتا کو عقب سے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور اپنی ٹھوکروں سے ملائی کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں پہلے حملہ آور کے ہاتھ میں لمبے پھل کا چاقو نظر آنے لگا۔ اس نے وارننگ دینے والے انداز میں پھنکار کر کچھ کہا۔ جب میں نے امریتا کی کمر نہیں چھوڑی تو اس نے بے دریغ میرے بائیں کندھے پر وار کیا۔ ایک انگارہ سا کندھے میں گہرائی تک گھس گیا۔ حملہ آور کا دوسرا وحشیانہ وار میرے چہرے پر لگتا۔ لیکن یہ وار میں جھک کر بچا گیا۔ پھر ایکدم نجانے کیا ہوا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی' اس کے پہیے چرچرائے' کھلے ہوئے دروازے بری طرح لہرائے اور وہ حملہ آوروں سمیت تیزی سے موڑ کاٹ کر ایک بغلی سڑک پر اوجھل ہوگئی۔ میں نے اس کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

پتہ نہیں اُن لوگوں نے کیا دیکھا تھا جو اس طرح اچانک بھاگ اُٹھے تھے۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ بظاہر پولیس کی گاڑی بھی نظر نہیں آئی۔ ہاں چار پانچ عام گاڑیاں ضرور اردگرد کھڑی ہوگئی تھیں۔ اُن کی کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے خوفزدہ چہرے صرف تماشائی تھے۔ یہ سارے کا سارا واقعہ بمشکل ایک منٹ میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ دوراہگیر رُک کر میرے کندھے کا زخم دیکھنے لگے۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے امریتا کا سڑک پر گرا ہوا شولڈر بیگ اٹھا کر اُسے دیا۔ امریتا کی چادر اتر گئی تھی اور سڑک پر رول ہوتی ہوئی کچھ دور چلی گئی تھی۔ ایک شخص نے وہ چادر پکڑی۔ امریتا کی ایک جوتی سڑک کے وسط میں پڑی تھی' میں یہ جوتی اٹھا کر لایا اور امریتا کے سامنے رکھی۔

''تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی امریتا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ اور تمہیں؟''

''مجھے بھی خاص نہیں۔'' میں نے کندھا تھامتے ہوئے کہا۔

''ہائے ربا! تمہارا تو خون نکل رہا ہے۔ دکھاؤ مجھے۔''

''اس وقت یہ دیکھنا دکھانا چھوڑو امرت! اگر پولیس آ گئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔'' میں نے ہانپی آواز میں سرگوشی کی۔

''چلو پھر چلیں۔'' وہ بھی جیسے چونک کر بولی۔

ہم اردگرد کے لوگوں کو حیران چھوڑ کر تیزی سے ایک شاپنگ مال میں گھسے اور دوسری طرف سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئے۔ یہاں ہمارا ہوٹل سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ چلتے ہوئے ہم مڑ مڑ کر پیچھے بھی دیکھ رہے تھے۔



مجھے اپنی کمر پر ہلکی سی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ چلتے چلتے میں نے گردن کے عقب میں ہاتھ لگا کر دیکھا تو ہاتھ پر خون دکھائی دیا۔ سر کے پچھلے حصے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہ کافی شدید چوٹ تھی۔ یہاں گرتے وقت فٹ پاتھ کا کنارہ لگا تھا۔ اس وقت آنکھوں میں جو رنگ برنگے تارے ناچے تھے اُن میں سے کچھ ابھی تک ناچ رہے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ تاہم میں نے اپنی حالت امریتا پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ نہ ہی یہ بتایا کہ میرے کندھے کے علاوہ سر کے عقبی حصے سے بھی خون رس رہا ہے۔

ہم سامنے کی طرف سے ہوٹل میں داخل ہوئے۔ استقبالیہ والوں نے بس اچٹتی سی نظر ہم پر ڈالی۔ بذریعہ لفٹ ہم سیکنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ یہاں تک آتے ہوئے ہم گاہے بگاہے عقب کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ ہمارا پیچھا نہ ہو رہا ہو۔ بہر حال کمرے میں پہنچنے تک اس قسم کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے۔

کمرے کی چابی میری پتلون کی بائیں جیب میں تھی۔ میں نے زخمی کندھے کی وجہ سے دائیں ہاتھ سے چابی نکالنے کی کوشش کی۔ امریتا نے بے تکلف انداز میں میری مدد کی اور جیب میں ہاتھ گھما کر خود چابی نکال لی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم کمرے میں تھے۔ روشنی میں امریتا نے مجھے بغور دیکھا اور کراہی۔ ''ہائے ربا! تمہارا تو سر بھی زخمی ہے۔ یہ دیکھو سارے بال لال ہو رہے ہیں۔''

اس نے مجھے کندھوں سے تھام کر گھمایا اور قد آدم آئینے میں مجھے میرے سر کا پچھلا حصہ دکھانے کی کوشش کی۔ مجھے تاحال چکر آ رہے تھے۔ میں بیڈ پر بیٹھ گیا۔ امریتا

کمال بے تابی اور ہمدردی سے میری مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ وہ تھائی ڈاکٹر کو بلانا نہیں چاہتی تھی۔ اس طرح بات پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ اس کے کمرے میں فرسٹ ایڈ کا تھوڑا بہت سامان موجود تھے۔ ایک دو چیزیں میرے پاس سے نکل آئیں۔ کندھے کا زخم مختصر لیکن گہرا تھا۔ زخم کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی کہ اسٹیچنگ کے بغیر کام چل سکتا تھا۔ میں نے پتلون کے علاوہ سارے کپڑے اتار دیئے۔ امریتا نے پہلے کندھے کی بینڈیج کی پھر سر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سر کی چوٹ بیرونی سے زیادہ اندرونی تھی۔

زخم مجھے لگے تھے لیکن بینڈیج کرتے ہوئے 'اُف...... اُف' وہ کر رہی تھی......

کسی وقت اس کے منہ سے اس کا مخصوص کلمہ ''ہائے ربا'' بھی بڑے دلکش انداز میں نکلتا تھا۔

''دیکھو میری وجہ سے کتنی چوٹیں لگوا لیں تم نے؟'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''غلطی بھی تو میری تھی۔ ہمیں واقعی باہر نہیں نکلنا چاہئے تھا؟''

''اگر تم ساتھ نہ ہوتے تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا میرے ساتھ؟'' وہ لرزتی ہوئی بولی۔

''اگر میں ساتھ نہ ہوتا تو تم نے باہر نکلنا ہی کہاں تھا؟'' میں نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''تمہیں تو چوٹیں نہیں لگیں؟''

''بس پاؤں میں موچ محسوس ہو رہی ہے۔ یا یہ دو ناخن ٹوٹے ہیں۔'' اس نے اپنے بائیں ہاتھ کے زخمی زخمی سے ناخن دکھائے۔

''ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ ہوا ہے ہمارے ساتھ۔''

''مجھے تو اب بھی دشواس نہیں ہو رہا کہ ہم اس مصیبت سے بچ نکلے ہیں۔ ڈر آ رہا ہے کہ ان میں سے کوئی یہاں تک نہ پہنچ جائے۔'' وہ کمرے کی بیرونی کھڑکیاں بند کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں امریتا! اگر ایسی کوئی بات ہونی ہوتی تو وہیں پر ہو جاتی۔ شکر کا مقام یہ بھی ہے کہ پولیس موقع پر نہیں پہنچی ورنہ لمبی پوچھ گچھ شروع ہو جاتی تھی۔''

امریتا کا چہرہ ابھی تک زرد تھا۔ چہرے پر اندیشوں کے مہیب بادل منڈلا

رہے تھے۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "دای! یہ کون لوگ ہیں جو اتنے ورودھ سے میرے اور راکیش کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ سنگاپور جیسے شہر میں کتنی دیدہ دلیری دکھائی ہے انہوں نے۔ یہ لین دین کا تنازعہ کیا اتنا ہی گمبھیر ہے کہ وہ لوگ...... مجھے......اغوا کرنے تک آ گئے ہیں۔ اگر...... اگر سچویشن اتنی ہی خراب تھی تو پھر...... راکیش مجھے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئے یہاں سے؟ انہوں نے کیوں کیا ایسا؟" آخری الفاظ کہتے کہتے امریتا کا گلا رندھ گیا۔

"یہ بات تو تم کہہ رہی ہوں نا' کہ یہ لین دین کا معاملہ ہے۔"

"تو تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں نے کہا ناں کہ اگلے چند دن میں سب کچھ واضح ہو جائے گا۔"

وہ شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ جیسے وہ اس بات کو ماننے کے لئے اب بھی تیار نہ ہو کہ راکیش یا پرتاپ سنگھ وغیرہ اس سے کوئی دھوکا کر رہے ہیں۔

"تمہارا چہرہ بالکل پیلا پڑ رہا ہے۔ لیٹ جاؤ۔" اس نے بڑی اپنائیت سے میرے کندھوں پر دباؤ ڈال کر مجھے بستر پر لٹا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" میں نے کہا۔ "لیکن دروازہ وغیرہ اچھی طرح بند رکھنا۔"

وہ میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کافی چوٹ لگی ہے۔ تمہارا یوں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔ میری تو رائے ہے کہ تم فون کر کے اپنے دونوں دوستوں کو یہاں بلا لو۔"

ایک لحظے کے لئے میرے دل میں آئی کہ ایسا ہی کروں لیکن پھر فوراً ہی میں نے یہ خیال جھٹک دیا۔ عرفات یا ظہیر کی کمپنی سے امریتا کی کمپنی کہیں بہتر تھی۔ میں نے بہانہ بنایا۔ "ان کا فون نمبر وہیں کلانگ کے کمرے میں رہ گیا ہے۔ اب تو وہ خود ہی فون کریں تو رابطہ ہو سکتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ دروازے کی دو چابیاں ہیں۔ ایک چابی سے میں باہر سے قفل لگا دیتی ہوں۔ تم بس لیٹے رہنا۔ ابھی ایک دو گھنٹے میں میں خود ہی آ کر

تمہیں دیکھ جاؤں گی۔ اگر ویسے کوئی ضرورت ہوئی تو روم سروس والوں کو رنگ کر لینا۔"

"تم اب کہاں جا رہی ہو؟" میں نے اس کے تیور بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"میں ٹرائی کرتی ہوں' اگر راکیش سے رابطہ ہو سکے تو۔ انہیں اس درگھٹنا کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔"

"اگر اُسے بتاؤ گی تو پھر یہ بھی بتانا پڑے گا کہ تم اس کی حکم عدولی کر کے باہر گئی تھیں۔"

"نہیں' میں کچھ نہ کچھ کہہ لوں گی۔ لیکن یہ جو واقعہ ہوا ہے یہ معمولی نہیں ہے۔ میں ہر صورت راکیش کو اس کی جانکاری دینا چاہتی ہوں۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر خود کو روک لیا۔ صورت حال آہستہ آہستہ خود ہی امریتا پر واضح ہو رہی تھی۔ میں اس میں مداخلت کر کے فریق بنتا تو یہ مناسب نہیں تھا۔ میں جانتا تھا فون آفس تک جانے اور آنے کے دوران میں کئی چبھتے ہوئے سوال امریتا کے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم ترین سوال یہ بھی تھا کہ راکیش نے باؤجی سے مسلسل رابطے والی غلط بیانی کیوں کی۔

وہ کمرے کا دروازہ لاک کر کے کاؤنٹر پر چلی گئی اور شوہر سے رابطے کا جتن کرتی رہی۔ میں سر کے پچھلے حصے میں اب شدید درد محسوس کر رہا تھا۔ چوٹ ٹھنڈی ہو کر مزید تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ کندھے کے زخم سے بھی تھوڑا بہت خون رس رہا تھا اور سفید پٹی کو داغدار کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے اس تکلیف میں "تکلیف" محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اگر تھی بھی تو یہ لذت آمیز تکلیف تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے سڑک پر جو کچھ ہوا ہے وہ واقعی میں نے کیا ہے؟ اور وہ بھی ارباز کی مدد کے بغیر؟ ان لمحوں میں اتنی ہمت اور توانائی کہاں سے آ گئی تھی مجھ میں کہ میں مسلح ملائی غنڈوں سے بھڑ گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ سب کچھ میں نے...... دائم احمد نے نہیں کیا۔ کسی اور نے کیا ہے۔

امریتا کی واپسی پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ تالے میں چابی گھومی اور وہ خوشبو کے جھونکے کی طرح اندر آ گئی۔ خوشبو جس میں جالندھر کے سارے پانیوں' کھیتوں اور

پھولوں کے رنگ تھے۔ میں نے اُسے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو سر کے پچھلے حصے میں شدید ٹیس اُٹھی۔ وہ میرے تاثرات دیکھ کر بولی۔ ''ہائے ربا' لگتا ہے تمہیں زیادہ درد ہو رہا ہے۔ وہاں راکیش کے بیگ میں پین کلرز موجود ہیں۔ میں لاتی ہوں۔''

میرے منع کرتے کرتے وہ تھوڑا سا لنگڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے ''پین کلر اور سکون آور ٹیبلیٹس دیں۔ اس کی فکر مندی نہایت سادہ اور دلربا تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''فون ہوا راکیش کو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''گھنٹی بجتی ہے لیکن کوئی اٹھاتا نہیں ہے۔ سویرے پھر ٹرائی کروں گی۔''

وہ میرے اِرد گرد گھومتی رہی۔ لگتا تھا کہ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اُسے ڈر آ رہا ہے۔ واقعی جو کچھ آج ہوا تھا اس کے بعد امریتا کے لئے تنہا رات گزارنا کافی مشکل تھا۔ ممکن ہے کہ کسی حد تک میری تیمارداری بھی اس کے پیش نظر ہو۔ وہ وہیں ایک طرف کرسی ڈال کر بیٹھ گئی اور ہندی میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ پیشانی پر اُلجھنوں کے گہرے سائے تھے۔ بے خیالی میں وہ اپنے عجوبہ بالوں کو ہولے ہولے سہلا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ذہن میں جو سب سے بڑی پریشانی ہے وہ یہی ہے کہ وہ کل پروگرام کے مطابق باؤ جی کو فون نہیں کر سکے گی اور اگر فون نہیں کر سکے گی تو بہت سے سوالوں کے حتمی جواب نہیں مل سکیں گے۔

میں نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ دبلا ہونے کے باوجود دلکش تھا۔ اس کے دبلے چہرے کے حوالے سے ارباز کی رائے یہ تھی کہ اس کے جسم کی ساری توانائی تو اس کے طویل تر بال چوس لیتے ہیں۔ یہ بال واقعی اپنی مثال آپ تھے۔ غنودگی بھرے ذہن کے ساتھ میں نے سوچا۔ اگر امریتا لمبے قدرتی بالوں کے کسی Competition میں حصہ لے تو یقیناً بہترین پوزیشن حاصل کرے۔

پین کلر اور سکون آور دوا کا اثر تھا کہ میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں۔ پلکوں کی تھوڑی سی درز سے بھی میں امریتا کا چہرہ ہی دیکھتا رہا۔ پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ عجیب رات تھی۔ حالت نیند میں بھی مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ امریتا

میرے آس پاس موجود ہے۔ مجھ سے پانی پینے کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ تکیے پر میرا سر درست کر رہی ہے۔ میری پیشانی پر اپنا نرم ٹھنڈا ہاتھ رکھ رہی ہے۔ میرا جسم پھنک رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا۔ رات آخری پہر مجھے تیز بخار ہو گیا تھا۔ میری نیند میں کچھ وقفے غنودگی کے بھی آتے رہے۔ اس غنودگی میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ امریتا ابھی تک مصیبت میں ہے۔ میں اس کے لئے مقامی غنڈوں سے لڑ رہا ہوں۔ مار رہا ہوں اور مار کھا رہا ہوں۔

میری آنکھ اگلے روز گیارہ بجے کے قریب کھلی۔ بخار قدرے ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا' امریتا کمرے میں موجود نہیں ہے۔ ایکدم انجانے اندیشوں نے ذہن پر یلغار کر دی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ چابی گھما کر دروازہ کھولا۔ وہ لابی میں بھی نہیں تھی۔ ایک یورپین جوڑا بیٹھا بیئر پینے میں مصروف تھا۔

میں ننگے پاؤں امریتا کے کمرے تک پہنچا۔ یہاں جوتیاں کمرے سے باہر اتارنے کا رواج تھا۔ دروازے پر صرف امریتا کی سینڈل نظر آ رہی تھی۔ یقیناً وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ تیسری چوتھی دستک پر اندر سے مدھم آواز آئی۔ ''کون؟''

''میں دائم ہوں امریتا!''

میرا خیال تھا کہ وہ لپک کر آئے گی اور کہے گی کہ میں نے خود سے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کیوں کی اور اس طرح باہر کیوں نکل آیا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ دھیمے قدموں سے دروازے تک پہنچی۔ تھوڑا سا دروازہ کھولا اور قدرے سرد لہجے میں بولی۔ ''جاگ گئے ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے نیند میں چلنے کی عادت ہے؟''

وہ اس ہلکے پھلکے فقرے پر مسکرائے بغیر بولی۔ ''تمہاری دوائیں میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی ہیں۔ ہلکا سا ناشتہ کر کے لے لینا۔''

''ناشتے کو تو بالکل جی نہیں چاہ رہا۔ متلی سی ہو رہی ہے۔''

''متلی کی دوا بھی دراز میں ہے۔ وہ اورنج پتے والی گریوی نیٹ۔'' اس کا لہجہ

بدستور روکھا پھیکا تھا۔ ابھی تک اس نے مجھ سے نظر بھی نہیں ملائی تھی۔

میری سمجھ میں رویے کی یہ تبدیلی بالکل نہیں آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''راکیش کا کچھ پتہ چلا۔ میرا مطلب ہے فون ملا اس کا؟''

''نہیں۔'' جواب مختصر تھا۔

میں واپس کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ آج والی امریتا کل رات والی امریتا سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی۔ اس دوران میں شاید کوئی غیر متوقع بات ہوئی تھی۔

میرے کندھے اور سر کے پچھلے حصے سے مسلسل ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ بخار بھی تھا۔ کل رات سڑک پر پیش آنے والا واقعہ کھلی آنکھوں کے ڈراؤنے خواب جیسا لگ رہا تھا۔ ملائی غنڈے کا چاقو کتنی تیزی سے میرے چہرے کی طرف آیا تھا۔ اگر مجھے حرکت کرنے میں ایک لمحے کی دیر ہوتی تو پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جاتا۔ یہ بات اب بالکل واضح تھی کہ سیدھی سادی امریتا شادی کے نام پر یہاں خطرناک لوگوں میں آ پھنسی ہے۔ ان خطرناک لوگوں میں یقیناً اس کا بہروپیا پتی راکیش بھی شامل تھا۔ وہ امریتا کو اس ہوٹل میں محصور کر کے خود کہیں دفع ہو گیا تھا۔ اِردگرد کے علاقے میں ایسے لوگ موجود تھے جو امریتا کے لئے شدید خطرہ ثابت ہو سکتے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ امریتا کا اس ہوٹل میں رہنا خطرناک ہے بلکہ یہ ہم دونوں کے لئے خطرناک تھا۔ جو لوگ امریتا اور راکیش کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے کہ ہم اس علاقے میں کہیں موجود ہیں۔ وہ ہوٹلوں وغیرہ کے رجسٹر چیک کر سکتے تھے۔ جیسا کہ میں جانتا تھا۔ راکیش اس ہوٹل میں اپنے اصل نام سے ہی قیام پذیر تھا۔ تلاش کرنے والوں کے لئے اُسے ڈھونڈنا آسان ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے دوا کھا لی تھی۔ اب کندھے کی پٹی تبدیل کئے جانے کی ضرورت تھی اور یہ کام میں خود نہیں کر سکتا تھا۔ امریتا ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کا رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ میری خون آلود قمیص اور بنیان امریتا نے رات کو ہی دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دی تھی۔ اب ان دونوں چیزوں کو پہنا جا سکتا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ پٹی خون آلود تھی۔ قمیص پھر داغ دار ہو سکتی تھی۔ میں نے خون آلود پٹی کے اوپر ایک بڑا

شاپر چڑھایا اور قمیص وغیرہ پہن کر باہر لابی میں آ گیا۔

کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی نے انگریزی میں مجھ سے میری سر کی چوٹ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کل سڑک پر چلتے ہوئے ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس نے ہمدردی کا اظہار کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ میں لابی میں بیٹھ کر امریتا کا انتظار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کھڑکی میں سے دیکھ لے گی کہ میں لابی میں ہوں اور خود بھی تھوڑی دیر میں باہر آ جائے گی۔ مگر یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی۔ وہ جیسے کمرے میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ بالآخر میں خود ہی کمرے کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔ تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں آتی ہوں باہر۔''

میں واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ بھی باہر تھی۔ میں نے کافی منگوائی۔ وہ خاموشی سے اخبار پر نگاہ دوڑاتی رہی۔

میں نے کہا۔ ''امریتا! تم سے ایک دو بہت ضروری باتیں کرنی ہیں لیکن اس سے پہلے میں ایک بات تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''کیا؟''

''برا تو نہیں مانو گی؟''

''نہیں...... پوچھو۔''

''کیا کوئی غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟ صبح سے تمہارا رویہ بالکل بدلا ہوا ہے۔''

اس کے ملیح چہرے پر سنجیدگی بڑھ گئی۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہی۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔

''رات کو تم نے عجیب باتیں کی ہیں۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔''

''مم...... میں نے کی ہیں؟'' میں نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

''تم بخار میں بڑبڑاتے رہے ہو۔ ارباز سے جھگڑتے رہے ہو۔ اُسے برا بھلا

کہتے رہے ہو۔ پھر تم نے...... میرا نام بھی لیا ہے...... بڑے غلط طریقے سے۔'' امریتا نے کہا اور اس کی پلکیں شرم آمیز غصے کے ساتھ جھک گئیں۔ وہ اپنی انگلیوں کو مروڑنے لگی۔

میرے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ذہن میں ہزاروں ہی الفاظ گونجنے لگے۔ پتہ نہیں کیا کہہ دیا تھا میں نے؟ کل رات۔ واقعی میں نے عجیب عالم میں گزاری تھی۔ تکلیف، غنودگی، پریشانی اور خوف، بہت کچھ شامل تھا میری نیند میں۔

''کیا کہہ دیا تھا میں نے؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''بس چھوڑو اس بات کو۔ میں اب دہرانا نہیں چاہتی۔'' وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی۔

''اگر کوئی ایسی بات ہے تو...... میں معافی مانگ لیتا ہوں۔ دراصل......؟''

''بات معافی مانگنے کی نہیں داس۔ بات تو یہ ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''ہاں ہاں بولو امریتا۔'' میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''بات تو یہ ہے کہ یہ سوچ تمہارے دماغ میں کیوں آئی اور یہ کب سے ہے؟ اور ایسا کیوں ہوا ہے؟''

میں بری طرح سٹپٹایا ہوا تھا۔ خود کو ہی لعنت ملامت کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

اس نے پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''اب تو مجھے تم پر ایک اور شک بھی ہو رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب بھی تمہیں بتا دوں گی۔'' اس کا لہجہ عجیب تر تھا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور اندر چلی گئی۔ کل رات کی موچ کے سبب اس کے پاؤں میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ ذہن سوچوں کی آماجگاہ تھا۔ اپنی ہی کھوپڑی پر دو چار گھونسے رسید کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ تاہم اس جھلاہٹ کے ساتھ ساتھ ایک تھوڑی

سی راحت بھی تھی دل میں۔ جو بات میں باہوش و حواس شاید کئی ہفتوں تک نہ کہہ سکتا۔ وہ بے خودی کی کیفیت میں، میں نے کھٹاک سے کہہ ڈالی تھی۔ اب کس انداز میں کہی تھی اور کن الفاظ میں کہی تھی؟ اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ نہ ہی اس بات کا علم تھا کہ اس صورت حال کا نتیجہ کیا نکلنا ہے۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اپنی شادی اور اپنے پتی کے بارے میں اس کے خیالات وہ ہرگز نہیں تھے جو میرے تھے۔ پھر ابھی اس نے ایک ''شک'' کی بات کی تھی۔ یہ ایک مبہم سا اشارہ تھا۔ اس سے کوئی واضح مطلب نہیں نکلتا تھا۔

موجودہ صورت حال میں میری شخصیت کچھ مسخ سی ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے حوالے سے جو کچھ امریتا کے سامنے آ رہا تھا وہ ہرگز قابل ستائش نہیں تھا۔ اس میں عامیانہ پن بھی تھا۔ بے شمار ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن میں ہمراز دوست کی محبوبہ کو میلی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی ''محبت'' میں گرفتار ہوا جاتا ہے۔ پھر رقابت کی تکون بنتی ہے۔ ''یار مار'' ہونے کا خطاب بھی ملتا ہے، بے وفائی اور دھوکے بازی کے دھبے بھی دامن پر لگتے ہیں۔ کیا امریتا کی نظر میں، میں بھی ایک ایسا ہی بے وفا دوست تھا۔ جس نے دوست کے پیار پر ڈاکہ ڈالا تھا...... اس کے لئے آستین کے سانپ والا کردار ادا کیا تھا۔

میں سوچتا رہا اور عرقِ ندامت میں ڈوبتا رہا۔ میں نے جو بات کرنے کے لئے امریتا کو باہر بلایا تھا وہ بھی درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ میں امریتا کو اردگرد موجود خطرات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اور اُسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنا ٹھکانہ بدل لے۔ کیسے بدلے؟ کہاں جائے؟ یہ ڈسکشن بھی درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔

شام کو مجھے پھر بخار ہو گیا۔ سارا جسم پھنکنے لگا۔ کندھے کا زخم بھی تکلیف دے رہا تھا۔ میں نے درد کش گولیاں کھائیں اور کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ غنودگی طاری ہونے لگی۔ پتہ نہیں کتنی دیر اسی حالت میں رہا۔ امریتا بڑی بے حسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اسے کم از کم کندھے کی پٹی بدلنے میں تو مدد دینی چاہئے تھی۔ رات دس گیارہ کا وقت ہو گا۔ جب دروازے پر کھٹکا سنائی دیا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے

دیکھا۔ دروازے کی ناب ہولے سے گھومی۔ کوئی باہر موجود تھا۔ پھر لاک کھلا اور وہ اندر آ گئی۔

میں بستر پر ہی تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ ''تمہیں تو پھر تیز بخار لگتا ہے۔'' وہ مجھ سے نگاہ ملائے بغیر بولی۔

میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں وہ بے حد مصروف رہی۔ اس نے میرے کندھے اور سر کی پٹی بدلی۔ مجھے دوا کھلائی اور پینے کے لئے جوس وغیرہ دیا۔ تاہم اس ساری مصروفیت کے دوران میں اس نے کوئی بات نہیں کی...... اور نہ میری طرف دیکھا۔ اس کا لباس شکن شکن تھا اور بال بھی منتشر تھے۔ چہرے پر ایسی کیفیت تھی' جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ بخار اتنا شدید تھا کہ مجھے چکر محسوس ہو رہے تھے۔ میں تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن کہہ نہیں پا رہی تھی۔ کمرے کی خاموشی گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے کمرے میں آنے کے بعد پہلی بار میری طرف دیکھا اور عجیب لہجے میں بولی۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟''



میرے جسم میں ایک تیز سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کا فقرہ ایک گونج کی طرح میرے کانوں میں چکرانے لگا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟''

چند لمحے بعد میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ''میں سمجھا نہیں؟''

''لیکن میں سمجھ گئی ہوں' اور جان بھی گئی ہوں۔'' وہ اسی انداز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''ک...... کیا جان گئی ہو؟''

''شاید تم بھول رہے ہو کہ تم نیچے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنے ہاتھ سے اپنا نام پتا اور دوسرے کوائف لکھ کر آئے ہو۔ اپنی ہینڈ رائٹنگ میں۔''

میری کھوپڑی میں جھماکے ہوئے۔ میں سمجھ گیا کہ بات کس رُخ پر جا رہی ہے۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ''تمہاری انگلش ہینڈ رائٹنگ کے کچھ نمونے بھی ہیں تمہارے پتروں (خطوں) میں۔''

''م...... میرے پتروں میں؟''

''ہاں' تمہارے پتروں میں داجی! جو تم ارباز بن کر لکھتے رہے ہو۔ ایک سال تک مجھے بھیجتے رہے ہو۔ رنگ برنگے کاغذوں پر رنگ برنگے لفافوں میں...... بہت اچھا تماشا کیا ہے تم نے۔ میں تمہیں کیا سمجھتی رہی اور تم کیا نکلے ہو۔ کتنا بڑا دھوکا دیا ہے تم نے...... کتنا بے رحم ناٹک رچایا ہے۔ پڑھے لکھے ہو کر ایک تھرڈ کلاس آوارہ گرد کا سا کردار ادا کیا ہے تم نے اور ایسا کرتے ہوئے ایک سال میں تمہیں ایک بار بھی شرم نہیں' ایک بار بھی تمہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ تم کتنا بڑا مکر کر رہے ہو۔ اور اس مکر کا کسی'

کے جیون پر کیا اثر پڑے گا؟“

میں چپ تھا۔ کانوں میں طوفانی ہواؤں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ پھنکاری۔ ”کیا سمجھتے ہو تم لوگ ناری کو؟ ایک کھلونا...... ایک ٹانک کی چیز...... اسے تفریح کے لئے برتا‘ اس کے ساتھ کھیلواڑ کیا‘ اُسے اپنی من مرضی سے توڑا موڑا اور پھر بے کار کر کے پھینک دیا۔ ایسا کرتے ہوئے تم اپنی ماؤں‘ بہنوں کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔ کوئی اُن کے ساتھ ایسا بے رحم تماشا کرے‘ اسی طرح اپنی تفریح کے لئے انہیں اجاڑے‘ برباد کرے تو کیسا لگے گا تمہیں۔ بتاؤ کیسا لگے گا؟“ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔ وہ رونے لگی اور جب ایک بار اس کے آنسو نکلے تو پھر نکلتے ہی چلے گئے۔ یوں لگا جیسے کسی سیلابی پانی کا بند ٹوٹ گیا ہے۔

میں اپنی جگہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ایسے شخص کی طرح جس پر اچانک فردِ جرم لگا دی گئی ہو اور اس کے پاس صفائی کے لئے کوئی دلیل نہ ہو۔

پھر وہ ایکدم اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”تم یہاں کسی اور کے لئے نہیں کیول اپنے لئے آئے تھے۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں آئندہ تم سے ملنا نہیں چاہتی۔“ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

یوں لگتا تھا کہ اُسے خود اپنی سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے میری پٹیاں بدلی تھیں۔ مجھے دوا کھلائی تھی اور یہ بھی دیکھا تھا کہ فی الحال میں کہیں آنے جانے کے قابل نہیں ہوں اور اب وہ مجھے فوراً یہاں سے نکل جانے کا حکم دے رہی تھی۔

میں بستر پر لیٹا رہا اور بخار میں پھنکتا رہا۔ بازو اور ہاتھ پر کچھ سوجن بھی نظر آ رہی تھی۔ ذہن میں امریتا کے تند و تیز الفاظ مسلسل گونج رہے تھے۔

امریتا کو گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ہوٹل سروس والے تھے۔ انگلش میں مجھے بتایا گیا کہ میری فون کال ہے۔ پھر عرفات کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ہاں میرے شہزادے! پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں؟“

”سر کڑاہی میں بلکہ پورے کا پورا کڑاہی میں۔ سمجھو اُبلتے تیل میں تلا جا رہا

ہوں۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

”اوئے! تیری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔“ عرفات نے فکرمندی سے پوچھا۔

”شکر کرو کہ نکل رہی ہے۔“

”اوئے دامی! تم تو واقعی بیمار لگتے ہو۔ ہوا کیا ہے؟“

”وہی ہوا ہے جس کے بعد اکثر مسجد میں جنازے کا اعلان ہو جاتا ہے۔ سمجھو کہ مرتے مرتے بچا ہوں۔“

”کیا لڑائی ہوئی ہے کسی سے؟“ عرفات کے لہجے میں فکرمندی مزید بڑھ گئی۔

”بس یہی سمجھ لو لیکن فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔“

”ٹھیک ہے‘ ہم آ رہے ہیں۔ ابھی بیس پچیس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔“

”اررر نہیں۔ مرے ہوئے کو مارنے والی بات مت کرو۔ اتنی چوٹیں کھا کر جو تھوڑا بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے‘ مجھے اس سے بھی محروم کر رہے ہو۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں۔ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔“

”تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”سب کچھ سمجھا دوں گا لیکن فی الحال مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ پریشانی کی بات نہیں۔ اب میں کافی بہتر ہوں۔ ہاں ایک بات مجھے بتاؤ۔“

”کیا؟“

”کلانگ سے یہاں فون پر رابطہ ہو سکتا ہے؟“

”بالکل ہو سکتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ تم دونوں کلانگ واپس چلے جاؤ۔ میں تم سے خود فون پر رابطہ رکھوں گا۔ اگر تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو فوراً بلا لوں گا۔“

”نہیں میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

”یار! انڈین فلموں جیسے ’دوستی ڈائیلاگ‘ مت مارو۔ تم چلے جاؤ۔ بالفرض ضرورت پڑی تو تمہیں کال کر لوں گا۔“

دو تین منٹ کی بحث کے بعد میں نے عرفات اور ظہیر کو واپس جانے پر قائل

کرلیا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ بگیز کے اسٹار لائٹ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جوایک معروف ہوٹل ''سی ویو'' کے قریب واقع ہے۔

بخار شدید تھا۔ تھوڑی سی بات چیت کے سبب ہی میں ہانپ گیا۔

سارا دن تکلیف میں گزرا۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں گیا۔ مجھے اُمید سی تھی کہ شاید شام کی دوا کھلانے امریتا کمرے میں آئے لیکن یہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ میں نے جیسے تیسے خود ہی دوا کھائی اور بے سدھ ہو کر پڑا رہا۔ رات تو دس بجے تک ایک اور ڈویلپمنٹ ہوئی۔ کندھے سے لے کر کلائی تک شدید درد محسوس ہونے لگا۔ نبض کے ساتھ ایک ٹیس سی اُٹھ رہی تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ زخم میں انفیکشن ہے۔ بخار کی شدت بھی شاید اسی لئے بڑھ گئی تھی۔ میں سخت تکلیف میں تھا اور مجھے تیماردار کی ضرورت تھی۔ لیکن امریتا کے سوا مجھے کسی کی تیمارداری بھی درکار نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے عرفات اور ظہیر عباس کو آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ خاصی سخت دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں ساری رات تڑپتا رہا مگر کسی نے میری خبر نہیں لی۔ پچھلے پہر شاید تین ساڑھے تین کا وقت ہوگا۔ رات کے سناٹے میں مجھے لگا کہ دروازے کی ناب آہستہ سے گھومی ہے۔ میں نے دروازہ کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر آگئی۔ میں کروٹ کے بل خاموش لیٹا رہا۔ ''جاگ رہے ہو؟'' اس کی اشک بار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی دوسری آواز پر میں کسمسا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے ٹیوب لائٹ روشن کی۔ وہ ایک موٹے سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ بالوں کو ایک بڑے جوڑے کی شکل میں اس نے شال سے ڈھانپ رکھا تھا۔ میرا تمتمایا چہرہ دیکھ کر بولی۔ ''تمہارا بخار اُسی طرح ہے۔''

میں چپ رہا۔ اس نے بخار دیکھنے کے لئے میری پیشانی یا کلائی کو چھونے کی کوشش نہیں کی...... حالانکہ اس سے پہلے وہ ایسا کرتی تھی۔ اس نے مجھے جوس پلایا، دوا کھلائی، پھر میرے بازو کو دیکھ کر بولی۔ ''مجھے لگتا ہے، ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا پڑے گی۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی۔ بلکہ شاید بگڑ رہی ہے۔''

''لیکن اِس وقت اُنہیں جگانا مناسب نہیں۔ دو تین گھنٹے کی بات ہے۔ صبح دیکھ لیں گے۔''

اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ میری بات اُسے مناسب لگی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''راکیش سے تمہارا رابطہ ہوا؟''

''نہیں، گھنٹی ہوتی ہے لیکن کوئی اٹھاتا نہیں۔'' پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''کسی مسز ہوشا کا فون آیا تھا۔ پہلے راکیش کے بارے میں پوچھا۔ پھر میرے بارے میں۔ پھر کہنے لگی میں نے تم سے ملنے آنا تھا...... اسی دوران میں لائن کٹ گئی۔ میں ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی۔

''کون ہو سکتی ہے؟''

''بات تو بڑے پریم سے کر رہی تھی۔ راکیش کی کوئی کولیگ لگتی تھی۔''

امریتا مجھ سے بات تو کر رہی تھی مگر لہجے میں واضح بیگانگی تھی۔ وہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ کمرے میں بس اس کی سادہ سی خوشبو رہ گئی۔

اس روداد میں خطوں کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ مجھے جالندھر کے روز و شب یاد تھے۔ وہاں ارباز، امریتا اور لالہ وغیرہ کے درمیان جو گفتگو ہوتی تھی اس میں بھی بار بار خطوں کا ذکر ہی آتا تھا۔ مختلف خطوں پر تبصرہ ہوتا تھا۔ خطوں کے فقرے اور شعر یاد کیے جاتے تھے۔ لالہ اور باؤجی نے بھی خطوط کا خصوصی ذکر کیا تھا۔ اب امریتا کور پر واضح ہو چکا تھا کہ وہ خط میں ہی لکھتا رہا ہوں۔ اُسے اُن خطوں میں اور ارباز کی شخصیت میں تال میل نظر نہیں آیا تھا۔ کوئی خلا سا محسوس کرتی تھی وہ۔ اب پتہ نہیں اس خلا کی کیفیت کیا تھی۔ میرے حوالے سے وہ کس انداز سے سوچ رہی تھی؟

امریتا کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو وال کلاک دن گیارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میری آنکھ آہٹ کے سبب کھلی تھی۔ امریتا اندر آئی۔ اس کے ساتھ تھائی ڈاکٹر مسٹر چنگ بھی تھے۔ اُن کے ہاتھ میں بڑے سائز کا میڈیکل باکس تھا۔ یہ درمیانے قد اور درمیانی عمر کے خوش خلق صاحب تھے۔ اکثر تھائی اور ملائی لوگوں کی طرح صحت بہت اچھی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا امریتا اُن سے ملی تھی اور اس شرط کے ساتھ کہ وہ رازداری برتیں گے۔ انہیں میرے زخموں کے بارے میں بتایا تھا۔ اب وہ ٹریٹمنٹ کے لئے میرے کمرے میں موجود تھے۔

اگلا آدھا گھنٹہ ڈاکٹر چنگ بے حد مصروف رہے۔ انہوں نے میرے کندھے پر چار ٹانکے لگائے۔ سر کے زخم کو بھی اچھی طرح صاف کر کے بینڈیج کی۔ دو تین

انجکشن دیئے اور کھانے کے لئے بھی بہتر دوا دی۔ انہوں نے مجھ سے اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ جس کے سبب یہ زخم لگے۔ انہوں نے مجھے اور امریتا کو بتایا کہ یہاں سنگاپور میں کسی مریض کو اس طرح طبی امداد دینا قانونی زد میں آتا ہے۔ لیکن انہوں نے خوش اخلاق اور سادہ مزاج امریتا کی خاطر یہ رسک لیا ہے۔ امریتا نے بار بار اُن کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے امریتا سے صرف دواؤں کی قیمت ہی لی جو تقریباً 200 سنگاپوری ڈالر تھی۔

انجکشن وغیرہ لگنے کے آدھ پون گھنٹے بعد ہی میں خود کو کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج امریتا سے کچھ باتیں کرلوں۔ کیونکہ پروگرام کے مطابق آج شام تک راکیش کو واپس آجانا تھا۔ اس کے بعد تو ملاقات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ ڈاکٹر کے ساتھ ہی باہر چلی گئی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے شیو کر کے ایک ہاتھ سے منہ دھویا۔ جیسے تیسے قمیص پہنی اور بال سنوار کر باہر لابی میں آ گیا۔ بخار میں افاقہ محسوس ہوا تو کچھ کرارا کھانے کو دل چاہا۔ لنچ کا وقت تو ابھی نہیں ہوا تھا تاہم میں نے چکن ایلنڈ (حلال) منگوالیا اور ایگ فرائنڈ رائس کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کھانے لگا۔

اسی دوران میں امریتا اپنے کمرے سے برآمد ہوئی۔ چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے ایک پلیٹ میں سینڈوچ رکھے ہوئے تھے۔ یقیناً مجھے دینے جا رہی تھی۔ مجھے لابی میں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی اور میری طرف آ گئی۔

وہ ساڑھی میں تھی (اس خوبصورت ساڑھی میں اس کے سفید پوش باپ کا خون پسینہ جھلکتا تھا) اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی اس کے لمبے بال میز پر بیٹھ گئے۔ اس نے انہیں سمیٹتے ہوئے گود میں رکھا۔ چہرے کی گہری سنجیدگی برقرار تھی۔ شاید وہ کوئی کٹھور بات کہنے جا رہی تھی۔ اچانک اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور درمیانی عمر کی ایک عورت ہمارے سامنے آ گئی۔ وہ شکل وصورت سے فلپائنی لگتی تھی۔ اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ سڈول پنڈلیاں عریاں تھیں۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے۔ وہ ایک سمارٹ سا بریف کیس سامنے صوفے پر رکھتے ہوئے امریتا سے انگریزی میں مخاطب ہوئی۔

”یقیناً آپ ہی امریتا ہیں۔ کیونکہ آپ کے لمبے بال آپ کی پہچان ہیں۔“

”آ...... آپ کون؟“ امریتا نے پوچھا۔

وہ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام ہوشا ہے۔ کل آپ سے فون پر تھوڑی سی بات ہوئی تھی۔“

امریتا نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ہوشا نے مجھے سر کے اشارے سے سلام کیا اور پھر اجازت لے کر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ ”آپ کی تعریف“ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے امریتا سے پوچھا۔

”یہ پاکستانی دوست ہیں۔ یہاں ساتھ والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی بلکہ آپ دونوں سے مل کر۔“ اس نے رسمی انداز میں کہا۔ پھر امریتا سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میرا خیال ہے' مسٹر پانڈے نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ میں یونیورسل ملٹی میڈیا کی طرف سے آئی ہوں۔ آپ کی پہلی کمرشل کے بارے میں تفصیلات طے ہو گئی ہیں۔ اُمید ہے کہ اس ہفتے کے آخر تک ہم آپ کو شوٹ کر لیں گے۔ لیکن اس سے پہلے آپ کے ایک دو ”فوٹو سیشن“ بھی درکار ہوں گے۔ پہلا سیشن سوموار کو شیڈول ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک مسٹر پانڈے سے رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔ میں پریشان ہو رہی تھی۔ اس لئے چلی آئی۔“

امریتا ہونقوں کی طرح منہ کھولے مسز ہوشا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اس کی تقلید کر رہا تھا۔ بہرحال بات کچھ کچھ میری عقل میں آ رہی تھی۔ امریتا نے میری طرف دیکھا تو میں نے آنکھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کا کہا۔

تاہم اس سے پہلے ہی مسز ہوشا! امریتا کے تاثرات نوٹ کر چکی تھی۔ مسکرا کر بولی۔

”اوہو! مجھے لگتا ہے کہ مسٹر پانڈے نے ابھی تک آپ کو اس بارے میں تفصیل نہیں بتائی۔ لیکن وہ تو کہتے تھے ایک دو دن میں سب کچھ ”فکس“ ہو جائے گا۔ اوہ گاڈ! مسٹر پانڈے اِس وقت ہیں کہاں؟ میں تو اُن کا نمبر ملا کر باؤلی ہو گئی ہوں۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

”در...... دراصل' راکیش کو ایک ضروری کام سے جوہر بارو جانا پڑ گیا ہے۔“

امریتا نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے مجھے تھوڑا سا اشارہ تو دیا تھا لیکن تفصیل سے بات نہ کر سکے۔''

''کیا کہا تھا انہوں نے؟'' مسز ہوشا نے پوچھا۔

''یہی کمرشل والی بات کی تھی۔'' امریتا بولی۔

میں نے دل ہی دل میں اُسے شاباش دی۔ وہ ہوشیاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے پچانوے فیصد یقین تھا کہ وہ کمرشل وغیرہ کے بارے میں بالکل نہیں جانتی۔

مسز ہوشا نے شولڈر بیگ سے سگریٹ باکس نکالا لیکن پھر یہ احساس کر کے کہ یہاں سگریٹ نوشی ممنوع ہے اُسے دوبارہ اپنے بیگ میں رکھ دیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''دراصل آپ کے پتی راکیش پانڈے صاحب سے جب آخری ملاقات ہوئی تو ٹائم بہت شارٹ تھا اور پھر ایم ڈی رائٹ لی صاحب سے فائنل میٹنگ بھی نہیں ہوئی تھی۔ میٹنگ سے پہلے مجھے ایک دوسرے شیمپو کی کمرشل کے لئے روم فلائی کرنا تھا۔ اس ٹائٹ شیڈول کے سبب ہم کہیں اطمینان سے نہ بیٹھ سکے۔ اب مجھے فرصت ملی ہے تو مسٹر پانڈے دستیاب نہیں ہو رہے۔ جوہر بارو میں اُن کا کوئی ایڈریس وغیرہ ہے آپ کے پاس؟'' مسز ہوشا نے امریتا سے پوچھا۔

امریتا نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بظاہر پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ اس کا پتی اس کی مکمل بے خبری میں اس کی ماڈلنگ شروع کرا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس ماڈلنگ وغیرہ کے لئے کچھ رقم بھی کھری کر چکا ہو۔ مسز ہوشا کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا تھا۔

مسز ہوشا! کاؤنٹر پر چلی گئی۔ وہاں وہ بڑے سٹائلش انداز میں کھڑے ہو کر فون پر راکیش سے رابطے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے غالباً راکیش کے کسی دوست کا نمبر بھی ملایا اور اس سے بات کی۔ وہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر کامیابی کی کرن نہیں تھی۔

وہ کچھ دیر تک ہمارے پاس ٹھہری رہی۔ اس نے بڑے پروفیشنل انداز میں امریتا کے بالوں پر نگاہ دوڑائی۔ انہیں چھو کر دیکھا۔ پھر امریتا سے بولی۔ ''میں نے راکیش کو ایک فرنچ شیمپو اور کنڈیشنر دیئے تھے۔ ''موراوور'' نام تھا۔ وہی استعمال کر رہی

ہوتا؟'' امریتا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ویل ڈن امری! میں متاثر ہوئی ہوں لیکن راکیش کے نہ ملنے سے مایوسی ہو رہی ہے۔ میں زیادہ دیر رُک بھی نہیں سکتی۔ دو تھائی ماڈلز تین بجے والی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔ انہیں ریسیو بھی کرنا ہے۔ ان میں ایک لڑکا وہی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ تمہارے ساتھ شوٹ ہوگا۔ وہاٹ اے سیکسی بوائے۔'' پھر ذرا توقف سے بولی ''دراصل میری ذمے داریاں پروڈکشن منیجر کی ہیں۔ اس جاب میں بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ ایک کامن پن سے لے کر ہیلی کاپٹر تک ہر چیز کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب بڑے سخت بندے ہیں۔ شوٹنگ کے وقت کوئی کوتاہی برداشت نہیں کرتے۔ میں اب چلتی ہوں۔ لیکن امری ڈارلنگ! جیسے ہی راکیش سے رابطہ ہو اُسے میرے بارے میں بتاؤ۔ وہ جلد سے جلد فون کرے۔ او کے' گڈ نون' گڈ بائے۔'' اس نے امریتا کی طرف فلائنگ کس اچھالا اور جیسے تیزی سے آئی تھی' ویسے ہی لپکتی ہوئی واپس چلی گئی۔



میں اور امریتا ہکا بکا بیٹھے تھے۔ امریتا کا رنگ زرد تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کی آنکھوں سے پردے اُٹھ رہے ہیں۔ پہلے راکیش کی پُراسرار روپوشی اُسے الجھا رہی تھی۔ پھر راکیش کی یہ غلط بیانی اس کے سامنے آئی کہ وہ انڈیا میں باؤ جی سے ہر روز رابطہ کرتا رہا ہے۔ اب اُسے یہ تہلکہ خیز "جانکاری" ملی تھی کہ راکیش پانڈے بالا ہی بالا اُسے شوبز کی دنیا میں دھکیلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ہرن کے خوبصورت سینگوں کی طرح اس کے غیر معمولی بال ہی اُسے مشکلات کی جھاڑیوں میں پھنسا رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تو ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی تھی۔ ایک سیدھی سادی زندگی گزارنے کی خواہاں۔ وہ اپنے شریف النفس باؤ جی کی ڈھیروں دعائیں اور نیک تمنائیں اپنے پلو سے باندھ کر سمندر پار آئی تھی۔ اس نے دستور کے مطابق اپنا سب کچھ اپنے پتی کو سونپا تھا اور اس کے بدلے میں اس سے ایک باعزت جیون کی توقع کی تھی۔ لیکن یہاں تو سب کچھ تہ و بالا ہو رہا تھا..... سب کچھ جل کر راکھ ہوا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی خوبصورت پیشانی پر پسینے کی چمک تھی۔

"دای! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"سمجھنے کی کوشش کرو امریتا! ورنہ بہت کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں جانتا ہوں یہ سب تمہارے لئے بہت بڑا شاک ہے۔ تمہیں یقین کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ مگر حقیقت کتنی بھی کڑوی کسیلی ہو اُسے ماننا پڑتا ہے۔ پھر جب بندہ ایک دفعہ مان لیتا ہے تو اس میں حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی قدرت پیدا کر دیتی ہے۔"

"راکیش سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا۔ پچھلے تین دنوں میں......"

بات اس کے ہونٹوں میں ہی رہ گئی۔ میں نے اُسے چونکتے اور خوفزدہ ہوتے

دیکھا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے مڑ کر اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ کوئی فرد قالین پوش سیڑھیوں کے موڑ پر اوجھل ہو گیا۔

امریتا نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "دای! اندر کمرے میں آ جاؤ۔"

ہم اُٹھ کر امریتا کے کمرے میں چلے گئے۔ وہ لرز رہی تھی "کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مم...... مجھے لگتا ہے میں نے ایسے بندے کو دیکھا ہے جو فون ایکسچینج میں بھی ہمارے قریب موجود تھا۔ آدھا گنجا ہے، ہونٹ بالکل کالے ہیں۔"

"تمہیں شبہ ہوا ہوگا۔"

"پتہ نہیں..... لل..... لیکن مجھے تو وہی لگتا ہے۔ میں نے دھیان سے دیکھا تو ایک دم واپس چلا گیا۔"

میری اپنی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ میں نے کہا۔ "امریتا! میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ اگر دیر کریں گے تو کوئی بڑی مصیبت آ پکڑے گی۔"

وہ چند لمحے تک سخت متذبذب رہی۔ پھر اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ "لیکن جائیں گے کہاں؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہیں اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

تین چار منٹ کی گفتگو کے بعد وہ میری رائے سے متفق ہو گئی۔ اس نے اپنا پرس مجھے تھمایا اور بولی۔ "نیچے جا کر ہوٹل کا بل پے کر دو۔ میں اتنی دیر میں ضروری سامان سمیٹ لیتی ہوں۔"

پرس میں کافی رقم موجود تھی۔ تاہم میں نے اس میں سے اندازے کے مطابق صرف امریتا کے کمرے کا کرایہ ہی لیا۔ باقی رقم میں نے اپنی جیب سے ڈالی۔ نیچے استقبالیہ پر پہنچ کر میں نے دونوں کمروں کا حساب کرایا اور پے منٹ کر دی۔ جب تک میں کمرے میں واپس پہنچا امریتا سامان پیک کر چکی تھی۔ یہ سامان ایک بڑے اٹیچی ایک چھوٹے اٹیچی اور ایک شولڈر بیگ پر مشتمل تھا۔

میں نے کہا۔ "امریتا یہ کپڑے بھی بدل لو۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"کوئی ٹراؤزر نہیں تمہارے پاس......اور شرٹ وغیرہ؟"

"ہاں' ایک ٹراؤزر تو ہے۔ آف سلیو شرٹ بھی ہے۔"

"میرے خیال میں تو ساڑھی کی جگہ یہی پہن لو۔"

وہ میری بات سمجھ گئی اور جلدی سے اٹیچی کے ساتھ ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ پانچ دس منٹ بعد وہ باہر نکلی تو بالکل بدلی ہوئی نظر آئی تھی۔ شاید وہ اُن لڑکیوں میں سے تھی جن پر ہر لباس بچ جاتا ہے۔ اس نے اپنے پانچ ساڑھے پانچ فٹ لمبے بالوں کو بڑی خوبی سے لپیٹ کر ایک جوڑے کی شکل دے دی تھی اور اس جوڑے پر ایک ہیئر نیٹ چڑھا دیا تھا۔ میں نے تجویز پیش کی اور اس نے ایک بڑے رومال کو اسکارف کی طرح اپنے سر اور کانوں کے گرد لپیٹ لیا۔ اب طائرانہ نظر سے دیکھا جاتا تو وہ مسلمان ملائیشین لڑکی دکھائی دیتی۔

میں نے نیچے جا کر ٹیکسی کا انتظام کر لیا اور سامان ٹیکسی کی ڈکی میں پہنچا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئی۔ ہوٹل کے دروازے سے نکلتے ہی وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ویٹرز کو ٹپ دے کر میں بھی اس کے ساتھ پچھلی نشست میں گھس گیا۔ یہ ایک لگژری ٹیکسی تھی۔ ڈرائیور بھی سوٹڈ بوٹڈ تھا۔ شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے "بگیز" چلنے کو کہا۔

اِردگرد نظر آنے والا ہر چہرہ دل و دماغ میں اندیشے جگا رہا تھا۔ میں نے امریتا سے اردو میں کہا۔ "تمہارا یوں سیدھے بیٹھنا ٹھیک نہیں ہو سکے تو لیٹ جاؤ۔ یہ ظاہر کرو کہ بیمار ہو۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کروٹ کے بل لیٹ گئی لیکن جگہ اتنی نہیں تھی کہ اس کا سر نشست سے ٹک سکتا۔ اس کا سر خود بخود میرے دائیں زانو پر آ گیا۔ میں اس کے سر کے ساتھ ساتھ اس کے کان اور رخسار کا لمس بھی اپنے زانو پر محسوس کرنے لگا۔ بدن میں عجیب سی لہریں جاگ اُٹھیں۔ چند لمحوں کے لئے جی چاہا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔ وہ اِسی طرح اپنا سر میرے زانو پر رکھے لیٹی رہے۔ میں اس کے سانس کی حرارت اس کے لمس کی نرمی محسوس کرتا رہوں۔

سوٹڈ بوٹڈ ڈرائیور عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "سوری امریتا! ڈرائیور پیچھے دیکھ رہا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے اپنا ہاتھ امریتا کے سر پر رکھ دیا۔ اس کے کچھ بال اسکارف میں سے باہر نکل رہے تھے۔ میں اُنہیں سہلانے لگا۔

"کیا یہ بیمار ہیں؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"اگر آپ کہیں تو گاڑی کا اے سی آن کر دوں؟"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔"

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ابھی دفاتر میں چھٹی نہیں ہوئی تھی۔ نہایت گنجان آبادی والے سنگاپور کی سڑکیں خالی خالی نظر آ رہی تھیں۔ فلک بوس عمارتوں میں لاکھوں لوگ روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ اُن کی ہزارہا گاڑیاں پارکنگ لاٹس میں تھیں۔ کہیں کوئی افراتفری یا بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ ہر جاندار و بے جان شے ایک نظام کے تابع محسوس ہوتی تھی۔ سنگاپور میں جگہ جگہ سگریٹ پینا منع......تھوکنا منع......کھانا منع وغیرہ کے بورڈ نظر آتے ہیں اور یہ خالی ہدایت ہی نہیں ہوتی ساتھ میں خلاف ورزی پر معقول جرمانے کا اعلان بھی ہوتا ہے اور صرف اعلان ہی نہیں ہوتا جرمانہ باقاعدہ وصول بھی کیا جاتا ہے۔ جن دنوں کا یہ ذکر ہے مندرجہ بالا خلاف ورزیوں کے لئے جرمانے کی شرح تقریباً 400 ڈالر تھی۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں بگیز کے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں مجھے سی ویو ہوٹل کی تلاش تھی۔ میں نے ڈرائیور سے سی ویو ہوٹل چلنے کو کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ سی ویو ہوٹل' سمندر کے نظارے کے لئے جا رہے ہیں تو پھر نہ جائیں۔"

"کیوں؟"

"وہ کسی زمانے میں سی ویو تھا۔ لیکن اب اس کی دائیں طرف تین بڑی بلڈنگیں بن گئی ہیں۔ وہ دیکھیں ساتھ ساتھ کھڑی ہیں۔ اب وہاں سے سمندر نام کی کوئی

شے نظر نہیں آتی۔"

"نہیں، ہمیں سمندر کا شوق نہیں۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

ہم سی ویو کے سامنے ٹیکسی سے اُتر گئے۔ ڈرائیور میٹر کے مطابق کرایہ لے کر چلا گیا۔ درحقیقت میں اُسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا تھا جہاں چار دن پہلے عرفات اور ظہیر عباس ٹھہرے تھے۔ اس ہوٹل کا نام اسٹار لائٹ تھا۔ لیکن میں ٹیکسی کو اسٹار لائٹ کے سامنے لے جاتا تو یہ ایک مخدوش عمل ہوتا۔ بالفرض ہوٹل نیو براڈوے سے راکیش ہماری تلاش شروع کرتا تو وہ اسی ٹیکسی کا کھوج پا سکتا تھا جو ہمیں یہاں سی ویو کے سامنے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ اس سوٹڈ بوٹڈ ٹیکسی ڈرائیور کے ذریعے ہمارا کھرا دبا سکتا تھا۔

ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ہم نے سڑک پار کی اور سی ویو ہوٹل کی بلند عمارت کے مشرق کی طرف آ گئے۔ اپنی فون کال میں عرفات نے بتایا تھا کہ سی ویو کے عین سامنے سے سڑک پار کر کے اور دو بلڈنگیں چھوڑ کر اسٹار لائٹ ہوٹل میں پہنچا جا سکتا ہے۔ امریتا میرے ساتھ پیدل چلتے ہوئے اب بھی تھوڑا سا لنگڑا رہی تھی۔ بڑے اٹیچی کے ساتھ پہیے تھے۔ میں اُسے رول کرتا ہوا لا رہا تھا۔ چھوٹا اٹیچی میں اپنے بائیں ہاتھ میں اُٹھانا چاہتا تھا لیکن میرے زخمی کندھے کے پیشِ نظر امریتا نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اب چھوٹا اٹیچی اور شولڈر بیگ اس کے پاس تھے۔ اس نئے علاقے میں پہنچ کر ہم نفسیاتی طور پر خود کو ایک دم ہلکا پھلکا اور محفوظ تصور کرنے لگے تھے۔ جلد ہی ہوٹل اسٹار لائٹ نظر آ گیا۔ یہ ہوٹل ایک پندرہ منزل بلڈنگ کے پانچویں فلور پر واقع تھا۔ بلڈنگ کی طرح ہوٹل بھی پرانا لگتا تھا۔ بہرحال فی الوقت تو ہمیں سر چھپانے کی ضرورت تھی۔ علاقہ جتنا غیر معروف ہوتا اتنا ہی ہماری سلامتی کیلئے موزوں تھا۔

میں جانتا تھا کہ عرفات اور ظہیر کل دوپہر یہاں سے رخصت ہو چکے ہوں گے۔ انہیں میں نے ہی جانے کے لئے کہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ ہوٹل میں "سیٹ" ہونے کے بعد انہیں Kluang میں فون کروں گا۔ میرے خیال میں اب مجھے عرفات کی معاونت کی ضرورت تھی۔

ہوٹل پہلے ہوٹل کی نسبت کافی سستا تھا۔ لیکن اندر سے اتنا برا بھی نہیں تھا۔ ہمیں ایک ڈبل بیڈ کمرا صرف 65 سنگاپوری ڈالر میں مل رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ

امریتا میرے ساتھ ایک کمرے میں رہنا پسند کرے گی یا نہیں لیکن اگر ہم علیحدہ کمروں میں رہتے تو یہ بھی تھوڑا سا مشکوک ہوتا...... اور اس کے ساتھ ساتھ مہنگا بھی۔ ابھی میں اس بارے میں امریتا سے مشورہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ اور میں بے طرح چونک پڑا۔ یہ ایشین بریڈ مین ظہیر عباس تھا۔ وہ ایک موٹی بھدی سری لنکن یا مدراسی خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا نیچے اُتر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی ایکدم چونک گیا۔ پھر اس نے خاتون سے اجازت لے کر اُسے رخصت کیا اور سیدھا میری طرف آ گیا۔ "دائم صاحب! آپ یہاں؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے جناب کہ میں عرفات بھائی کے کہنے پر ہی یہاں موجود ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"عرفات بھائی کا خیال تھا کہ ابھی ہمیں یہاں سے نہیں جانا چاہئے لیکن اُن کا ورکشاپ پہنچنا بھی ضروری تھا۔ اگر وہ کل بھی نہ جاتے تو کام رُک جاتا۔ آپ سے فون پر بات ہونے کے بعد وہ کلانگ کے لئے نکل گئے تھے۔ لیکن اُن کا پروگرام واپس آنے کا تھا۔ اسی لئے مجھے یہاں چھوڑ گئے۔ ابھی ایک گھنٹا پہلے اُن کا فون آیا ہے۔ وہ واپس آ رہے ہیں اور اُن کے واپس آتے ہی ہم نے آپ کو براڈوے ہوٹل میں فون ملانا تھا۔ لیکن آپ خود یہاں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے اس کی بالکل توقع نہیں تھی۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

مجھے کل ہی شک تھا کہ عرفات میری بات نہیں مانے گا۔ وہ ان غیر یقینی حالات میں مجھے تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔

ظہیر عباس کے اس طرح اچانک مل جانے سے ایک مسئلہ تو فوراً حل ہو گیا۔ میں، ظہیر اور عرفات کے کمرے میں ایڈجسٹ ہو سکتا تھا۔ امریتا علیحدہ کمرے میں رہ سکتی تھی۔ ہم نے رجسٹر پر اندراج وغیرہ کرایا اور اوپر آ گئے۔ یہاں کمرا بک کرانے کے لئے پاسپورٹ دکھانے کی شرط نہیں تھی۔ میں نے بکنگ کے لئے اپنا نام اشرف لکھوایا۔

جلد ہی ہم تینوں امریتا والے کمرے میں تھے...... عرفات بھی متوقع ٹائم پر ہوٹل آ دھمکا۔ ظہیر کی طرح وہ بھی مجھے اور امریتا کو دیکھ کر ازحد حیران ہوا۔ اس کے ساتھ

ہی اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے بھی لہرا گئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر امریتا سامان سمیت یہاں میرے ساتھ نظر آ رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ حالات میں ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔

پھر اس کی نگاہ میرے سر کی چوٹ پر پڑی۔ ''اوئے...... گھامڑ! یہ تربوز کو کہاں سے ٹک لگوا کر آ گیا ہے؟'' وہ مخصوص لہجے میں بولا۔

''تربوز میں ہی ٹک نہیں ہے' ایک کندھا بھی ''ریٹائرڈ ہرٹ'' ہے۔'' میں نے اطلاع دی۔

وہ ایک دم فکرمند ہو گیا اور مجھے سرتاپا ٹٹولنے لگا۔ ''کہیں مارا ماری ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تو کیا میں آئس ہاکی کھیلتا ہوں؟''

''کون تھے وہ؟''

''یہی جاننے کے لئے تو اس ہوٹل میں آیا ہوں۔ سنا ہے ہوٹل کا مالک طوطا فال نکالتا ہے۔''

''مذاق چھوڑ دیار۔ میں پریشان ہو گیا ہوں۔'' عرفات کا لہجہ گمبھیر تھا۔

میں نے امریتا سے کہا کہ وہ دروازے کو اندر سے لاک کر لے۔ ظہیر کو میں نے احتیاطاً سامنے ٹیرس میں بٹھا دیا اور خود عرفات کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گیا۔ عرفات کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے دماغ میں بہت سے سوال کلبلا رہے ہیں۔ اندر پہنچتے ہی اس نے اپنی چمکدار وسیع پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''ہاں' اب بتا۔ کیا چاند چڑھا کر آ رہا ہے ہوٹل میں؟''

اس موقع پر عرفات سے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ساری روئیداد مختصر الفاظ میں عرفات کے گوش گزار کر دی۔ فون ایکسچینج سے کچھ فاصلے پر دھینگا مشتی کا خونی واقعہ سن کر عرفات بھی دنگ رہ گیا۔ اُسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ ایک شاہراہ عام پر مجھ پر غنڈوں نے چاقو سے حملہ کیا اور امریتا کو زبردستی گاڑی میں ڈالنے کی کوشش کی۔

''گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کیا تو نے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کوئی پولیس رپورٹ؟''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ ایک شریف لڑکی کا معاملہ ہے یار! اور پھر پردیسی ہیں ہم دونوں۔''

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگا۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''یار دامی! دیکھو' اگر تم مجھے امریتا' کمانڈو اور اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے نہیں تو میں سخت اُلجھن میں پڑا رہوں گا۔ کوئی درست مشورہ تمہیں دے سکوں گا اور نہ ٹھیک طرح سے مدد کر سکوں گا۔''

''بتا تیری رضا کیا ہے؟'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔ کچھ بھی نہ چھپاؤ۔''

اور اگلے ایک گھنٹے میں' میں نے واقعی اُسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔ خطوں سے لے کر جالندھر پہنچنے تک اور جالندھر میں ارباز کی گرفتاری سے لے کر لاہور واپسی تک سبھی کچھ عرفات کے گوش گزار کر ڈالا۔ یہاں تک کہ اس ٹیلیفونک گفتگو کے بارے میں بھی بتا دیا جو چند دن پہلے میرے اور ارباز کے درمیان ہوئی تھی...... اور جس میں ارباز نے اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا تھا کہ امریتا کا ورق اس کی زندگی کی کتاب سے علیحدہ ہو چکا ہے۔

عرفات اس ساری روداد کو بے حد حیرت اور دُکھ کے عالم میں سنتا رہا۔ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے۔ میں بھی ارباز کے بارے میں صرف سچائی بیان کر رہا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی قطع برید میں نے اس سچائی میں نہیں کی تھی۔ امریتا کے بارے میں اپنی دلی کیفیات بتاتے ہوئے مجھے تھوڑی سی جھجک تو محسوس ہوئی لیکن میں نے یہ سب کچھ بھی وضاحت سے عرفات کے گوش گزار کر دیا۔

کہتے ہیں کہ ایک اچھا دوست زخموں کا مرہم بن جاتا ہے۔ عرفات کو سب کچھ بتا کر میں بھی خود کو ایکدم ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ میری بات اختتام کو پہنچی تو عرفات گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''تم کہتے ہو کہ تمہیں کمانڈو (ارباز) سے اس قسم کے رویے کی توقع نہیں تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس کے بارے میں ہمیشہ سے ایسی ہی

توقع تھی۔ بے شک وہ ہمارا دوست ہے۔ لیکن سچی بات یہی ہے کہ وہ خود پسند اور اپنے مفاد کا بندہ رہا ہے۔ تمہیں وہ گاڑی والی بات تو یاد ہی ہوگی صرف ایک ڈینٹ پڑنے پر اس نے گاڑی ہی اونے پونے بیچ دی تھی۔"

میں نے کہا۔ "یقین کرو عرفات! مجھے ڈر لگتا ہے کہ اس معاملے میں مجھے بے وفا دوست نہ سمجھا جائے۔ میں تمہارے سامنے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ آخر وقت تک میری یہ بھرپور کوشش رہی ہے کہ میں کسی بھی حوالے سے ارباز اور امریتا کے درمیان نہ آؤں۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ ارباز نے خود کو یکسر امریتا کی زندگی سے نکال لیا ہے۔ اور اُسے بدترین حالات میں تنہا چھوڑ دینا چاہتا ہے تو پھر..... سب کچھ آپوں آپ ہی ہوگیا۔ پتہ نہیں کس طرح میں نے خود کو یکدم امریتا کے اتنے قریب محسوس کیا۔ میرے لئے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ میں سب کچھ تماشائی بن کر دیکھتا رہوں....."

"میں تمہاری پوری بات سمجھ رہا ہوں دای! اور تم سے مکمل اتفاق بھی کرتا ہوں۔" اس نے بڑے خلوص سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہماری گفتگو کا رُخ امریتا اور اس کے موجودہ حالات کی طرف مڑ گیا۔ یہ حالات خاصے اُلجھے ہوئے بلکہ پُر اسرار تھے۔ امریتا کو بارونق سڑک پر زبردستی کار میں ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مجھ پر چاقو سے خطرناک حملہ ہوا تھا۔ یونیورسل ملٹی میڈیا کی مسز ہوشا ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آئی تھی اور اب ...... چند گھنٹے پہلے براڈوے ہوٹل میں امریتا کو شبہ ہوا تھا کہ ایک ناپسندیدہ شخص اس کے آس پاس موجود ہے۔ ممکن تھا کہ یہ آخری شبہ صرف شبہ ہی ہو لیکن اس نے امریتا کو بے حد مضطرب کیا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں پھر امریتا کے پاس موجود تھا۔ وہ اب کپڑے بدل چکی تھی اور شلوار قمیص میں نظر آ رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی میں سے سڑک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ہوٹل کے عین سامنے ایک پچیس تیس منزلہ بلڈنگ زیر تعمیر تھی۔ عمارت کی چوٹی پر دو جہازی سائز کرینیں مصروف کار تھیں اور کھلونوں کی طرح نظر آتی تھیں۔

کافی کی چسکی لیتے ہوئے میں نے امریتا سے کہا۔ "امریتا! میں جانتا ہوں

میری ان باتوں سے تمہیں دُکھ پہنچے گا لیکن حقیقت کا سامنا کئے بغیر چارہ نہیں۔ راکیش وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ پرتاپ سنگھ اور راج سنگھ بھی وہ نہیں۔ ان لوگوں نے باؤجی کی سادگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہیں استعمال کیا ہے۔ انڈیا میں لڑکیوں کے رشتے اور خاص طور سے متوسط گھرانے کی لڑکیوں کے رشتے ملنے جتنے دشوار ہیں تم جانتی ہی ہو۔ ان لوگوں نے باؤجی کو اچھے رشتے کا لالچ دے کر اُن سے غلط فیصلہ کرایا ہے۔ یہاں پہنچ کر جو کچھ میں نے معلوم کیا ہے وہ تکلیف دہ ہے۔ راکیش کی ریپوٹیشن عورتوں کے معاملے میں بالکل اچھی نہیں۔ وہ اپنی پرکشش شخصیت کا فائدہ اٹھا کر انہیں ورغلاتا ہے' استعمال کرتا ہے۔ جان ینگ نام کے مقامی بدمعاش سے راکیش کا جھگڑا بھی کسی لڑکی کے سلسلے میں ہی ہے۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں....."

"پلیز دای! امریتا نے میری بات کاٹی' مجھے سوچنے کا موقع دو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کچھ بھی ہے۔ آخر وہ میرا پتی ہے۔ اس کے ساتھ میرا جیون جڑ چکا ہے۔ اگر..... اس میں کوئی برائی ہے بھی تو' اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اس سے ناتا ہی توڑ لوں۔ مم..... میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اُسے سمجھنا چاہتی ہوں۔ میرا اور اس کا سمبندھ ایسا نہیں کہ پل بھر میں جڑوں سے کاٹ کر پھینک دیا جائے۔"

"امرت! مجھے ڈر ہے کہ اس سے ملنے اور اُسے سمجھنے کی کوشش میں تم اپنی شناخت ہی نہ گنوا بیٹھو۔ وہ..... خطرناک ہے۔ اور اگر خود خطرناک نہیں تو خطرناک لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "کچھ بھی ہے دای! میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ جب تک ہم اس کے سارے حالات نہ سمجھ لیں۔ اس کے بارے میں حتمی فیصلہ کیسے دے سکتے ہیں۔"

"میں تمہیں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔ تم اس بات کو غنیمت سمجھو کہ ہم ہوٹل سے بچ کر نکل آئے ہیں۔ ورنہ خبر نہیں اب تک کیا ہو جاتا۔ اب بہتر طریقہ یہ ہے کہ تم سب سے پہلے جالندھر میں باؤجی سے رابطہ کرو اور اُن کی رائے لو۔"

"وہ اتنی دور بیٹھ کر مجھے کیا رائے دے سکیں گے۔ راکیش کو جس طرح میں سمجھ سکتی ہوں کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میں جلد از جلد اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"تو تم اُسے یہاں بلاؤ گی؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

وہ چند سیکنڈ چپ رہی پھر ہولے سے بولی۔ "میں اسے بلا چکی ہوں۔ ابھی فون پر میری بات ہوئی ہے اس سے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ جی چاہا اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دوں اور چلا کر پوچھوں۔ "بیوقوف! یہ کیا کیا ہے تم نے؟"

لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ بس لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ وہ مجھ سے نظر چراتے ہوئے بولی۔ "وہ ایک گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں یہاں۔"

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا امرت! کم از کم مجھ سے مشورہ ہی کر لیتیں۔" میرا لہجہ گمبھیر تھا۔

"مم...... میں بس یونہی نمبر ملا رہی تھی۔ اچانک بات ہو گئی۔" اس نے ڈھیلی ڈھالی دلیل پیش کی۔

"اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"میں تمہیں حکم دینے والی کون ہوتی ہوں۔ تم میرے لئے جو کر رہے ہو وہ ہمیشہ میرے من پر نقش رہے گا۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ راکیش کے آنے کے بعد بھی مجھے یہاں رہنا چاہئے؟"

"اگر جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ اگر رہنا چاہتے ہو تو پھر بھی...... کوئی حرج نہیں۔" وہ تذبذب سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ راکیش تمہیں صورت سے نہیں جانتے' نہ تمہارے دوستوں کو جانتے ہیں۔ تم نے یہاں اپنا نام بھی اشرف لکھوایا ہے۔" وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن خوبصورت ہونٹ لرز کر ساکت ہو گئے۔

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ مجھے کسی بچے کی طرح ڈری' سہمی اور کنفیوژ نظر آئی۔ جیسے وہ اپنے باؤ جی کے پیچھے چلتی چلتی گھر سے دور نکل گئی ہو اور اکیلی رہ گئی ہو۔ اب ایک تاریک شام میں ایک صدراہے پر سوچ رہی ہو کہ کس طرف جائے؟ اس کے باؤ جی کس طرف ہیں؟ اس کا گھر کس طرف ہے؟"

میرے اندر کے غصے پر ایک دم پانی کے چھینٹے پڑنے لگے۔ میں نے پوچھا۔ "راکیش کو ہوٹل چھوڑنے اور یہاں پہنچنے کے بارے میں کیا بتاؤ گی؟"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "میں راکیش سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی۔ کیول مجبوری کے کارن تمہارے بارے میں چھپاؤں گی۔ میں راکیش سے کہوں گی کہ میں تمہارے بارے میں بس یہی جانتی ہوں کہ تم پاکستانی ہو اور براڈوے ہوٹل میں ہمارے پڑوسی تھے۔ میں چونکہ فون کرنے جانا چاہتی تھی اس لئے میں نے تمہیں ساتھ لے لیا۔ فون ایکسچینج کی بلڈنگ سے واپسی پر نامعلوم کار سواروں نے ہم پر حملہ کیا اور تم میری رکھشا کرتے ہوئے گھائل ہوئے۔ بعد میں ہم نے خوفزدہ ہو کر ہوٹل تبدیل کر لیا۔"

"اور اگر کوئی ایسا شخص راکیش کے ساتھ ہوا جو مجھے صورت سے جانتا ہوا تو پھر؟ میرا مطلب ہے کہ پرتاپ یا راج سنگھ وغیرہ۔"

"میرا وشواس کرو۔ ان دونوں میں سے کوئی یہاں نہیں آئے گا۔"

میں ایک دکھی سانس لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھیک ہے امرت! میں ابھی یہیں ہوں۔ تم ملو راکیش سے اور بات کرو۔ لیکن اس پر اندھا دھند بھروسا نہ کرنا۔ میں تاکید کرتا ہوں۔"

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر آ گیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے امریتا کے پتی دیو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لفٹ سے باہر نکلا اور متوازن قدموں سے چلتا امریتا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ دراز قد اور اسمارٹ تھا۔ ناک کا بانسہ اونچا اور بال چمکیلے تھے۔ اس نے زبردست قسم کا پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں بریف کیس اور ہونٹوں میں سگریٹ تھا۔ اس کی صورت کافی حد تک اپنے چاچا راج سنگھ سے ملتی تھی۔

امریتا کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا اور میرے دماغ میں ہزار ہا دروازے کھل گئے۔ ہر دروازہ اندیشوں کی گہری تاریکی میں پہنچاتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ امریتا ایک لرزتی ہوئی چڑیا ہے اور ایک سنہری عقاب اُسے اپنے خونخوار پنجوں میں دبوچنے کے لئے دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گیا ہے۔ وہ اس کے ساتھ کیا کرے گا؟ کہیں وہ اسے جسمانی نقصان نہ پہنچائے؟ کہیں اُسے بے ہوش کر کے یہاں سے

نکالنے کی کوشش نہ کرے؟ کہیں یہ نہ ہو کہ چار پانچ غنڈے بھی یہاں پہنچ جائیں اور امریتا کو لے کر آناً فاناً یہاں سے نکل جائیں؟ ان گنت سوالات تھے۔ اور ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر ایسا کچھ ہوا تو ہم تینوں کا ردِعمل کیا ہونا چاہئے۔ اس سب کے علاوہ ایک اور اُلجھن بھی ذہن کو بار بار کچوکے لگا رہی تھی۔ ہوٹل نیو براڈوے کے رجسٹر میں، میں نے اپنے ہاتھ سے اپنا نام دائم احمد اور اپنا پتا وغیرہ لکھا تھا لیکن اس ہوٹل میں نام اشرف لکھا تھا۔ اگر بالفرض راکیش تفتیش کے چکر میں پڑتا تو یہ غلط بیانی اس کے سامنے آسکتی تھی۔ تاہم نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ اتنی گہرائی میں نہیں جائے گا۔

راکیش قریباً سات بجے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بعد دروازہ نہیں کھلا، نہ ہی کوئی ویٹر کمرے میں داخل ہوا۔ قریباً تین گھنٹے بعد دس بجے کے لگ بھگ مجھے اچانک امریتا کی صورت نظر آئی۔ وہ اپنے گیلے بالوں کو برش کرتی ہوئی دو سیکنڈ کے لئے باہر آئی اور ڈسٹ بن میں چند ٹشو پیپرز پھینک کر اندر چلی گئی۔ قریباً آدھا گھنٹا مزید گزر گیا۔ پھر امریتا اور راکیش دونوں باہر آئے۔ امریتا نے ہمارے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا اور وہیں ٹھہر گئی۔ راکیش لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہمارے دروازے کی طرف آیا۔ عرفات نے کہا۔ ”لے بھئی! پہنچ گیا تیرا رقیب روسفید۔“

میں نے کھڑکی کا پردہ برابر کیا۔ چند سیکنڈ بعد بیل ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ راکیش نے تیز نظروں سے مجھے سرتاپا گھورا۔ جیسے ایک ہی لمحے میں میری پوری شخصیت کا ایکسرے کرنا چاہتا ہو۔ پھر اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچے۔

”ہیلو۔ سوری ٹو ڈسٹرب یو۔ میرا نام راکیش! ہے۔ میں امریتا کا پتی ہوں۔“

”اوہو۔“ میں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا نام اشرف ہے۔ میں ہوٹل براڈوے میں بھی آپ کا پڑوسی تھا۔“

”مجھے آپ کے بارے میں کچھ بتایا ہے امریتا نے۔“ راکیش نے احسان مند لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں، عرفات اور ظہیر بھی دروازے پر آگئے۔ میں نے ان دونوں کا تعارف بھی راکیش سے کرایا۔ ظہیر کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کی طرح راکیش بھی چونکا۔

میں نے کہا۔ ”جی ہاں راکیش صاحب! یہ ظہیر عباس ہی ہے، کرکٹ کھیلتا ہے لیکن ایک چیز ”مسنگ“ ہے۔ یہ ٹیسٹ کرکٹر نہیں ہے۔“

”اوہو۔ یعنی ہم شکل۔“ وہ حیران ہو کر بولا۔

”بالکل۔ فلموں میں ہم شکل اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اب قدرت پیدا بھی کرنے لگی ہے۔“

”یعنی فلموں والے نیچر کے مطابق نہیں چلے۔ اب نیچر نے فلموں کے مطابق چلنا شروع کر دیا ہے۔“ راکیش نے کہا۔

ایک ہلکا سا قہقہہ پڑا۔ اس قہقہے نے ماحول کا تناؤ کچھ کم کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں، امریتا اور راکیش بالکونی میں رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ راکیش کی غیر معمولی اونچی ناک کے دونوں طرف اس کی آنکھیں چمکیلی اور بھوری تھیں۔ وہ قیمتی ٹی شرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی زنجیر تھی۔ بائیں ہاتھ میں غالباً شادی کی انگوٹھی نظر آ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”امریتا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اشرف صاحب! میں نے امریتا کو بڑی سختی سے منع کیا تھا کہ وہ ہوٹل سے باہر نہیں جائے گی۔ لیکن اس سے غلطی ہوئی۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے۔ میرے لئے سب سے زیادہ متاثر کرنے والی بات یہ ہے کہ آپ نے صحیح معنوں میں ہم وطن ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ ایک اجنبی کے لئے اس طرح اپنی جان داؤ پر لگا دینا معمولی بات نہیں ہے۔ واہگرو کی سوگند میرے پاس لفظ نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔“

”آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔ مسز امریتا کے ساتھ جو کچھ ہونے جا رہا تھا میں خاموشی سے دیکھتا رہتا تو شاید کبھی اپنے آپ سے آنکھ نہ ملا سکتا۔“

”یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا؟“

میں نے راکیش کو لوکیشن کے بارے میں بتایا اور باقی واقعہ بھی تفصیل سے بیان کیا۔ وہ بڑے دھیان سے سنتا رہا۔ آخر میں بڑے یقین سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں انہیں سستے میں نہیں چھوڑوں گا۔ پورا پورا حساب ہوگا ان کا۔“ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر میری چوٹوں کے بارے میں اور علاج کے متعلق پوچھنے لگا۔ میں نے اُسے ضروری باتیں بتائیں۔

اسی دوران میں کافی آ گئی اور گفتگو کا رُخ کچھ تبدیل ہو گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ راکیش صاحب! گفتگو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ ذرا موضوع بدلنے کی کوشش کریں۔''

وہ ہنسا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' پھر کافی کی چسکی لے کر بولا۔ ''آپ پاکستان کے کس شہر سے تشریف لائے ہیں۔''

''لاہور سے۔''

''ونڈرفل۔ لاہور میرا بھی پسندیدہ شہر ہے۔ میرے ایک ماموں لاہور شاہ عالمی بازار کے رہنے والے تھے۔ پارٹیشن کے وقت جالندھر آئے۔ اُن سے لڑکپن میں لاہور کی اتنی باتیں سنی ہیں کہ میرے سپنوں کا شہر بن گیا ہے۔ لاہور کے بارہ دروازے دریائے راوی، کامران کی بارہ دری، مہاراجا رنجیت سنگھ کی مڑی اور پھر شاہی قلعہ، انارکلی اور کلفشن۔ پتہ نہیں کیا کچھ میرے وچاروں میں بسا ہوا ہے۔''

''کلفشن تو لاہور میں نہیں۔'' امریتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی جالندھر تو ابھی تک آپ نے پورا دیکھا نہیں۔ لاہور دیکھنے کے لئے سمے (وقت) کہاں سے لائیں گے۔''

''تمہارے جیسی سندر پتنی ساتھ ہو گی تو پھر سے بھی نکل آئے گا۔'' وہ جھٹ بولا۔

وہ بظاہر ہلکی پھلکی باتیں کر رہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس کے ملائم لہجے کے عقب میں کہیں سانپ کی پھنکار سنائی دیتی تھی۔ یہی کیفیت اس کی اونچی ناک کی دونوں طرف اس کی بھوری آنکھوں کی تھی۔ یہ آنکھیں بظاہر مسکرا رہی تھیں لیکن ان کے پس منظر میں کہیں بجلی سی لپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عام شخص نہیں تھا۔ وہ خطرناک تھا۔ جو شخص جان ینگ جیسے خوفناک بدمعاش سے پنگا لے سکتا تھا وہ عام کیسے ہو سکتا تھا۔ جو کچھ نظر آ رہا تھا وہ فریب تھا یا فریب نظر۔

اس شخص نے امریتا کو بھی پتہ نہیں کیا دلائل دیئے تھے کہ وہ بھی خاصی حد تک مطمئن نظر آ رہی تھی۔ امریتا کے ذہن میں بے شمار دہکتے سوالات تھے۔ اور ان میں سے دو سوال زیادہ اہم تھے۔ راکیش نے یہ غلط بیانی کیوں کی کہ وہ انڈیا میں امریتا کے

لواحقین سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔ دوسرا سوال یہ کہ وہ اس کی بے خبری میں اسے شوبز کی خطرناک دنیا میں کیوں دھکیل رہا تھا؟

قریباً ایک گھنٹہ تک کافی کی پیالیوں کے گرد بیٹھنے کے بعد ہم اُٹھ گئے۔ راکیش نے مجھ پر یہی ظاہر کیا کہ لین دین کے ایک تنازع کے سبب کچھ لوگ اس کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور وہ عنقریب انہیں ٹانگوں سے پکڑ کر کورٹ میں گھسیٹنے والا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ فی الوقت ان لوگوں کی دسترس سے دور رہنے کے لئے وہ اور امریتا اسی گمنام ہوٹل میں قیام کریں گے۔

امریتا سے اطمینان سے بات کرنے کا موقع مجھے اگلے روز شام کو مل سکا۔ کچھ ہی دیر پہلے راکیش ایک ٹیکسی پر سوار ہو کر کہیں نکل گیا تھا۔ چھتری اور بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد امریتا بالکونی میں آ بیٹھی۔ وہ ایک نئی بنارسی ساڑھی میں تھی۔ ہاتھوں میں نئی ہفت رنگ چوڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں (پہلی چوڑیاں ملائی غنڈوں کے ساتھ کھینچا تانی میں ٹوٹ گئی تھیں) اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ اس میک اپ نے اس کے چہرے کو ایک دم دلکش کر دیا تھا۔ مگر اس دلکشی کے اندر ایک دکھ سا بھی لو دے رہا تھا۔ جیسے ریشمی پردے کے پیچھے شمع جل رہی ہو۔ اس کے لمبے بال بل کھا کر اس کی گود میں آرام کر رہے تھے۔ جونہی میں بالکونی میں نکلا وہ مسکرا کر میری جانب دیکھنے لگی۔

''بیٹھنے کی اجازت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شرمندہ کر رہے ہو؟''

میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ سنگاپور آج ابر آلود تھا۔ سمندر کی طرف سے خنک ہوا چل رہی تھی۔ اس ہوا میں گرد جیسے نام کو نہیں تھی۔ مجھے کپڑے پہنے اور بوٹ پالش کئے ہوئے پانچ دن ہو چکے تھے اور یہ ابھی صاف ستھرے تھے۔

''کیا بات ہوئی راکیش سے؟'' میں نے بلاتمہید پوچھا۔

''کافی لمبی بات ہوئی ہے۔'' وہ بولی۔

''راکیش نے میرے تقریباً سارے سوالوں کا جواب دیا ہے اور میں محسوس کرتی ہوں دای کہ مجھے راکیش کی وضاحتوں کا وشواس کرنا چاہئے۔''

”بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اگر مناسب سمجھو تو ان وضاحتوں کی کچھ وضاحت بھی کر دو۔“

”دادی! مجھے اپنا یہ اندازہ سو فیصد درست لگتا ہے کہ راکیش کسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ بات تو کسی طور میرے دماغ میں بھی نہیں آئی تھی کہ وہ میری جانکاری کے بغیر ہی مجھے ماڈلنگ کے بیہودہ چکر میں ڈالیں گے۔“

”کیا کہا ہے راکیش نے؟“

”انہوں نے بتایا ہے کہ جس بندے کے ساتھ ان کا جھگڑا چل رہا ہے۔ اس کا نام جان ینگ ہے۔ وہ بالکل ناجائز طور سے راکیش پر چار لاکھ سنگاپوری ڈالر کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اس دعوے کی قانونی حیثیت اتنی کمزور ہے کہ وہ کورٹ میں جانے کی بجائے یہ مسئلہ غنڈہ گردی سے حل کرنا چاہتا ہے۔ شادی کے بعد جب راکیش میرے ساتھ انڈیا سے یہاں پہنچے تو سینڈیز ہوٹل میں جان کے آدمیوں نے مجھے اور راکیش کو اکٹھے دیکھا۔ اس کے بعد جان نے پی سی ہوٹل میں راکیش سے ایک میٹنگ کی اور اس کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ اس نے کہا۔ اگر راکیش مجھ سے ایک پروڈکٹ کی ماڈلنگ کرائے اور یہ معاہدہ کرے کہ میں دو برس کے لئے کیول ایک ہی کمپنی کے لئے ماڈلنگ کروں گی تو وہ چار لاکھ ڈالر کے دعوے سے پیچھے ہٹ جائے گا۔ نہ صرف پیچھے ہٹ جائے گا بلکہ کل آمدنی کا پندرہ پرسنٹ مجھے اور راکیش کو ادا بھی کرے گا۔ راکیش کو یہ تجویز ہرگز قبول نہیں ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ جان ینگ کس قماش کا بندہ ہے اور اس کے ساجھے دار اور سنگی ساتھی کس طرح کے ہیں۔ دوسرے انہیں بھی سب کچھ معلوم تھا کہ شوبز میں کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد جان اور راکیش کا وردوھ اور گھمبیر ہو گیا۔ جان نے راکیش کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ راکیش میرے ساتھ نیو براڈوے میں روپوش ہو گئے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کی قانونی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ وہ اپنے وکیل سے ملنے جوہر بارو چلے گئے اور اب تک وہیں پر تھے۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس دن براڈوے میں جو مسز ہوشا تم سے ملنے آئی تھی وہ راکیش کی نہیں جان کی ساتھی تھی؟“

”اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟“

”لیکن وہ تو راکیش کا نام لے رہی تھی۔ اور بار بار فون بھی راکیش کو کر رہی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ جان ینگ کی ساتھی ہوتی تو ہم وہاں سے بچ کر نہ نکل پاتے۔ وہ ہمارے اردگرد اپنے نگران کھڑے کروا دیتی اور ہمیں وہاں سے جنبش بھی نہ کرنے دیتی۔“

”ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا انتظام ہی کر رہی ہو۔ ہمارے نکلنے سے کچھ ہی دیر پہلے ایک بری شکل تو نظر آئی تھی وہاں۔ کیا خبر کچھ اور ایسی شکلیں بھی وہاں پہنچنے والی ہوں۔“

”تم نے راکیش سے مسز ہوشا کے بارے میں پوچھا ہے؟“

”ہاں۔ وہ اس تیز طرار عورت کو کیول اس حد تک جانتے ہیں کہ وہ جان ینگ سے ملتی ہے اور اس کے لئے عیاشی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ چند دن پہلے اس نے راکیش سے فون پر بات کی تھی اور اس سے ملاقات کا ٹائم مانگا تھا۔ لیکن راکیش نے منع کر دیا۔ راکیش کا کہنا ہے کہ وہ بے حد چالاک اور حیلہ ساز عورت ہے۔ اُسے ”ماچانے گو“ بھی کہا جاتا ہے۔ چینی زبان میں ”ماچانے گو“ کا مطلب دیواروں میں راستہ بنانے والی ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ عورت جان اور راکیش کے درمیان پل بننے کی کوشش کر رہی تھی۔“

اچانک مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ میں نے پوچھا۔ ”راکیش نے اپنے ٹیلیفون والے جھوٹ کی کیا وضاحت کی ہے؟“

”ہاں وہ اس کے لئے شرمندہ ہیں۔ انہیں بھی فون ایکسچینج تک جانے میں وہی خطرہ تھا جو بدھ کے دن ہمارے سامنے آیا۔ ہم ہوٹل سے نکلے اور مرتے مرتے بچے۔ راکیش میری تسلی کے لئے ہوٹل سے نکل تو جاتے تھے۔ لیکن نیچے جا کر ایک بک شاپ پر بیٹھ جاتے تھے۔ واپسی پر میرے اطمینان کی خاطر مجھے بتاتے تھے کہ باؤجی سے بات ہو گئی ہے۔“

اچانک میری نگاہ بالکونی سے نیچے سڑک پر گئی۔ راکیش ایک ٹیکسی سے اتر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کئی شاپنگ بیگ تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ امریتا کی دلجوئی کیلئے

کچھ خریداری کر کے آیا ہے۔ اس کی خریداری میں شیمپین کی دو بوتلیں بالکونی سے ہی نظر آ رہی تھیں۔ یہ بوتلیں یقیناً اس کی اپنی ''دلجوئی'' کے لئے تھیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے معصوم امریتا کا کومل جسم راکیش کی مکروہ بانہوں میں دیکھا اور سینے میں انگارے سے دہکنے لگے۔

خبر نہیں کیوں؟ کہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آواز آئی۔ یہ ارباز کی امریتا نہیں تھی۔ یہ راکیش کی امریتا بھی نہیں ہے۔ یہ تو میری امریتا ہے۔ بہت پہلے سے' بہت زمانے سے۔ یہ لڑکی اپنے من موہنے لفظوں میں سما کر مجھ سے ملتی تھی۔ لاہور کی اس پر بہار شام میں جب ہوا خوشبو سے لدی تھی اور آسمان پر شفق کے رنگ تھے۔ وہ یکسر انجانی تھی۔ لیکن مجھے لگا تھا کہ میں اُسے پہلے سے جانتا ہوں۔ میں نے پہلے پہل کہاں دیکھا تھا اسے۔ شاید ساون کی پہلی بارش میں' شاید سرما کی اس دھوپ میں جو کئی دن بعد نکلی تھی' یا پھر گرمیوں کی ایک ٹھنڈی چاندنی رات میں' یا پھر کسی رنگا رنگ تہوار کی آمد سے ایک دن پہلے جب میرے اندر بے وجہ خوشی ناچ رہی تھی۔



رات کو ہم سنگاپور کے مشہور سینتھوسا آئی لینڈ میں رنگین فواروں کا رقص دیکھنے کے لئے گئے۔ اُن دنوں یہ رقص ریہرسل کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ کنارے سے جزیرے تک کا سفر ایک خوبصورت فیری میں کیا۔ ٹکٹ اڑھائی ڈالر تھا۔ فیری میں غیر ملکی سیاحوں کی بھرمار تھی۔ ایک یورپین لڑکی بڑے عجیب سے موڈ میں اپنے بوائے فرینڈ کے کندھے سے سر لگائے کھڑی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ اس ہجوم میں خود کو یکسر اکیلا محسوس کر رہی ہے۔ بس وہ ہے اور اس کا بوائے فرینڈ ہے۔ وہ لہروں کی طرف منہ کر کے دھیمی آواز میں کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ یہ غالباً ڈچ زبان تھی۔ مجھے اس کے الفاظ تو سمجھ میں نہیں آئے۔ لیکن گیت کی لے میرے دل کی گہرائی میں اُتر گئی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ غم کا گیت ہے۔ آج اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی میں اس چاندنی رات' اس فیری' اس لڑکی اور اس آواز کو یاد کرتا ہوں تو دل میں عجیب سا گداز جاگ جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں وہ لڑکا لڑکی اب کہاں ہوں گے؟ اُن کے نام کیا تھے؟ اُن کے کام کیا تھے؟ وہ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں جا رہے تھے؟ اور تو اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ گیت جو میں نے سنا تھا اس کا مطلب کیا تھا؟ وہ ناقابل فہم گیت اور وہ لڑکا' لڑکی دنیا کی بھیڑ میں گم ہو چکے ہیں۔ پھر کبھی نہ ملنے کے لئے۔ لیکن وہ آج بھی میرے حافظے پر نقش ہیں۔ ہاں کچھ لمحے ایسے ہی انمٹ ہوتے ہیں۔

جلد ہی ہم جزیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں قدیم عہد کی ایک بہت بڑی سفید عمارت ہے۔ میں نے عمارت کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن معلوم نہ ہو سکا۔ عمارت کے اندر سے گزر کر نکلے تو ایک سٹیڈیم نما جگہ نظر آئی۔ یہاں مختلف تفریحات موجود تھیں۔ میرے اردگرد لوگ مسکرا رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے' جھوم رہے تھے لیکن

میرے دل کا موسم اور تھا...... بالکل مختلف...... سوچوں کے سارے راستے امریتا کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے اپنے اِردگرد اس کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ مجھے ہر نسوانی قہقہے پر اس کے قہقہے کا شبہ ہو رہا تھا۔ الیکٹرک جھولوں کے قریب کھڑی ایک لڑکی کو دیکھ کر تو مجھے بالکل یہی لگا کہ وہ امریتا ہے۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" عرفات نے مجھے ٹہوکا دیا۔

اسی دوران میں لڑکی اپنے ساتھی کے ساتھ گھومی اور اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ امریتا نہیں تھی۔ میں اپنے آپ میں جھینپ کر رہ گیا۔ چند دن پہلے میں نے امریتا سے جھوٹ بولا تھا کہ سرِ راہ مجھے ایک لڑکی پر اس کا شبہ ہوا اور میں اسے دیکھنے کے چکر میں اپنا ہاتھ زخمی کرا بیٹھا۔ لیکن آج سچ مچ مجھے بصری واہمے ہو رہے تھے۔

"ہر لڑکی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ کہیں کسی سے پٹوا نہ دینا۔" عرفات نے کہا۔

"یار! سب کو کہاں، ایک ہی کو دیکھا ہے۔ وہ بھی کسی اور کے شبے میں۔"

"اچھا تو اب عشق میں یہ مقام آ گیا ہے۔ وہ کیا گیت ہے اس طرح کا خدا کرے کہ محبت میں یہ مقام آئے...... کسی کا نام لوں لب پہ تمہارا نام آئے۔ لیکن بندۂ خدا! یہ بھی ذہن میں رکھ کر ہمارے ساتھ ظہیر عباس ہے۔ اگر بھونڈی کے الزام میں ہمیں کسی سے مار پڑی تو کل اخبار میں اس طرح کی نیوز آئے گی۔ "سٹار پاکستانی بیٹسمین کی دو ساتھیوں سمیت ٹھکائی۔ میتھوسا آئی لینڈ میں لڑکیاں پٹا رہے تھے۔"

شاید عرفات کو توقع تھی کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہم آئی لینڈ کے ایک نسبتاً پُرسکون گوشے میں جا بیٹھے۔ کوک کا گھونٹ لیتے ہوئے میں نے کہا۔ "یار عرفات! ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ امریتا کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو جانا ہے۔ وہ بڑی سادہ ہے۔ راکیش کو بالکل سمجھ نہیں پا رہی۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا رہا ہے۔"

"میں تم سے اِتفاق کرتا ہوں۔ لیکن کریں کیا؟"

"کوئی ایسا طریقہ ہو کہ ہم امریتا کو راکیش اور پرتاپ سنگھ کا اصل چہرہ دکھا سکیں۔"

"اس کا ایک ہی راستہ میری سمجھ میں آتا ہے۔" عرفات نے کہا "کیسل کلب چلیں۔"

"کیسل کلب؟"

"آرچرڈ روڈ کے علاقے میں ہے۔ انٹری فیس کچھ زیادہ ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ ہم وہاں کھائیں پئیں گے نہیں، بچت ہو جائے گی۔ یہ کیسل کلب جان ینگ کے ایک پرانے دوست کی ملکیت ہے۔ ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب جان ینگ عام طور پر اس کلب میں پایا جاتا ہے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"ایک تو تم اس مردود کا چہرہ دیکھ پاؤ گے۔ دوسرے وہاں ایک انڈین ویٹر اسماعیل ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ ہمیں مل جائے تو اس سے گپ شپ کر کے ہمیں کچھ نہ کچھ آئیڈیا ہو جائے گا کہ جان ینگ اور راکیش میں جھگڑا کیا ہے۔ ایسے جھگڑے عموماً راز نہیں رہتے۔ خاص طور سے یہ ویٹر لوگ جو ہر جگہ ٹرے لے کر پہنچ جاتے ہیں بہت کچھ سن گن رکھتے ہیں۔"

"دیکھ لو۔ جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن......" میں بات کہتے کہتے رک گیا۔

"یار! بات تو مکمل کرو۔" عرفات نے چڑ کر کہا۔

میں نے کہا۔ "ہمیں ایک بات کا دھیان رکھنا ہو گا۔ جن ملائی غنڈوں نے خود کو "پولیس" ظاہر کر کے امریتا کو کار میں ڈالنے کی کوشش کی وہ مجھے بھی دیکھ چکے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان غنڈوں میں سے کوئی جان کے آس پاس موجود ہو اور مجھے پہچان لے۔"

"ہاں۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ ایسا ہو گا۔ جان کے سیکڑوں کارندے ہیں۔ ضروری نہیں کہ جن دو تین بندوں نے تمہیں دیکھا ہے وہ کل جان ینگ کے ساتھ کلب میں موجود ہوں۔ جان ایسا شخص نہیں جسے گارڈز کی ضرورت ہو۔ وہ اکثر اکیلا ہی گھومتا پھرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں صرف تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا۔ اگر تم مطمئن ہو تو پھر ٹھیک ہے۔"

''یا پھر ایسا کرتے ہیں۔تم نہ جاؤ۔ میں اور ظہیر ہو آتے ہیں۔''

''بالکل نہیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں انکار کیا۔''اگر تم مجھے چھوڑ کر Kluang نہیں گئے تو میں تمہیں چھوڑ کر ہوٹل میں کیسے بیٹھا رہوں۔'' تھوڑی سی بحث تمحیص کے بعد طے ہو گیا کہ کل ہم کیسل کلب جائیں گے۔

اگلے روز ہفتہ تھا۔ ہم شام کے وقت تیار ہو کر کلب روانہ ہو گئے۔ تاہم آج ہم نے کل والی غلطی نہیں دہرائی۔ ہم نے ظہیر کو ہوٹل میں ہی رہنے دیا۔ امریتا اور راکیش کمرے میں موجود تھے۔ (کچھ دیر پہلے تک راکیش صرف ایک نیکر اور بنیان پہنے اندر باہر گھوم رہا تھا۔ وہ ہم سے ہنس کر دوستانہ انداز میں بات کرتا تھا اور خود کو خوش اخلاق ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔) ہم نے ظہیر کو ہدایت کر دی کہ اگر بالفرض ایسے آثار نظر آئیں کہ امریتا اور راکیش ہوٹل چھوڑ رہے ہیں تو وہ ان کے پیچھے جائے اور کسی بھی صورت انہیں اوجھل نہ ہونے دے۔

جب ہم نیچے سڑک پر پہنچے تو سنگاپور کی ایک رنگین رات دھیرے دھیرے در و بام پر اتر رہی تھی۔ دفاتر اور شاپنگ سینٹرز کی رونقیں محدود ہو رہی تھیں۔ تفریح گاہوں' ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں کی گہما گہمی بڑھ رہی تھی۔ میں نے آج سہ پہر ہی عرفات کے ساتھ جا کر دو نئی شرٹس اور ایک پینٹ خرید لی تھی۔ اکلوتا ان دھلا جوڑا لانڈری میں دے دیا تھا۔ بچت کے نظریے سے ہم ایک ڈبل ڈیکر میں سوار ہوئے۔ سنگاپور میں ان دنوں ٹکٹنگ کا خودکار نظام شروع ہو چکا تھا۔ ڈرائیور اکیلا ہی بس کا کرتا دھرتا تھا۔ اسی کی انگلی کی جنبش سے دروازہ بند ہوتا اور کھلتا تھا۔ مسافر سوار ہوتے وقت ایک باکس میں سکے ڈالتا تھا' ڈرائیور بٹن دبا کر دوسرے باکس سے ٹکٹ نکال دیتا تھا۔ ہم بڑے مناسب سے کرائے میں' یعنی چند سینٹ میں آرچرڈ روڈ پہنچ گئے۔ سنگاپور میں گھومتے پھرتے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم شہر میں نہیں کسی کے گھر میں گھوم رہے ہیں۔ سڑکوں پر گھومتے سیکڑوں ہزاروں لوگ اس گھر کے مکین محسوس ہوتے ہیں جو اپنے گھر کے ہر پھول بوٹے کے نگہبان اور صفائی ستھرائی کے ذمے دار ہیں۔ ہم گھر کے ڈرائنگ روم میں تھوک نہیں سکتے' نہ پھل کا چھلکا پھینک سکتے ہیں۔ ان حوالوں سے دیکھا جائے تو پورا سنگاپور ایک ڈرائنگ روم لگتا ہے۔

کیسل کلب' آرچرڈ روڈ سے تھوڑا ہٹ کر ایک بارونق علاقے میں تھا۔ کاروں کے ایک بہت بڑے شوروم کے ساتھ ہی کیسل کلب کا مین گیٹ تھا۔ عمارت میں اختراع یہ تھی کہ ساری کی ساری کسی قدیم قلعے کی طرز پر تعمیر کی گئی تھی۔ موٹی لکڑی کے محرابی دروازوں پر آہنی میخیں گڑی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر لگے وال پیپرز سے تاثر ملتا ہے کہ یہ پتھریلی دیواریں ہیں۔ ایک چھوٹی سی آبی گزرگاہ کو ایک چوبی پل کے ذریعے پار کر کے کلب کی اصل عمارت میں داخل ہوا جاتا ہے۔ کلب کی اندرونی آرائش اور ملازمین کے لباس بھی عمارت کی مناسبت سے ہیں۔ 100 سنگاپوری ڈالرز کے دو ٹکٹ لے کر ہم ایک ہال میں پہنچ گئے۔ یہاں تمباکو کا دھواں' الکحل کی بو اور نیم برہنہ ڈانسرز تھیں۔ میوزک زور و شور سے بج رہا تھا۔ ایک فتنہ ساماں ہمارے پاس آئی اور مقامی زبان میں کچھ کہا۔ عرفات نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ چلی گئی۔

میں نے پوچھا۔''کیا کہہ رہی تھی؟''

''کہہ رہی تھی کچھ کھاؤ پیو تاکہ میں تمہاری جیب خالی کر سکوں...... اسے کیا پتہ' ہم یہاں صرف کوک پئیں گے اور وہ بھی ایک بوتل لے کر آدھی آدھی۔''

ایکدم عرفات چونک کر میرے عقب میں دیکھنے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے ویٹر اسماعیل نظر آ گیا ہے لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ عرفات نے جذباتی لہجے میں سرگوشی کی' ایک دم گھوم کر نہ دیکھنا۔ جان بیگ تمہارے پیچھے سیڑھیوں کے درمیان کھڑا ہے۔''

عرفات کی بات سمجھ کر میں نے غیر محسوس طور پر دو تین مرحلوں میں اپنا رخ پھیرا اور سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ قریباً بیس قدم کے فاصلے پر قالین پوش سیڑھیوں کے وسط میں گول تمتمائے چہرے والا ایک تنومند شخص موجود تھا۔ اس کی آنکھیں جو پہلے ہی چھوٹی تھیں شراب کی سوجن کی وجہ سے اور بھی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ اس کی عمر اڑتیس چالیس سال رہی ہو گی۔ مجھے لگا جیسے میں جدید لباس میں کسی قدیم خونخوار تاتاری کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک بہت کھلے سے جیکٹ نما لبادے میں تھا۔ انگلیوں میں بیش قیمت انگوٹھیاں تھیں۔ جین کی پتلون اس کی نہایت مضبوط ٹانگوں پر کسی ہوئی تھی۔

جس وقت میں نے اسے دیکھا' وہ ایک نیم برہنہ ڈانسر کو کسی بات پر ڈانٹ

رہا تھا۔ وہ ساکت و جامد کھڑی تھی۔ اپنی کانپتی ٹانگوں کو سہارا دینے کے لئے اس بے چاری نے جیسے سیڑھیوں کی ریلنگ کا سہارا لے رکھا تھا۔ غضب کے عالم میں جان کا چہرہ اور بھی سفاک دکھائی دیتا تھا۔ شور کی وجہ سے جان کے الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ تاہم ایک دو بار ایسا لگا کہ وہ ابھی ڈانسر کو تھپڑ دے مارے گا۔ جان کی لرزہ خیز ڈانٹ سن کر رقاصہ آنسو پونچھتی ہوئی...... مرے مرے قدموں سے گیلری کی طرف چلی گئی۔ جان ینگ ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ باتیں کرتا اور ہاتھ لہراتا ہوا گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ پھر وہ کلب کے آفس کی طرف چلے گئے۔

عرفات نے سرگوشی کی۔ ''دیکھا اس ریچھ کو۔ ایک دم خونخوار ہے۔ غصے میں بالکل جانور بن جاتا ہے۔ دو مہینے پہلے اس نے ایک اٹالین سیاح کی فرنچ کٹ داڑھی کتے کے پیشاب سے منڈوا دی تھی۔ سیاح کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے ''ایسٹ کوسٹ پارک'' میں جان کے کتے کو ٹانگ سے دھکیل کر خود سے دور ہٹایا تھا۔ اور یہ تو صرف ایک مثال ہے ایسے ان گنت واقعات ہیں اس شخص کے۔''

''مین کاروبار کیا ہے اس کا؟''

''دادا گیری...... سنا ہے کسی بڑے تھائی ریکس کے ساتھ اس کا ٹانکا ہے۔ اس ریکس کا بہت سا ڈالر یورپی بنکوں میں پڑا ہوا ہے۔ جان اس کے لئے ہر طرح کے کام کرتا ہے۔ سنگاپور میں قانون کی عملداری ہے' پھر بھی جان جیسے لوگ اپنے لئے راستے ڈھونڈ لیتے ہیں۔''

کلب کی فضا میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ایک عجیب سا تناؤ تھا یہاں۔ انگور کی بیٹی نے ہر مرد و زن کو بہکا رکھا تھا۔ مرد حاضرین میں اکثریت خطرناک چہرہ لوگوں کی تھی۔ دو بہکے ہوئے امیرزادے ہونٹوں میں سگریٹ دبائے اپنی ساتھی لڑکیوں کے ہمراہ ہیجان خیز ڈانس کر رہے تھے۔ میں نے عرفات سے پوچھا۔ ''کہیں دکھائی دیا تمہیں اسماعیل؟''

''ابھی تک تو نہیں۔'' وہ بولا۔

پھر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ وہاں موجود لڑکیاں بڑے والہانہ انداز میں اس سے باتیں کرنے لگیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ

عرفات باتوں باتوں میں ان سے مطلوبہ ویٹر کا پتہ پوچھ رہا ہے۔

قریباً پانچ منٹ بعد وہ اپنی وسیع و عریض پیشانی پر مایوسی کی افقی لکیر لے کر واپس آ گیا۔

''نہیں یار! آج قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔ اسماعیل دو ہفتے کی چھٹی پر ملائیشیا گیا ہوا ہے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا...... یہ خطرناک جگہ ہے۔ کسی طرح کی فالتو بات چیت مصیبت میں ڈال سکتی ہے۔ اسماعیل کی بات تو اور تھی۔''

''میرے خیال میں' بل میں اضافہ کرتے رہنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے نکل چلیں۔''

ہم نے جو عام کولڈ ڈرنکس لئے تھے ان کی قیمت مہنگی شراب کے حساب سے ادا کر کے ہم کیسل کلب سے باہر آ گئے۔ یوں لگا کہ چنگیز خان کے کسی جنگی معسکر سے نکلے ہیں۔ اور چنگیز خان ظاہر ہے کہ جان ینگ ہی تھا۔ اس کا چہرہ مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی ذہن میں راسخ ہو رہا تھا کہ جو شخص جان جیسے غنڈے سے ٹکر لے رہا ہے وہ خود بھی معمولی نہیں ہے۔ یعنی راکیش عرف راکیش پانڈے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ایک سوال دردناک چیخ کی طرح ذہن میں ابھرتا تھا۔ کیا میں...... وائم احمد...... ایک معمولی شخص اپنے دو معمولی دوستوں کے ساتھ مل کر امریتا کو ان خوفناک بدمعاشوں سے بچا پاؤں گا؟

ہم کلب کے سامنے والے دروازے سے نکلنے کی بجائے بغلی دروازے سے نکلے۔ یہاں ایک ڈرائیو وے تھا جو عقب میں گیراجوں تک چلا گیا تھا۔ اس ڈرائیو وے پر بھی کلب کے معزز کرمفرماؤں کی کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہاں روشنی قدرے کم تھی۔ میں نے ایک ہلتی ہوئی گاڑی دیکھی۔ ایسی ہلتی ہوئی گاڑیاں جدید تہذیب کے جدید شہروں میں اکثر نظر آتی ہیں۔ رات کے سناٹے میں کسی پارکنگ لاٹ میں یا کسی ویران سڑک پر ایسی متحرک گاڑی پر نظر پڑ سکتی ہے۔

''یہ دیکھو۔'' میں نے عرفات کو کہنی ماری۔

اس نے میری نظر کا تعاقب کیا۔ گاڑی کے دھندلکے اندھیرے میں ایک مرد عورت بیٹھے شوخیاں کر رہے تھے۔ پھر وہ نشست پر نیم دراز ہو گئے۔ ہم گاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ عرفات کی نظریں بدستور گاڑی پر ہیں۔ اس کی توجہ کا مرکز گاڑی کے اندرونی مناظر نہیں تھے بلکہ گاڑی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ گاڑی عرفات نے پہلے بھی دیکھی ہوئی ہے۔ وہ کچھ آگے جا کر ٹھہر گیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک کام کے بندے سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ لیکن شاید تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کہاں ہے بندہ؟''

''میرا اندازہ ہے کہ گاڑی کے اندر ہے۔ یہ سکھ بھائی ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ یہاں ایک انگریزی اخبار میں رپورٹنگ کرتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے یہاں سنگاپور میں اپنے گھر کا کچن مجھ سے بنوایا تھا۔ وہیں سے دوست بن گیا۔ اگر گاڑی میں وہی ہے تو پھر ہمیں اس سے ضرور ملنا چاہئے۔''

''کس خوشی میں؟''

''اوئے گھامڑ! یہ بھی یہاں کلب میں آتا جاتا رہتا ہے۔ تجھے پتہ ہی ہے یہ اخباری نمائندے دور دور کی خبر رکھتے ہیں۔ یہ جان ینگ اور راکیش کے جھگڑے کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہوگا۔ مجھے پکا یقین ہے۔''

ہم وہیں پر کھڑے رہے اور کوئی ساٹھ ستر فٹ دور کھڑی گاڑی کو ہلتے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک گوری چٹی لڑکی جو صورت سے چینی لگتی تھی اپنا اسکرٹ وغیرہ درست کرتی ہوئی باہر آ گئی۔ اندر سے اس کے ساتھی مرد نے اس کا آرائشی ہیٹ اسے پہنچایا۔ اس نے ہیٹ سر پر درست کیا اور اسے گڈبائی کہتی اپنے بھرپور جسم کو ہلکورے دیتی دوسری طرف نکل گئی۔ اس کے جانے کے چند سیکنڈ بعد اس کا ساتھی بھی باہر نکل آیا۔ عرفات کی توقع کے عین مطابق وہ ایک سکھ تھا۔ اس نے ہاف سلیو سرخ شرٹ اور جین کی پتلون پہن رکھی تھی۔ سر پر نیلی پگڑی بھی تھی۔

عرفات عقب سے گیا اور ایک دھپ سکھ نوجوان کی کمر پر رسید کی۔
سکھ نوجوان نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ پھر ایکدم اس کی بتیسی نکل آئی۔ دونوں بازو پھیلا کر بولا۔ ''اوئے بہن دے چھنکنے تو یہاں؟''

دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا اور دھپ رسید کئے۔ عرفات نے کہا۔ ''دیکھ لے تجھے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے کرنیلے! اب ایک زبردست قسم کا ڈنر تو تجھے کرانا پڑے گا۔ ورنہ...... ورنہ...... ورنہ۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ تیرا بوتھا بند کرنے کے لئے دو چار چکن پیس ٹھونس دیتا ہوں اس میں۔''

''اوئے ہوش سے کرنیلے! میں اکیلا نہیں ہوں۔ یہ معزز مہمان بھی میرے ساتھ ہے۔ دائم صاحب! پاکستان سے تشریف لائے ہیں۔''

کرنیل سنگھ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور گرمجوشی سے ملا۔

عرفات نے رومال کے کونے پر تھوک لگا کر کرنیل سنگھ کے رخسار سے لپ اسٹک صاف کی اور بولا ''چل کسی انڈین ریسٹورنٹ میں۔''

کچھ ہی دیر بعد ہم کرنیل سنگھ کی 72 ماڈل گاڑی میں بیٹھ کر ایک انڈین ریسٹوران جا پہنچے۔ یہ ریسٹوران کسی عمارت میں نہیں شامیانوں کے درمیان تھا۔ بڑی بڑی پراتوں میں رنگ برنگے چاول اور سالن کے دیگچے دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ یہ غالباً جنوبی انڈیا کے لوگ تھے۔ اخلاق سے ملے۔ بکری کا شوربا اور چکن کا سالن بھی موجود تھا۔ ہم نے بریانی...... سالن اور دہی لیا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ بات چیت بھی ہوتی رہی۔ ریسٹوران اعلیٰ درجے کا نظر نہیں آتا تھا لیکن کھانا اعلیٰ درجے کا تھا۔

عرفات نے باتوں باتوں میں چابکدستی سے جان ینگ کا ذکر چھیڑ دیا۔ کرنیل سنگھ نے بریانی کا ایک بڑا لقمہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس گدھوسڑ کے بارے میں پچھلے مہینے ایک کالم چھپا ہے ہمارے اخبار میں۔ آشا ہے کہ دو چار ہفتے میں ایک اور چھپے گا۔''

''یہ گدھوسڑ کیا خطاب ہے؟'' عرفات نے پوچھا۔

''یہ گدھے، منحوس اور سڑے ہوئے کی جمع ہے۔ ایسے الفاظ میں خود بنایا کرتا

ہوں۔"

"بہت خوب۔ یہ لقب جان ینگ پر کافی سوٹ کرتا ہے۔" میں نے تعریف کی۔

عرفات نے بات آگے بڑھاتے ہوئے جان کے تازہ ترین پھڈوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کی یہ کوشش کامیاب رہی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم تینوں جان ینگ اور انڈین راکیش کے مابین ہونے والے جھگڑے کی بات کر رہے تھے۔ کرنیل نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے کہا۔"جان کے بندے بھوکے کتوں کی طرح راکیش اور اس کی ساتھی لڑکی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ معاملہ کافی سنسنی خیز ہوگیا ہے۔"

"ساتھی لڑکی کون ہے؟" عرفات نے پوچھا۔

"سنا ہے کوئی انڈین ہے۔ راکیش اسے شادی کے جھانسے میں یہاں لایا ہے..... لڑکی کی خوبی یہ ہے کہ اس کے بال بڑے دھماکو ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ لاکھوں میں ایک قسم کے بال ہیں۔ لڑکی سیدھی سادی ہے۔ راکیش کا پروگرام اس سے ماڈلنگ کرانے اور پیسہ کمانے کا ہے..... اور جن لوگوں نے لڑکی کو دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ ایسا کر بھی سکتا ہے۔ لیکن راکیش کی بدقسمتی کہ لڑکی جان کی نظر میں آگئی ہے۔ وہ گدھوسڑ ہاتھ دھو کر لڑکی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"لیکن جان اور راکیش کا پھڈا تو شاید کافی پہلے سے ہے۔" عرفات نے کہا۔

"اوئے کھوتوف! یہ وہی پھڈا تو چل رہا ہے اب تک۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے راکیش دلالوں والا کام کرتا ہے۔ انڈیا اور بنگلہ دیش سے لڑکیاں پھانس کر یہاں لاتا ہے اور انہیں خراب کرتا ہے۔ اندر کی بات یہ ہے کہ راکیش نے قریباً دس مہینے پہلے جان سے ایک انڈین لڑکی کے لئے رقم پکڑی تھی۔ اس نے جان ینگ سے وعدہ کیا تھا کہ دو مہینے کے اندر ایک پڑھے لکھے گھرانے کی سندر انڈین گرل جان ینگ تک پہنچائے گا۔ وہ ٹائم پر وعدہ پورا نہ کر سکا۔ سنا ہے ایک لڑکی وہ لایا بھی تھا لیکن وہ کسبی (پیشہ ور) تھی۔ جان کے ساتھ راکیش کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہوٹل سکائی ویو میں جان کے ہاتھوں راکیش کی جو یادگار پٹائی ہوئی تھی وہ اسی سلسلے میں تھی۔ بڑی بے عزتی خراب ہوئی تھی بھن کے

چھنکنے کی۔ اصل خالصہ ہوتا تو ڈوب کر مر جاتا۔ لیکن یہ ایک نمبر کا خچریٹ ہے۔ خچریٹ سمجھتے ہو نا تم۔ خچر اور ڈھیٹ کی جمع۔" عرفات نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔ کرنیل بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔"یہ پرانی حرکتوں سے باز نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جان کے ہاتھوں اس عورت باز کے برے دن آگئے ہیں۔"

"باز نہ آنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" عرفات نے دریافت کیا۔

"او کھوتوف! (کھوتا جمع بیوقوف) یہ لڑکی والا وہی معاملہ تو ہے۔ یہ لڑکی راکیش دراصل جان ینگ کا ادھار چکانے کے لئے ہی لایا تھا۔ اس کے پیو پرتاپ سنگھ نے اپنے لائق پتر کی بڑی مدد کی اس معاملے میں۔ اپنے کسی انڈین یار کی بیڑی میں وٹے ڈالے اور اس کی سپوتری کو گھیر گھار کر اپنے حرامی پتر کی جھولی میں ڈالا۔ لیکن لڑکی کو جھولی میں لینے کے بعد راکیش کی نیت بدل گئی۔ تمہیں لڑکی کی وہ بالوں والی خوبی بتائی ہے نا میں نے...... وہ واقعی دماغ گھمانے والی خوبی ہے۔ راکیش نے سوچا ہوگا۔ لڑکی دے کر جان ینگ کے چار لاکھ ڈالر چکانے کی بجائے کیوں نہ لڑکی سے شوبز کا دھندا کراؤں اور دو مہینے میں جان کے چار لاکھ ڈالر کے بدلے آٹھ لاکھ ڈالر اس کے منہ پر ماروں۔ سچ کہتے ہیں پیارے! لالچ بری بلا ہے بلکہ بدبلا ہے۔"

"جان نے لڑکی کا کیا کرنا ہے؟"

"وہی جو اس جیسے لوگ کرتے ہیں۔ اس نے کہیں آگے سے رقم پکڑی ہوئی ہے..... رئیس لوپ ینگ کا نام تو سنا ہوا ہے نا تم نے؟"

"وہی جس کی برطانوی پراپرٹی کا ذکر اخباروں میں بھی آیا تھا۔"

"وہ بہت بڑا لفنگرو اور عیاش ہے۔ بورژوا ذہن رکھتا ہے۔ بورژوا سمجھتے ہو نا؟ جاگیردارانہ۔ ہر نسل کا گھوڑا اور عورت اس کے وِلا میں موجود ہے۔ اصطبل میں کوئی گھوڑا مر جائے یا حرم میں کسی نسل کی عورت کم ہو جائے' اس جنگلیٹ کو ایک جیسی پریشانی ہوتی ہے۔ سنا ہے اِن دنوں اسے ایک خوبرو گھریلو انڈین لڑکی کی شدید ضرورت ہے۔ جسے وہ پتنی بنا کر اپنی اندر سبھا میں بٹھا سکے اور اس کی سندرتا کو سات پردوں میں چھپا کر اپنے لئے خاص کر سکے۔ جان نے اس کی یہی خواہش پوری کرنے کے لئے راکیش کو چند ماہ پہلے دو لاکھ ڈالر دیئے تھے۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوپ ینگ اس لڑکی کو پتنی بنا کر اپنے وِلا میں رکھے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی! پتنی کہہ لیں، رکھیل یا کنیز کہہ لیں۔ یہ بات راکیش بھی سمجھتا ہے کہ اگر ایک بار وہ لڑکی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تو پھر سات پردوں میں جا چھپے گی۔ اسے ماڈل بنا کر دھن کمانے کا ارمان اس کے من میں ہی رہ جائے گا۔ وہ لڑکی کو جان ینگ سے بچانا چاہ رہا ہے۔ اور جان کسی صورت اسے چھوڑنا نہیں چاہ رہا۔ ایک طرح سے اب یہ ضد کا معاملہ بن گیا ہے۔ سنا ہے دو دن پہلے راکیش نے جان کو کسی نامعلوم جگہ سے کال کی ہے اور کہا ہے کہ وہ اس لڑکی کے بدلے اسے انڈیا سے تین ہفتے کے اندر اندر ایک اور لڑکی لا دیتا ہے۔ لیکن اب جان کسی صورت اس کی بات پر وشواس کرنے کو تیار نہیں۔"

کرنیل سنگھ سے جو معلومات حاصل ہو رہی تھیں وہ اتنی اہم اور حیران کن تھیں کہ ہم تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ سارے حالات ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے آتے چلے جا رہے تھے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ راکیش، امریتا کو جان ینگ سے بچانے کی کوشش تو کر رہا ہے۔ مگر صرف ذاتی مفاد کی خاطر۔ وہ اسے شوبز کی پرخطر رنگینیوں میں دھکیل کر نوٹ چھاپنے کی مشین بنانا چاہ رہا تھا۔

ہم قریباً ڈیڑھ گھنٹہ کرنیل سنگھ کے ساتھ رہے۔ کھانے کے دوران ہم نے دو تین مرتبہ ہوٹل والوں سے اضافی گریبی لی۔ جو بخوشی دے دی گئی۔

اب ہم جانے کے لئے تیار تھے۔ کرنیل سنگھ کی خواہش تھی کہ وہ ہمیں اپنے گھر لے جائے۔ وہ مجھے عرفات کی ہنرمندی یعنی لکڑی کا کام دکھانا چاہتا تھا۔ بہرحال ہم اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس کی آفر قبول کر سکتے۔ پھر وہ اس بات پر مصر ہو گیا کہ ہمیں ہمارے ہوٹل تک چھوڑ کر آئے گا۔ اس کی مہمان نوازی کی قدر کرتے ہوئے ہم نے یہ بات مان لی۔ ہم اس کی گاڑی پر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک آفس نما جگہ کے سامنے کرنیل نے گاڑی روک لی۔ "لو بھئی! اب اِدھر سے گزر رہے ہیں تو یہ میرا چھوٹا سا دفتر بھی دیکھ لو۔"

پتہ چلا کہ آج کل کرنیل اپنے ایک مقامی رپورٹر دوست کے ساتھ مل کر

پبلشنگ کا کام بھی کر رہا ہے۔ یہ دفتر اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ ہم اندر پہنچے، یہ دفتر سیکنڈ فلور کے تین چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں اتنی رات گئے بھی یہاں کام میں مصروف تھے۔ کرنیل نے انہیں کام کے سلسلے میں کچھ ہدایات دیں پھر ہمیں کافی پلانے پر مصر ہو گیا۔ کافی ہم نے اس کے ایئرکنڈیشنڈ آفس میں ہی پی۔ ساتھ ساتھ راکیش کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ باتیں کرتے ہوئے کرنیل کو جیسے ایکدم کچھ یاد آیا۔ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میرے پاس اخبار کا ایک پرانا تراشا ہے۔ اس میں راکیش کی تصویر بھی ہے۔ ان دنوں یہ خود بھی ماڈلنگ کے چکر میں تھا۔"

کرنیل ایک بڑی الماری تک پہنچا۔ اس الماری میں اوپر سے نیچے تک کتابیں، میگزین اور دیگر کاغذات بھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک خانے میں رکھی ہوئی چند فائلوں کو احتیاط سے دیکھنے لگا۔ تین چار منٹ بعد اس کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔

"یہ دیکھو" وہ ہماری طرف گھومتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانے انگریزی اخبار کا کافی بڑا تراشا تھا۔ ہم دونوں اشتیاق سے دیکھنے لگے۔ یہ کسی فنکشن میں اتارا گیا Snap Shot تھا۔ تصویر زیادہ واضح نہیں تھی لیکن پہچانی جاتی تھی۔ راکیش اس میں کافی دبلا نظر آتا تھا۔ دبلے پن کے سبب ناک کچھ اور بھی اونچی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے اخبار کی ڈیٹ دیکھی۔ یہ قریباً تیرہ برس پرانا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ تصویر میں راکیش کے ساتھ ایک خوبرو لڑکی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ راکیش نے اس انڈین لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ تصویر کے کیپشن پر نظر دوڑائی تو سنسنی محسوس ہوئی۔ لکھا تھا۔

"ابھرتے ہوئے ماڈل راکیش سنگھ اپنی ہم وطن بیوی کے ساتھ۔"

میں نے اور عرفات نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے اس کی پہلی بھی شادی ہو چکی ہے۔" عرفات نے کرنیل سے پوچھا۔

"پتا نہیں کتنی شادیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایسے لفنگے لوگ تو کپڑوں کی طرح پتنیاں بدلتے ہیں۔ ہاں ایک اعلانیہ شادی کی حیثیت سے تم اسے اہمیت دے سکتے ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس گھڑونجو کی پہلی شادی ہو۔"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ شکل سے شریف نظر آتی تھی۔ اس کے پہناوے کو دیکھ کر خیال آتا تھا کہ وہ مذہبی بھی ہوگی۔ میں نے عرفات کی طرف دیکھا۔

وہ جیسے میری نگاہوں سے ہی میرا مفہوم سمجھ گیا۔ یہ تراشا ہمیں مل جاتا تو امریتا کو راکیش کے حوالے سے "سمجھانے" میں مدد مل سکتی تھی۔ عرفات نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے تسلی دی کہ وہ یہ تراشا کرنیل سے لے لے گا اور واقعی جب ہم دس پندرہ منٹ بعد کرنیل کے آفس سے باہر نکلے تو تراشا عرفات کی جیب میں تھا۔ اس نے یہ تراشا اپنی چہیتی گرل فرینڈ کو دکھانے کے بہانے لیا تھا۔ راستے میں بھی راکیش اور جان کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کرنیل سنگھ سے پوچھا۔

"کیا یہ تراشے والی تصویر واقعی راکیش کی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ یہ تیرہ سال پرانی تصویر ہے اور راکیش اب بھی جوان ہی نظر آتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن کئی لوگ عمر چور بھی تو ہوتے ہیں۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق راکیش کی عمر اب 36 سال سے کم نہیں ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ ستائیس اٹھائیس کا ہی لگتا ہے۔"

کرنیل سنگھ نے ہمیں ہوٹل کے سامنے اتارا۔ عرفات گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "آج تمہاری زبان سے ایک نیا لفظ جنگلیٹ سنا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "بہن دے چھکنے! یہ جنگلی اور خبیث کا مرکب ہے۔ تم چاہو تو اپنے لئے بھی استعمال کر سکتے ہو۔"

عرفات نے اس پر مکا تانا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور دلکش انداز میں ہنسنے لگا۔

عرفات نے اسے بتایا کہ ابھی ہم دو دن سنگاپور میں ہی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے پھر ملاقات ہو۔

کرنیل کی گاڑی آگے بڑھ گئی تو میرے ذہن سے یہ خطرہ ٹلا کہ کہیں وہ ہمارے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں نہ چلا جائے۔ ابھی تک ہم نے اسے اپنے ساتھ کسی لڑکی کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ ہم دو گھنٹے تک جس بدنام شخص کے غائبانہ "قصیدے" پڑھتے رہے ہیں۔ وہ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے...... یعنی راکیش۔"

میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ کرنیل سنگھ سے تہلکہ خیز معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ میرے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ ایک عجیب بے قراری نے پورے جسم کو لپیٹ میں لے لیا۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا۔ امریتا نہیں دیکھ رہی تھی اور نہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب ایک چھوٹا سا ثبوت تو ہاتھ آیا تھا۔ تراشے میں راکیش کی تصویر مدھم ضرور تھی تاہم راکیش کے طور پر پہچانی جا سکتی تھی۔ امید تھی کہ آج حاصل ہونے والی معلومات اور یہ تصویر، کچھ نہ کچھ امریتا پر اثر ضرور کریں گی۔



یہ اگلے دن کا واقعہ ہے۔ راکیش ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ شام سے ذرا پہلے میں اور امریتا بالکونی میں رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے اورنج جوس کے گلاس تھے۔ مست کر دینے والی ہوا میں سڑک کے پام جھوم رہے تھے۔ امریتا بار بار اپنے بے مثال بالوں کو سنبھالتی تھی اور انہیں سرخ شال میں سمیٹتی تھی۔ اس کی ناک سرخ تھی اور آنکھوں کے کنارے بار بار نم ہو جاتے تھے۔ راکیش کی تصویر والا پرانا اخبار وہ دیکھ چکی تھی اور وہ ساری گفتگو بھی سن چکی تھی جو کل ہمارے اور کرنیل سنگھ کے درمیان ہوئی تھی۔

میری بات اختتام کو پہنچی تو امریتا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ چہرہ گہرے اندوہ کی تصویر ہو گیا۔

میں نے کہا۔

''میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن حقیقت کا سامنا کرنے کے لئے دل کڑا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی دل کڑا کیا ہے۔''

''یوں لگتا ہے کہ میرا پورا جیون ہی برباد ہو گیا ہے۔'' اس کی آواز میں عجیب کرب تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ بات صرف اس تصویر اور میرے انکشافات ہی کی نہیں۔ اس کے علاوہ بھی کوئی تکلیف دہ حقیقت اس کے سامنے آئی ہے۔ کوئی شاک، کوئی صدمہ۔

اس کے چہرے پر اتنی زیادہ سنجیدگی تھی کہ مجھے اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے تصویر پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ بیٹھی رہی

پھر تیزی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں بھی کمرے میں واپس آ گیا۔ راکیش کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس کا ایک قیمتی تولیہ جس پر نیم برہنہ لڑکی کی تصویر بنی تھی سامنے بالکونی کے جنگلے پر سوکھ رہا تھا۔ پانچ منزل نیچے جھلملاتی روشنیوں والی ٹریفک رواں دواں تھی۔ میں اور عرفات تراشے میں راکیش اور اس کی بیوی کی تصویر دیکھتے رہے۔ وہ بھی کسی حد تک معصوم نظر آتی تھی۔ پتا نہیں کہ اس پر کیا بیتی تھی۔ زندہ بھی تھی یا نہیں۔

شام اب رات کے دامن میں پناہ لے چکی تھی۔ ہمارے اِردگرد سنگاپور بہت دور تک اور بہت اوپر تک جگمگا اٹھا تھا۔ سیکڑوں بلڈنگیں، ہزاروں منزلیں، ہزاروں منزلوں کی ہزار ہا کھڑکیاں، ہر کھڑکی میں زندگی اپنے اپنے ڈھنگ اور رنگ سے حرکت کرتی ہوئی۔ ایک عظیم الشان شہر کو اس طور اپنے اِردگرد جگمگاتے ہوئے دیکھنا بڑا اثر انگیز تھا۔

اتفاقاً ہی میری نگاہ کھڑکی سے باہر بالکونی کی طرف گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے امریتا تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی ہے۔ اپنے اس شبے کی تصدیق کے لئے میں چپل پہن کر جلدی سے باہر آیا۔ امریتا اور راکیش کے کمرے میں تاریکی تھی۔ میں نے لفٹ کی طرف دیکھا۔ وہ نیچے جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے امریتا کو گراؤنڈ فلور پر لفٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس کے پاس فقط شولڈر بیگ تھا وہ سرخ شال میں لپٹی تیزی سے قدم اٹھاتی داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ مجھے یوں لگا کہ امریتا ہوٹل چھوڑ کر جا رہی ہے میں نے فوراً زینوں کی طرف دوڑ لگائی۔ جس وقت میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گراؤنڈ فلور پر پہنچا۔ امریتا ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔ میرے داخلی دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر آگے بڑھ چکی تھی۔

میں نے پچھلی ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور سے چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے میٹر ڈاؤن کیا اور شکستہ انگریزی میں پوچھا۔ ''کہاں جائیے گا؟''

''اس ٹیکسی کے پیچھے۔''

کورین ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔

''وہ کون ہے؟''

''مم...... میری بیوی۔ ناراض ہو گئی ہے۔''

وہ اور زور سے مسکرایا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بالکل ہی بند ہو گئیں۔ اثبات میں سر ہلا کر اس نے ٹیکسی، اگلی ٹیکسی کے پیچھے لگا دی۔

امریتا زیادہ دور نہیں گئی۔ قریباً دو کلومیٹر سیدھا جانے کے بعد، وہ بائیں طرف مڑی اور ایک کلومیٹر مزید آگے بڑھنے کے بعد ایک شاپنگ مال کے سامنے رک گئی۔ میں بھی کرایہ دے کر اور ڈرائیور کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

سنگاپور کی زمین نیم پہاڑی قسم کی ہے۔ یہاں سبزے سے ڈھکے ہوئے خوبصورت نشیب و فراز ہیں۔ ان نشیب و فراز پر فلک بوس عمارتوں کا شمار کرنا مشکل ہے۔ امریتا ان عمارتوں کے درمیان ایک فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔ وہ کچھ دیر دائیں بائیں دیکھتی رہی پھر زیبرا کراسنگ سے سڑک پار کر کے دو بلند عمارتوں کی درمیانی گلی میں چلی گئی۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجیب طرح کا اضطراب اور خوف تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنے عقب میں بھی دیکھا لیکن مجھ پر اس کی نظر نہیں پڑی یا وہ پہچان نہیں پائی۔ میں نے بھی سڑک پار کی اور اس کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ وہ ٹیوب ٹرین کے سٹیشن کی طرف جا رہی ہے۔

میں نے اپنا اور اس کا درمیانی فاصلہ تیزی سے کم کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ جنکشن میں داخل ہو جاتی میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''امریتا!'' میں نے آواز دی۔

وہ ٹھٹک کر مڑی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ یوں لگا جیسے اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ ''کہاں جا رہی ہو امریتا؟'' میں نے فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے اس سے پوچھا۔ ٹرین جنکشن کی ''انٹرنس'' سامنے ہی دکھائی دے رہی تھی۔

اس کی نم آنکھوں میں تازہ آنسو امڈ آئے۔ ایک لحظے کے لئے لگا کہ وہ کچھ کہنے لگی ہے۔ مگر پھر اس نے رخ پھیرا اور جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں پھر اس کے پیچھے گیا۔ اس مرتبہ میں نے اس کا بازو پکڑا۔ ''کیا کر رہی ہو امریتا؟ میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گا۔''

''تم مجھے روکنے والے کون ہوتے ہو۔ چھوڑ دو مجھے۔'' وہ مکمل بے رخی سے بولی۔

''امریتا! ہوش کرو۔ یہ تمہارا جالندھر نہیں ہے۔''

''میں بھی جانتی ہوں جالندھر نہیں ہے۔ میں اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہوں۔ پلیز تم میرے راستے میں نہ آؤ۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''تت...... تمہیں، راکیش سے شکوے ہوں گے لیکن میں تو تمہارا بھلا ہی چاہ رہا ہوں امریتا۔ کم از کم مجھے......''

''مجھے تم دونوں سے کوئی سروکار نہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ میں کسی کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ کسی کی بھی نہیں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ مجھے دھکیلتے ہوئے چلائی۔ میں لڑکھڑایا لیکن امریتا کا بازو بدستور میرے ہاتھ میں رہا۔

''امریتا! مجھے غلط مت سمجھو۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''کوئی غلط نہیں۔ میں ہی غلط ہوں۔ سارے اپرادھ کیول میرے ہیں۔ مجھے سزا پانے دو۔ اس شہر کی کسی گلی میں مر جانے دو مجھے۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ طویل طویل بال اوڑھنی کی حدود سے نکل کر لہرانے بل کھانے لگے تھے۔

''نہیں امریتا! میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ خود کو اور مجھے تماشا نہ بناؤ۔ لوگ دیکھ رہے ہیں...... چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''میں نے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔ تم کون ہوتے ہو میرے؟ چھوڑ دو مجھے......'' وہ اور زیادہ قوت سے مچلی۔

میں اندر سے اتنا مضبوط نہیں تھا کہ اسے روک سکتا۔ لیکن ان لمحوں میں نجانے ایک اضافی توانائی کہاں سے میرے اندر آ گئی۔ وہی توانائی جو ملائی غنڈوں کے روبرو میرے اندر نمودار ہوئی تھی۔ اس توانائی کا سرچشمہ شاید وہ انمٹ جذبہ تھا جو میرے اندر امریتا کے حوالے سے لہریں لے رہا تھا۔ میں نے امریتا کا بازو نہیں چھوڑا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں مجھے جھنجھوڑنے لگی۔

''چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو۔'' پھر نجانے اسے کیا ہوا۔ اس نے ایک تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ پھر دوسرا...... اس کا دوسرا تھپڑ میں نے راستے میں روک لیا۔ اس کی کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ کلائی چھڑانے کے لئے زور لگانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ

رو رہی تھی اور ہیجانی انداز میں وہرا رہی تھی۔ چھوڑ دو مجھے...... پیچھے ہٹ جاؤ...... دور ہو جاؤ۔"

میں نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی۔ نہ اسے خود سے دور ہونے دیا۔ پھر اچانک نہ جانے اسے کیا ہوا۔ وہ دھاڑیں مار کر روتے روتے میرے سینے سے لگ گئی۔ میرے اوپر ڈھ سی گئی۔ میں چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں رہا۔ پھر دایاں ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ میرے سینے میں منہ چھپا کر روتی چلی گئی۔

ہمارے اردگرد لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ شاید چند ایک نے ہمارے اردگرد کوئی مووی کیمرا ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی ہو۔ جب امریتا اپنے جارحانہ موڈ سے نکل کر میرے سینے سے لگ گئی تو اردگرد موجود افراد کے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ شاید ان میں سے دو چار ایسے بھی ہوں جو اپنا اخلاقی فرض پورا کرنے کے لئے میرا گریبان پکڑنے کا ارادہ رکھتے ہوں لیکن صورت حال کی تبدیلی دیکھنے کے بعد وہ مسکراتے چہروں کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

امریتا اس طرح میرے سینے سے چمٹی تھی کہ میرے جسم کا حصہ ہی بن گئی تھی۔ اس کے گرم آنسو میری قمیص کو بھگو رہے تھے۔ میری اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ کے بیچوں بیچ ہم دو ڈرامائی کرداروں کی طرح ایک دوسرے کی بانہوں میں کھڑے رہے۔ ہمارے اردگرد ہزار ہا روشن کھڑکیوں والا جگمگاتا سنگاپور تھا۔ شفاف سڑک پر بے آواز گاڑیاں فراٹے بھرتی گزر رہی تھیں۔

وہ قریباً دو منٹ تک روتی رہی۔ پھر عجیب آواز میں منمنائی۔

"دای! مجھے لے چلو۔ یہاں سے کہیں دور...... رب کے واسطے۔"

"مجھے بتاؤ! کہاں جانا ہے؟" میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"کہیں بھی لے جاؤ...... میں اب واپس جانا نہیں چاہتی۔" اس نے اپنے سر کو میرے سینے سے لگائے لگائے نفی میں حرکت دی۔

"چلو آؤ۔" میں نے کہا۔

میری آواز سن کر بھی اس نے خود کو مجھ سے جدا نہیں کیا۔ یوں لگا جیسے وہ اسی طرح میرے ساتھ چمٹے چمٹے سفر کرنا چاہتی ہے۔

میں نے اس کو خود سے علیحدہ کرنے کی تھوڑی سی کوشش کی لیکن اس کا انداز دیکھتے ہوئے ترک کر دی۔ وہ ہیجانی کیفیت کا شکار تھی۔ میں نے اس کا نیچے گرا ہوا شولڈر بیگ اپنے زخمی کندھے سے لٹکایا اور اسے دوسرے کندھے سے لگا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کا پہلو میرے پہلو سے پیوست تھا اور سر میرے سینے پر تھا۔ ہم اس طرح دس بیس قدم چلے ہوں گے کہ ایک پبلک کال بوتھ نظر آیا۔ میں نے مشین میں سکے ڈال کر ہوٹل اسٹار لائٹ کا نمبر ملایا اور روم نمبر 40 میں بات کرانے کی درخواست کی۔ چند ہی سیکنڈ بعد عرفات کی پریشان آواز سنائی دی۔

"تم کہاں ہو دای؟"

"زیادہ دور نہیں ہوں۔ تم فوراً چلے آؤ۔ میٹ وائی روڈ' تیسرے فوارے سے دائیں طرف' یہاں شنگھائی فاسٹ فوڈ کے سامنے ایک کال بوتھ ہے۔ ہم اس کے آس پاس موجود ہیں۔"

"یار خیریت تو ہے؟ کیا امریتا بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

"ہاں...... وہ بھی ہے۔ بس تم جلدی سے پہنچ جاؤ۔ اور ہو سکے تو ہوٹل سے چیک آؤٹ بھی کر آؤ۔" وہ پہلے حیران ہوا پھر بولا۔ "او کے' ہم نکل رہے ہیں۔"

پبلک کال بوتھ کے ساتھ ہی سرخ پھولوں سے بھری ہوئی چند کیاریوں کے پاس لکڑی کے خوشنما بنچ رکھے تھے۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ امریتا کا سر مسلسل میرے سینے پر تھا اور وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ اپنے بائیں گال پر امریتا کے ہیجانی طمانچے کی تپش میں ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔

صرف پندرہ منٹ کے اندر عرفات اور ظہیر ایک ٹیکسی کار کے ذریعے ہم تک پہنچ گئے۔ مجھے اور امریتا کو اس طرح بنچ پر بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں حیران ہوئے۔

عرفات نے اشاروں میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔ "ہمیں اب تیسرا ہوٹل ڈھونڈنا ہوگا۔"

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

"ایک آئیڈیا ذہن میں آ رہا ہے۔ کیوں نہ کرنیل کے فلیٹ میں چلیں۔ اس

نے کل ہمیں آفر بھی کی تھی۔ اس کی پتنی اپنی بہن کے پاس کوالالمپور گئی ہوئی ہے۔ کافی بڑا فلیٹ ہے۔ خالی پڑا ہوگا۔ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

"دیکھ لو۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی۔"

"پریشانی والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اخباری رپورٹر کا کام گھومنے پھرنے والا ہوتا ہے۔ کرنیل صبح کا گیا رات بارہ بجے سے پہلے نہیں آتا۔"

چند منٹ کے تبادلۂ خیال کے بعد کرنیل سنگھ کے فلیٹ میں جانے کا فیصلہ ہو گیا۔ ظہیر نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم سوار ہو گئے۔



رپورٹر کرنیل سنگھ کا فلیٹ ایک رہائشی عمارت کی پندرہویں منزل پر تھا۔ لفٹ تیز رفتار تھی۔ فلیٹ کافی کشادہ تھا۔ تین بیڈ روم، ایک ٹی وی لاؤنج، ایک کامن روم اور شاندار کچن موجود تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کرنیل اور اس کی انگریز پتنی یہاں سنگاپور میں ٹھیک ٹھاک کما لیتے ہیں۔

جس وقت ہم فلیٹ میں پہنچے کرنیل کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے اپنا سفری بیگ باندھ کر تیار رکھا ہوا تھا۔ عرفات، کرنیل کو ایک طرف لے گیا اور اسے ساری بات سمجھائی۔ اس نے امریتا کا تعارف میری گرل فرینڈ کی حیثیت سے کروایا اور اسے بتایا کہ وہ دو چار دن یہاں رہنا چاہتے ہیں......

کرنیل نے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ ویسے بھی وہ ایک آزاد خیال اور من موجی شخص تھا۔ اس نے لاپرواہی سے دو چابیاں عرفات کی طرف اچھالیں اور بولا۔

"یہ ایک چابی فلیٹ کی ہے اور دوسری نیچے کھڑی گاڑی کی۔ دونوں کو اپنے باپ کی چیز سمجھ کر استعمال کرو۔ کوئی پرواہ نہیں۔ میں ریٹا اور اپنے بچونگڑے کے پاس کوالالمپور جا رہا ہوں۔ تین یا چار دن تک پلٹوں گا تب تک فلیٹ تمہارا ہے۔"

"اور اس کے بعد۔" عرفات نے ازراہِ مذاق پوچھا۔

"تو بڑا جنگلیٹ ہے۔ اس سمے جلدی میں ہوں تجھ سے آ کر پوچھوں گا۔" وہ امریتا پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

امریتا نے عرفات کی ہدایت کے مطابق خود کو شال میں لپیٹ رکھا تھا۔ شال کے پلو میں اس نے نقاب کی طرح آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

کرنیل سنگھ شاید تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ شال میں لپٹی ہوئی لڑکی ہی وہ ہستی ہے جس کے لئے سنگاپور کا سرکردہ بدمعاش جان ینگ دیوانہ ہوا جا رہا ہے۔ اور جس کی تلاش میں بے شمار لوگ شہر کی گلیوں کو مسلسل ناپ رہے ہیں۔

صرف پانچ دس منٹ کے اندر اندر کرنیل سنگھ ہم سے رخصت ہو کر فلیٹ سے نکل گیا۔

''یار! بڑے اچھے موقع پر پہنچے ہیں۔'' عرفات نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ دو چار منٹ لیٹ ہو جاتے تو اس باگڑ بلے نے نکل جانا تھا اپنی باگڑ بلی کی طرف۔ ہمیں دروازے لاک ملنے تھے۔''

امریتا ابھی تک میرے بازو سے لگی کھڑی تھی۔ میں اسے کمرے میں لے آیا۔ خود کو اس سے جدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں ہوئی۔ کچھ اور بھی چمٹ گئی۔ اس نے پھر آنسو بہانے شروع کر دیئے تھے۔ میں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اس کی کومل بانہوں کی گرفت میرے گردن کے گرد سخت ہو گئی۔ اس کا چہرہ میری گردن کے نچلے حصے سے پیوست تھا۔ اس کے گرم آنسو میرے سینے پر رینگنے لگے۔ کمرے کی کھڑکیوں سے باہر ہوا پھولوں کی مہک سے لدی ہوئی تھی۔ سمندر کی کوکھ سے ابھرنے والے چاند کی کرنیں ایک چالیس پچاس منزلہ بلڈنگ کے عقب سے پھوٹ رہی تھیں۔

میرے سینے میں منہ چھپائے چھپائے امریتا نے عجیب نمناک لہجے میں کہا۔

''دای! تم نے کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟''

میں سرتاپا کانپ گیا۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

''انجان مت بنو۔ تم لفظ لکھنا جانتے ہو۔ لفظوں کے مطلب بھی سمجھتے ہو۔ پھر تم لفظوں کی شکتی کو کیوں نہ سمجھ سکے۔ کیوں نہ یہ جان سکے کہ تمہارے لکھے ہوئے لفظ صرف تمہارے ہیں۔ وہ کسی اور کا درپن نہیں بن سکتے۔ کوئی اور ان لفظوں کو پہن کر میرے سامنے آئے گا تو مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گا۔ میں اندھی، بہری اور گونگی ہو جاؤں گی۔''

وہ بڑے جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا

جواب دوں۔ میں خاموش رہا۔

وہ میرے سینے سے لگے لگے بولتی رہی۔ ''کیا تمہاری دانست میں لفظ اتنے ہی حقیر ہوتے ہیں کہ جو چاہے ان کے گلے میں پٹا ڈال کر انہیں اپنے ساتھ لے جائے؟ ان کو اپنی جاگیر بنا لے؟ وہ کوئی احتجاج نہ کر سکیں۔ کوئی واویلا نہ مچا سکیں۔ تم نے کیوں سمجھا ایسا؟ کیوں ایسا گمان کیا؟ تم نے کھیل کھیل میں کچھ لفظ لکھے۔ ان لفظوں سے ایک سمبندھ بنایا۔ تمہارے لئے یہ ایک شغل تھا۔ تم نے شغل کیا اور بھول گئے۔ تم نے یہ نہ سوچا تمہارے اس شغل نے کسی کے جیون میں کیا اکھاڑ پچھاڑ مچائی ہے۔ کتنا برباد کیا ہے کسی کو۔ ہاں تم بھول گئے...... لیکن یہ بھولنا بھی بھولنا نہیں تھا۔ تم نے کسی سے دھوکا کیا دای! اور خود اپنے آپ سے بھی دھوکا کیا۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی اور میرے ساتھ کچھ اور بھی پیوست ہو گئی۔

میں نے اس کے گھنے ریشمی بالوں پر ہونٹ رکھے اور کراہ کر کہا۔

''ہاں امرت! ٹھیک کہتی ہو۔ مجھ سے قلم اور لفظ کی طاقت کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔''

وہ میرے سینے میں سماتی چلی گئی۔ میں نے اسے ایک جذب کے ساتھ اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ دائیں طرف کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی میں سے جگمگاتا ہوا سنگاپور اپنی ہزارہا ''دریچہ آنکھوں'' سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

وہ رات کو میرے ساتھ ہی کمرے میں رہی۔ ہم الگ الگ سنگل بیڈ پر سوئے۔ درمیان میں ایک سائیڈ ٹیبل تھی۔ مگر رات کو بھی میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہا۔ سوتے میں گاہے بگاہے وہ یوں بدک جاتی تھی جیسے چھوٹا بچہ نیند میں ڈر جاتا ہے۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ ایک دلنواز والہانہ پن تھا۔ اس کے انداز میں۔ اس کی سوگواری نے اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ دھلے دھلائے، نکھرے ہوئے پھول کی طرح نظر آتی تھی۔

صبح ہم نے کمرے میں ہی ناشتہ کیا۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے چند لقمے لئے...... یہ لقمے لیتے ہوئے بھی وہ میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔

میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"امریتا! کیا بات ہوئی تھی؟ تم ایک دم وہاں سے کیوں نکل آئیں۔ کسی کو بتایا تک نہیں۔"

اس نے اپنا رخسار میرے کندھے پر دھرا اور اپنی بھیگی آنکھیں موند کر بولی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو دامی...... راکیش وہ نہیں جو نظر آتا ہے۔ اس کے اندر ایک غنڈہ چھپا ہوا ہے...... ایک خطرناک شخص۔"......

"کیا کل کوئی بات ہوئی تھی؟"

"کل نہیں، پرسوں رات" وہ ہولے سے بولی۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ "رات کا پچھلا پہر تھا۔ فون کی گھنٹی راکیش نے بہت دھیمی کر رکھی تھی۔ گھنٹی بجی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ ہلکے سے نشے میں بھی تھا۔ اس نے سمجھا میں سو رہی ہوں۔ وہ اپنے کسی "گپتا" نامی دوست سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ اس نے اسے جھڑکا کہ وہ آئندہ ہوٹل کے نمبر پر اس طرح فون نہ کرے۔ پھر وہ کسی کورین لڑکی کی بات کرنے لگا۔ اس لڑکی کو ننگی گالیاں دینے لگا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"اس کتیا کو بتا دو جس کے ساتھ کہیں گے اس کے ساتھ سونا پڑے گا اسے۔"

اس طرح کی دو چار باتیں اور بھی کیں اس نے۔ پھر فون بند کر دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ امریتا کا سارا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سوتے زیادہ گرم پانی اگلنے لگے تھے۔ یہ پانی میرے کندھے میں جذب ہو رہا تھا۔

کچھ دیر تک ایک گمبھیر خاموشی کمرے میں طاری رہی۔ پھر امریتا نے عجیب منمناتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"دامی! مجھے جالندھر لے چلو...... باؤجی کے پاس...... وہ مجھے بہت یاد آ رہے ہیں۔"

میں نے اسے تھپکا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا امرت...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"وہ بیمار ہیں۔ میں نے تھرس ڈے کو انہیں فون کرنا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ خالہ بھی انتظار کر رہی ہوں گی۔ کچھ کرو دامی!"

"اچھا میں پتہ کرتا ہوں کہ یہاں کہیں آس پاس سے فون ہو سکتا ہے؟" میں نے اٹھنے کے لئے حرکت کی لیکن اس نے مجھے تھامے رکھا۔

"نہیں دامی! اپنے دوست کو بھیج دو۔ تم میرے پاس رہو۔"

"ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے کمرے سے باہر تو جانے دو۔"

"اس نے بادل نخواستہ اپنے بازو میرے گرد سے ہٹائے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ چند سیکنڈ کے لئے بھی مجھ سے دور ہونا نہیں چاہتی۔"

باہر آ کر میں نے عرفات اور ظہیر سے بات کی۔ ظہیر نے بتایا کہ انٹرنیشنل کال کے لئے ہمیں یہاں سے کم از کم دو بلاک آگے بڑی سڑک بلیو روڈ پر جانا پڑے گا۔ عرفات نے بھی کہا کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ میں نے واپس کمرے میں جا کر امریتا کو صورت حال بتائی۔ وہ کچھ اور بھی بے تاب نظر آنے لگی۔

میں نے کہا۔ "ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔ میں اور عرفات جاتے ہیں۔ میں تمہارے باؤجی سے بات کرتا ہوں اور انہیں تمہاری طرف سے پوری تسلی تشفی دیتا ہوں۔ میں انہیں بتا دیتا ہوں کہ امریتا ایک دو دن میں خود ان سے بات کرے گی۔"

"لیکن دامی......!"

"امریتا تمہارا خود باہر نکلنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح سمجھتی ہو۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

وہ مضطرب نظروں سے کھڑکیوں کے پار دیکھنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ اپنے اردگرد کے حالات کی وجہ سے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ کراہ کر بولی۔

"اگر ایسی بات ہے دامی! تو پھر تم بھی نہ جاؤ۔ تمہارے لئے بھی تو باہر خطرہ ہے۔"

"لیکن تمہارے لئے زیادہ ہے۔ تم لڑکی ہو۔ اپنے حلیے اور صورت سے فوراً انڈین کے طور پر پہچانی جاتی ہو۔"

"تو پھر اپنے کسی دوست کو بھیج دو۔ کم از کم وہ لوگ تو انہیں نہیں پہچانتے جن سے براڈوے پر تمہاری لڑائی ہوئی تھی۔"

"لیکن امرت! جس طرح میں باؤجی سے بات کر سکوں گا اور انہیں تسلی دے

سکوں گا یہ نہیں کر سکیں گے۔ باؤجی اچھی طرح جانتے ہیں مجھے۔ پھر مجھے پاکستان میں بھی تو بات کرنی ہے۔"

تھوڑی سی بحث تمحیص کے بعد امریتا قائل ہوگئی۔

میں جانے کے لئے تیار ہوا۔ لیکن وہ بدستور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ میں نے بمشکل ہاتھ چھڑایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی دروازہ کھولا نہیں تھا کہ وہ پھر میری طرف آئی اور لپٹ گئی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ پتہ نہیں کتنے ساون کا پانی جمع ہو چکا تھا اس کی آنکھوں میں۔ دلفگار آواز میں بولی۔

"مجھے شما کر دو دای۔ میں نے تمہیں تھپڑ مارا۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں اپنے ہوش میں نہیں تھی۔"

اس واقعے کا درد میرے دل میں بھی تازہ ہوگیا۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

وہ بولی۔ "مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے...... سزا دو دای۔ تم بھی مجھے مارو۔" اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں گھسا دیا۔ اس کی من موہنی ناک میرے سینے پر چبھ رہی تھی۔ میں نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا حلقہ بنا لیا۔ وہ روتی جا رہی تھی۔

"رب کرے میرے ہاتھ ٹوٹ جاتے۔ میں نے کیوں مارا تمہیں۔ بھرے بازار میں تمہاری بے عزتی کی...... مجھے سزا ملنی چاہئے۔"

میں نے خود کو سنبھالا اور گہری سانس لے کر کہا۔ "ہاں سزا تو تمہیں ملنی چاہئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔"

وہ چپ رہی۔ جیسے میری طرف سے سزا سنائے جانے کی منتظر ہو۔ میں نے سر جھکا کر اس کے ریشمی بالوں کو اس کے کان پر سے ہٹایا اور لرزاں لہجے میں سرگوشی کی۔

"سزا یہ ہے کہ میرے پیار کا اقرار کرو۔ ابھی اسی وقت۔"

اس نے اپنی تر بتر سرخ آنکھیں اٹھا کر قدرے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ جیسے میرے لفظوں کا درست مطلب سمجھنے کے لئے میرے تاثرات سے بھی مدد لینا چاہتی ہو۔ پھر تفہیمی انداز میں اس نے سر دوبارہ میرے سینے سے لگا دیا۔ میں نے

بڑی نرمی سے اس کے بال سہلائے اور اس کے کان میں جذباتی سرگوشی کی۔

"ڈو یو لو می؟"

اس کے کومل جسم میں بڑی پیاری سی لرزش نمودار ہوئی۔ اس نے پہلے اثبات میں سر ہلایا پھر سسکی لے کر بولی۔

"آئی لو یو۔"

کائنات کی گردش جیسے تھم گئی۔ ہزاروں عمارتوں کی ہزار ہا کھڑکیاں تھیں۔ ہر کھڑکی میں ایک شادیانہ گونج اٹھا۔

"ایک بار پھر۔" میں نے کراہ کر کہا۔

"آئی لو یو۔"

"ایک بار پھر۔"

"آئی لو یو۔" وہ چہرہ میری بانہوں میں چھپاتے چھپاتے بولی۔

تھوڑا سا توقف کر کے اس نے چند اور سسکیاں لیں اور بولی۔ "آئی لو یو۔ اور اب سے نہیں بہت پہلے سے۔ شاید تب سے جب تمہارا پہلا پتر ملا تھا۔"



میں اور عرفات ایک سرکاری کال آفس پر سے فون کرنے کے لئے قریباً ایک کلومیٹر دور گئے۔ یہ علاقہ ہوٹل نیو براڈوے اور بگیز وغیرہ سے بہت دور تھا۔ پھر بھی ایک انجانا خوف ہر پل ہمارے ساتھ سائے کی طرح چل رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کسی جانب سے دو چار مقامی غنڈے برآمد ہوں گے اور ہماری خیریت پوچھنا شروع کر دیں گے۔ (میں ابھی تک چپل میں تھا۔ میرے جوتے ہوٹل میں رہ گئے تھے۔)

امریتا کے دیئے ہوئے فون نمبر پر میں نے کال کی۔ دوسری کوشش پر رابطہ ہو گیا۔ ہزاروں میل دور سے امریتا کے باؤجی کی کمزور اور دکھی آواز سنائی دی۔

''ہیلو کون؟''

اگلے قریباً دس منٹ تک میرے اور باؤجی کے درمیان تسلی بخش بات چیت ہوئی۔ وہ میری آواز نہیں پہچان سکے۔ میں نے بھی اپنا تعارف کرانا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے انہیں صرف اتنا بتایا کہ میں ان کا اور ان کی بیٹی کا ایک سچا خیر خواہ پاکستانی ہوں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے خدا کو حاضر ناظر جان کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی بیٹی بالکل خیریت سے ہے اور ہر طرح محفوظ ہے۔ وہ آپ کو ست سری اکال کہتی ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دو دن میں فون پر آپ سے اس کی بات کراؤں گا۔ باؤجی کی آزردہ آواز ابھری۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ تب تک میرے پران نکل چکے ہوں۔''

''آپ مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ اوپر والے کا شکر ادا کریں کہ آپ کی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اور بہت جلد آپ اسے دیکھ سکیں گے۔''

انہوں نے اٹکتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''کہیں تم...... وہی تو نہیں ہو۔ مم...... میرا مطلب ہے ارباز۔''

''پتا نہیں آپ کس ارباز کی بات کر رہے ہیں۔ میں اپنا نام آپ سے مل کر آپ کو بتاؤں گا۔ کال بہت لمبی ہو گئی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ انشاء اللہ دو تین دن میں پھر بات ہو گی۔''

چند مزید فقروں کے تبادلے کے بعد یہ کال ختم ہو گئی۔ دوسری کال میں نے پاکستان میں اپنے اہل خانہ کو کی۔ والد اور بڑے بھائی سے بات ہوئی۔ بڑے بھائی کچھ ناراض محسوس ہوئے۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ ان حالات سے آگاہ تو نہیں ہو گئے جو جالندھر میں پیش آئے تھے۔ نریندر صاحب سے تو ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ وعدہ خلافی کر کے بھائی جان کو کچھ بتائیں گے۔ پھر کیا ہو سکتا تھا؟

والد صاحب نے مجھے تاکید کی کہ میں ملائیشیا میں وقت ضائع نہ کروں اور جلد سے جلد جاب حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ انہوں نے والدہ کے متعلق بتایا کہ انہیں میرے فون کا انتظار تھا۔ لیکن آج وہ بہن کے گھر گئی ہیں...... فلیٹ واپس پہنچے تو امریتا بڑی بے قراری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ یوں تھامے جیسے طویل عرصے کے بعد ملی ہو۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اسے باؤجی سے ہونے والی گفتگو کی مکمل تفصیل بتائی۔ میں نے اسے بتایا کہ باؤجی تین چار دن ہسپتال میں ایڈمٹ رہے ہیں۔ لیکن اب بالکل ٹھیک ہیں اور گھر میں ہیں۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ اس گفتگو کی تفصیل سنتی رہی۔ بیچ میں ایک دو بار اس نے کہا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو نا؟''

جب اس نے تیسری بار یہ فقرہ کہا تو میں نے جواب دیا۔

''میں راکیش نہیں ہوں۔ میں تمہارے باؤجی سے واقعی بات کر کے آیا ہوں۔''

وہ میرے کندھے سے لگ گئی۔

واپس آتے ہوئے راستے میں ایک سوال مسلسل میرے ذہن میں ابھرتا رہا تھا۔ اب امریتا سامنے تھی۔ میں اس سے یہ سوال پوچھ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

''تمہارے کاغذات کہاں ہیں؟ پاسپورٹ وغیرہ۔''

وہ چونکی اور اس کے معصوم چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ ''وہ تو شروع سے راکیش کے پاس ہیں۔''

''جو بیگ تمہارے پاس ہے اس میں تو نہیں ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور میں نے سر پکڑ لیا۔ وہ جلد از جلد انڈیا واپس جانے کی بات کر رہی تھی لیکن وہ پرواز کے قابل نہیں تھی۔ اس کے پر کاٹ کر راکیش پانڈے نے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔

''یہ تو بہت برا ہوا امریتا۔ کاغذات کے بغیر تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ کوئی فوٹوسٹیٹ وغیرہ بھی نہیں تمہارے پاس؟''

''ایک فوٹوسٹیٹ ''سیٹ'' تو تھا لیکن وہ بھی راکیش نے پاس رکھا ہوا تھا۔''

امریتا کو بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ وہ جو پہلے ہی گم صم تھی اور بھی گم صم نظر آنے لگی۔ اس کی خوبصورت ناک سرخ تھی اور اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ آنکھیں پھر برسنے لگیں گی۔

میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''حوصلہ رکھو امرت...... کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ ہم نکال لیں گے کوئی نہ کوئی راستہ۔''

وہ رات بھی پریشانی اور غیر یقینی کیفیت میں گزری۔ میں اور امریتا ایک ہی کمرے میں علیحدہ علیحدہ بیڈ پر سوئے۔ تاہم امریتا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا۔ وہ میرے ہاتھ کو سہلاتی رہی' دباتی رہی' اس کے ریشمی ہاتھ میں سے جیسے محبت' یقین اور توانائی کی لہریں نکل کر میرے جسم میں سرایت کرتی رہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں اس ڈری سہمی سادہ مزاج لڑکی کے لئے بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرا سکتا ہوں۔ حوادث کے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہلا سکتا ہوں۔

نیند کی آغوش میں پہنچنے سے پہلے اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے رخسار کے نیچے رکھا اور ناک میں گنگناتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ''وائی! اب مجھے چھوڑنا مت۔ میں جی نہیں سکوں گی۔ میں تمہارے جیون میں آنے کے قابل تو نہیں ہوں لیکن...... دوست بن کر......''

''چپ ہو جاؤ۔'' میں نے بڑے پیار لیکن سختی سے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ وہ سسک کر خاموش ہو گئی۔ میرا ہاتھ اس کے ہونٹوں سے پھسل کر اس کی ٹھوڑی پر ٹک گیا۔ وہ غنودگی میں تھی۔ دھیرے دھیرے سو گئی۔ میں ہاتھ اس کے رخسار کے نیچے سے کھینچ نہیں سکتا تھا اس لئے ذرا سا بے آرام ہونے کے باوجود کروٹ کے بل ہی پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میری نگاہ فرش پر گئی۔ اس کے لمبے مخملی بال منتشر ہو کر بستر سے لٹک گئے تھے اور فرش کو چھو رہے تھے۔ جیسے کوئی نٹ کھٹ بچہ ماں کی نظر بچا کر مٹی میں لوٹنے لگے۔ میں نے ان نٹ کھٹ بالوں کو بڑے پیار سے سنبھالا اور آہستہ سے اس کی کمر کے پیچھے پھینک دیا۔



اگلے روز عرفات نے ظہیر کو تو ''کلانگ'' واپس بھیج دیا لیکن خود میرے ساتھ رہا...... میری طرح وہ بھی اس خبر سے پریشان تھا کہ امریتا کے سارے سفری کاغذات راکیش کے قبضے میں ہیں۔ موجودہ حالات میں وہ جتنی جلدی سنگاپور سے نکل سکتی اتنا ہی اس کے لئے اچھا تھا...... لیکن کاغذات کے بغیر وہ یہاں ''ٹریپ'' تھی۔

تیسرے دن کرنیل سنگھ کوالالمپور سے سنگاپور واپس آ گیا۔ ہمارے لئے اچھی اور کرنیل کے لئے ''بہت اچھی'' خبر یہ تھی کہ ابھی اس کی پتنی واپس نہیں آئی تھی۔ اس کے کچھ عزیز بنکاک سے کوالالمپور آئے ہوئے تھے اور وہ چھ سات روز مزید انہیں کمپنی دینا چاہتی تھی۔ اور عین ممکن تھا کہ کچھ زیادہ وقت بھی لگ جاتا۔ کرنیل اب ساری ساری رات گھر سے باہر رہنے کے لئے آزاد تھا۔ نائٹ لائف' نائٹ کلب' کسینو' ہلتی ہوئی گاڑیاں' ایلوس پریسلے کے گانے۔

وہ تھکا ہوا آیا تھا۔ رات بھر فلیٹ کے تیسرے بیڈروم میں فقط ایک چڈی اور بنیان پہنے ٹانگیں پسار کر سویا رہا۔ اگلے دن بارہ بجے کے قریب اٹھا۔ ناشتے کے بعد عرفات اسے گھیر کر بیٹھ گیا۔

''یار کرنیلے! تو ایک نمبر کا بے غیرت ہے۔ سارے شہر میں کتے خسی کرتا ہے۔ سنگاپور کے ہر اچھے برے گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے تو نے...... اتنے بڑے اخبار کا رپورٹر ہے۔ تیرے ہوتے ہوئے ہم اتنے ذلیل ہو رہے ہیں۔ یار کچھ تو شرم کر۔''

''اوئے کھوتوف! مجھے کچھ بتائے گا تو پتہ چلے گا نا۔ تم نے بس اتنا کہا ہے کہ یہ بی بی دائم صاحب کی گرل فرینڈ ہے۔ اس کے علاوہ تو نے اپنے منحوس منہ سے کچھ پھوٹا ہے؟ اگر پھوٹا ہے تو بتا۔''

''اوئے اب تو پھوٹ رہا ہوں نا۔ اس وقت تو تو فائر بریگیڈ بنا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس کی آگ بجھانے جا رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کا ٹائم نہیں تھا تیرے پاس۔''

''اچھا اب تو اطمینان سے بیٹھا ہوں بھج بھونجڑے! اب بتا۔''

عرفات نے میری طرف دیکھا۔ پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق الف سے لے کر ے تک سب کچھ کرنیل سنگھ کے گوش گزار کر دیا۔ کوئی ایک بات بھی چھپا کر نہیں رکھی۔ عرفات کو کرنیل پر پورا پورا اعتبار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''وائی! جتنا بھروسا مجھ پر کرتے ہو اتنا ہی اس پر بھی کر سکتے ہو۔ میری طرف سے پوری گارنٹی ہے۔ اور میں نے اس کی گارنٹی مان لی تھی۔''

کرنیل بے حد توجہ اور حیرانی سے سنتا رہا۔ گاہے بگاہے سوالات بھی کرتا رہا۔ یہ بات اس کے لئے بے حد انکشاف انگیز تھی کہ جان ینگ اور راکیش جیسے غنڈوں کے درمیان جو لڑکی وجہ تنازعہ بنی ہوئی ہے وہ امریتا ہے اور اس کے فلیٹ میں موجود ہے۔ یہ تشویشناک انکشاف تھا۔ اس انکشاف نے کرنیل کو تھوڑا سا پریشان بھی کیا لیکن جلد ہی اس نے اس پریشانی پر قابو پا لیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں پھیل گئیں۔ سنجیدگی سے بولا۔

''شک تو مجھے اس وقت ہوا تھا جب تم نے تراشا مجھ سے لیا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے تم دونوں کوئی بات چھپا رہے ہو۔''

''اس وقت ہم خود بھی چکرائے ہوئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے؟''

کرنیل گہری سانس لے کر بولا۔

''یہ مسئلہ تم لوگوں کی توقع سے زیادہ ٹیڑھا ہے۔ امریتا کے پاس پاسپورٹ ضرور ہونا چاہئے تھا۔ تمہیں پتہ ہی ہے سنگاپور کے سخت قانون کا۔ اگر ہم نیا پاسپورٹ بنوا کر اس پر اندراج کرانا چاہیں تو اس میں مہینے لگ سکتے ہیں۔''

''دوسرا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قانون کی مدد لی جائے۔ یہ بات بالکل کلیئر ہے کہ راکیش کے ہاتھ صاف نہیں ہیں۔ وہ اپرادھی ہے۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہونے کے

باوجود ایک لڑکی کو دھوکے سے سنگاپور لایا ہے اور اب اس کی مرضی کے خلاف اسے جنسی کاروبار میں دھکیلنا چاہتا ہے...... مجھے وشواس ہے کہ اگر ''پراپر'' طریقے سے کورٹ میں امریتا کا بیان ہو جائے تو راکیش کو دن میں تارے نظر آ جائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ راکیش کے ساتھ ساتھ جان کو بھی پسوڑی پڑ جائے۔ لیکن......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔

''لیکن بات یہ ہے کہ یہ خطرناک لوگ ہیں۔ ان کے خلاف کورٹ میں پہنچنے کے لئے انگاروں پر چلنا پڑتا ہے۔''

''یہی بات تو ہمارے ذہن میں آئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کی بات بالکل صحیح ہے کہ اگر مضبوط شہادتوں کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف مقامی قانون حرکت میں آ جائے تو انہیں دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔ مگر یہ قانون کو حرکت میں آنے دیں گے تو تب ہے نا۔ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ امریتا مشرقی لڑکی ہے۔ بے حد سادہ مزاج بھی ہے۔ قانونی کارروائی میں جو جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں یہ شاید نہ بیل سکے۔''

عرفات نے اپنی کشادہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات راکیش بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوگا کہ یہاں اس کی قانونی پوزیشن کس قدر کمزور ہے۔ ایک مرتبہ قانونی معاملات چھڑ گئے تو راکیش کے بہت سے سابقہ جرم بھی اس کے گلے کا پھندا بننے لگیں گے۔ اگر اس سے یوں بات کی جائے کہ دیگر قانونی شکنجوں سے بچنے کے لئے وہ امریتا کو یہاں سے بحفاظت نکل جانے دے تو شاید اس کی سمجھ میں آ جائے۔ راکیش کے سامنے یہ تجویز رکھنے کے لئے ضروری نہیں کہ ہم اس کے سامنے بھی جائیں۔ یہ بات فون پر بھی ہوسکتی ہے۔''

''یہ تمہاری بھول ہے۔'' کرنیل سنگھ نے اپنی اسٹائلش مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ سورامی (سؤر جمع حرامی) اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا کہ تمہاری ایک کال پر چٹی کو بہن بنا لے اور اس کا پاسپورٹ لے کر تمہارے پاس پہنچ جائے۔ اس کے لئے کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔''

''تو کرو نا تلاش۔'' عرفات نے کہا۔

کرنیل سنگھ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کیس کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی میں سمٹے ہوئے تھے۔ پگڑی کے بغیر بھی اس کا سر کافی بڑا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور پرسوچ انداز میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر ہم سے اجازت لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ پانچ دس منٹ بعد باہر آیا اور پھر نیلے رنگ کے ٹیلی فون کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک چڈی اور بنیان میں تھا۔ پورے جسم پر بال تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ایک نوجوان ریچھ صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے اور فون کر رہا ہے۔

اس نے دو تین جگہ فون کیا۔ ایک جگہ انگلش میں اور دو جگہ ملائی میں بات کی۔ اندازہ ہوا کہ وہ ''ملائی'' بھی اچھی بول لیتا ہے۔

اسی دوران میں کال بیل ہوئی۔ اس کا کوئی ملنے والا آ گیا تھا۔ اس نے جاگنگ سوٹ کا سرخ ٹراؤزر پہنا اور ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ عرفات اس سے کچھ پوچھتا اس کا ایک فون آ گیا۔ کرنیل سنگھ ایک بار پھر پورے خشوع خضوع سے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ملائی میں بات کر رہا تھا۔ عرفات کو تو کچھ نہ کچھ سمجھ آ رہی تھی مگر میں بہروں کی طرح بیٹھا تھا۔ عرفات کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ یہ ہمارے ہی کام کی بات ہو رہی ہے۔ بولنے والا کرنیل کا کوئی بے تکلف دوست تھا۔ وہ گاہے گاہے مسکرا رہا تھا اور اپنے دوست کے لئے غالباً رنگ برنگے خود ساختہ خطاب بھی استعمال کر رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اس نے کاغذ پر چند نوٹس بھی کئے۔

آخر اس کی گفتگو ختم ہوئی اور وہ ہم دونوں کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ کامیابی ملی ہے۔ کسی لمبی چوڑی تمہید کے بغیر وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''یہاں ایک بڑی دھانسو عورت ہے گرماتا۔ اسے گرماتا انڈین بھی کہتے ہیں۔ نام سنا ہوا ہے۔؟''

عرفات نے آنکھیں سکوڑتے ہوئے کہا۔ ''نام کچھ سنا سنا سا تو لگتا ہے۔ شاید قتل کیس میں اس کا نام آیا تھا۔''

''ہاں ایسے کاموں میں ہی نام آتا ہے اس کا۔ بڑی بندے مار قسم کی زنانی

ہے اور ایک نمبر کی لفنگی۔ فرنگون میں رہتی ہے۔ جواء' شراب' زنا کاری ہر کام ہوتا ہے اس کی نگرانی میں۔ ہمارے کام کی بات یہ ہے کہ کچھ دوسرے بڑے بڑے بدمعاشوں کی طرح راکیش بھی اس عورت سے دبتا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے راکیش پر گولی چلا دی تھی۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا وہ۔ اس عورت میں اتنی شکتی ہے کہ وہ چاہے تو راکیش کو کسی بات پر مجبور کر سکتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ......"

"میری پوری بات تو سن لے بہن کے چھنکنے!" کرنیلے نے عرفات کو ٹوکا۔ پھر سگریٹ کا لمبا کش لے کر بولا۔ "گرماتا میں برائیاں تو بے شمار ہیں لیکن ایک چھوٹی سی خوبی بھی ہے۔ کبھی کبھی ناریوں پر ترس کھا لیتی ہے۔ خاص طور سے ان ناریوں (عورتوں) پر جن کو مردوں کی طرف سے جبر کا شکار کیا گیا ہو۔ میرا من کہتا ہے کہ اگر امریتا یا امریتا کی طرف سے کوئی اور شخص گرماتا سے ملے اور اسے ساری حقیقت سے آگاہ کرے تو شاید وہ کچھ کرنے کی حامی بھر لے۔ ہے تو وہ پرلے درجے کی بدلحاظ اور لالچن۔ ڈالر کے بغیر تو ایک قدم نہیں چلتی لیکن ایک بات Sure ہے۔ اگر اس نے کچھ کرنے کا وعدہ کر لیا تو کرے گی ضرور۔"

"اور اگر الٹا ہمارے ہی گلے پڑ گئی تو؟ کیا پتہ آج کل اس حرامی راکیش سے اس کے تعلقات اچھے ہوں۔ وہ ہمیں گردن سے پکڑ کر اس کے حوالے کر دے۔" عرفات نے نکتہ اٹھایا۔

کرنیل بولا۔ "کھوتے اور بیوقوف کو جمع کریں تو کھوتوف بنتا ہے۔ اسی طرح ڈرپوک اور بیوقوف کو ملائیں تو ڈرقوف بنتا ہے۔ تیرے لئے یہ نام بھی مناسب ہے۔ اوئے کم عقلا! میں تجھے کوئی بی بی سی کی خبر نہیں سنا رہا۔ اندر کی بات بتا رہا ہوں۔ جس بندے نے یہ اندر کی بات بتائی ہے وہ سب کچھ جانتا ہے گرماتا کے بارے میں۔"

"پھر کیا رائے ہے تمہاری؟" عرفات نے پوچھا۔

"گرماتا جیسی عورت اگر چاہے تو راکیش سے امریتا کا پاسپورٹ وغیرہ واپس لے سکتی ہے اور اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ امریتا کو سنگاپور سے جانے دے۔"

"کیا تمہارا مشورہ ہے کہ امریتا اور وائم اس کے پاس جائیں یا پھر وائم اور

میں چلے جائیں؟"

"اس بارے میں سوچ بچار کر لو۔"

اگلے چوبیس گھنٹے ہم نے سوچ بچار اور معلومات حاصل کرنے میں گزارے۔ فرنگون کا علاقہ بگیز سے زیادہ دور نہیں تھا اور بگیز ہمارا دیکھا بھالا تھا۔ پتا چلا کہ بگیز سے صرف پندرہ منٹ کی واک پر فرنگون شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سنگاپور کا پس ماندہ محلہ تھا۔ یہاں گھٹیا درجے کے ریستوران' شراب خانے اور قحبہ خانے تھے۔ جہاں سے فرنگون کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ سنگاپور کا سارا نظم وضبط اور رکھ رکھاؤ ختم ہو جاتا تھا۔ گرماتا نامی اس عورت کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بظاہر ایک ہوٹل چلاتی ہے لیکن اس کے دھندے بے شمار ہیں۔ ان گنت عورتیں اور لڑکیاں سیکس لیبر کے لئے اس سے رجوع کرتی ہیں اور وہ اپنی نگرانی میں ان سے دھندا کرواتی ہے۔ اس طرح کی اور کئی باتیں بھی گرماتا کے بارے میں معلوم ہوئیں۔ اسے دیکھے بغیر ہی اس کا دبدبہ سا ہم پر طاری ہو گیا۔

امریتا زیادہ تر کمرے میں ہی رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے دل میں کئی طرح کے ڈر بیٹھ گئے ہیں۔ ذرا سی آہٹ پر ہرنی کی طرح چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ میں جانتا تھا اس کے دل و دماغ میں سب سے اہم خوف راکیش کے حوالے سے ہے۔ وہ ڈرتی ہے کہ راکیش یا اس کا کوئی ساتھی اسے ڈھونڈتا ہوا اس فلیٹ تک پہنچ جائے گا۔ فلیٹ سے باہر جانا تو دور کی بات ہے' وہ فلیٹ کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔

رات کو میں نے دیکھا وہ ٹیبل لیمپ کے پاس بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ دیر تک لکھنے میں مصروف رہی۔ آخر مجھے پوچھنا پڑا۔ "کیا لکھ رہی ہو؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ سوگواری سے مسکرائی۔

"شاید باؤجی کو خط لکھ رہی ہو۔"

"نہیں۔ یہ تمہارے حوالے سے کچھ ہے۔"

"اوہ۔" میں نے ہونٹ سکوڑے۔

"کیا ہے؟ کچھ بتاؤ گی تو پتہ چلے گا۔"

''اندازہ لگاؤ۔''

میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے چھت کو گھورا۔ پھر امریتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میٹ وائی روڈ پر تم سے جو تھپڑ والی غلطی ہوئی تھی اس کے بدلے میں تم نے کچھ لکھا ہے۔ شاید ایک ہزار ایک سو ایک مرتبہ I Love You۔''

''اس کے چہرے پر شرم کی سرخی لہرائی۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''اس واقعے کے لئے تو میں خود کو جیون بھر معاف نہیں کرسکوں گی لیکن یہ کچھ اور ہے۔''

''بھئی! مجھے غیب کا علم ہوتا تو ایم اے کر کے جوتیاں نہ چٹخا رہا ہوتا۔ میٹرک کر کے سٹاک ایکسچینج میں چلا جاتا اور لاکھوں میں کھیلتا۔''

''اچھا دیکھ لو۔'' وہ کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے پڑھا اور یہ میرا ہی لکھا ہوا خط تھا۔ پہلا خط۔ امریتا نے ہر لفظ ہوبہو نقل کیا تھا...... ''آپ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ کچھ معلوم نہیں اور شاید کبھی معلوم ہو بھی نہ سکے گا۔ لیکن آج لاہور کی اس خوش رنگ شام میں' ایک گھر کی چھت پر' اپنے لفظوں میں سما کر آپ مجھ سے ملی ہیں۔ یہ کاغذ پر لکھے ہوئے لفظ بھی کیا چیز ہوتے ہیں امریتا۔ کہنے کو ساکت و جامد ہوتے ہیں لیکن ان میں دنیا جہان کے رنگ' ذائقے' لمس اور جذبے حرکت کرتے ہیں۔''

میں حیرت کے عالم میں پڑھتا چلا گیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑ رہا تھا' امریتا نے اس طویل خط میں کہیں ایک حرف کا ردوبدل بھی نہیں کیا تھا۔

خط پڑھنے کے بعد میں نے نم آنکھوں سے امریتا کو دیکھا۔

''یہ سب کچھ کیسے یاد رہا تمہیں؟''

''تمہارے سارے پتر میں نے درجنوں دفعہ پڑھے ہیں اور یہ پہلا پتر تو اتنی دفعہ کہ اِس کا ایک ایک حرف ذہن پر نقش ہو چکا ہے۔''

میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس خاموش نظروں سے جالندھر کی اس عجیب و غریب امریتا کو دیکھتا رہا۔ وہ ناقابل فہم تھی۔ مگر اس کی یہ خاصیت مجھے الجھاتی نہیں تھی اور بھی زیادہ اس کی طرف کشش کرتی تھی۔

میں کچھ مزید کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ پہلے ہی بول پڑی۔

''دای! باؤجی سے کب بات کراؤ گے۔''

''امید ہے کل تک۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''باؤجی کی آواز سننے کو کان ترس رہے ہیں۔ ہائے ربا! ان کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو میرے بغیر ایک پل نہیں گزارتے تھے۔''

''پھر بھی اتنی دور بھیج دیا تمہیں؟'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''وہ نہیں بھیجنا چاہتے تھے دای! لیکن مجبور تھے۔ شاید باؤجی جیسے سارے پتا مجبور ہوتے ہیں۔ وہ اپنی لاڈلیوں کو اچھے اور کھاتے پیتے رشتوں کی خاطر خود سے جدا کرتے ہیں اور سات سمندر پار بھیج دیتے ہیں۔ انہیں سنگاپور' نیویارک' لندن اور پیرس جیسے شہروں میں اپنی لاڈلی بیٹیوں کا چمکتا ہوا مستقبل نظر آتا ہے۔ لیکن وہ آفتیں نظر نہیں آتیں جو وہاں ان غریب لڑکیوں کے لئے منہ پھاڑے کھڑی ہوتی ہیں۔ بابل کے آنگن سے جدائی تو ہر لڑکی کا نصیبا ہوتی ہے دای...... پر یہ کیسی جدائی ہے؟ اس نے تو مجھے میری جڑوں سے ہی کاٹ دیا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور بے ساختہ اس کے سر پر اپنے ہونٹ رکھے۔

''حوصلہ رکھو امریتا! تم ضرور اپنے ویش لوٹو گی...... اپنے باؤجی سے ملو گی۔''

پھر میں اٹھ گیا۔

''کہاں جارہے ہو؟'' وہ ہمیشہ کی طرح بے تاب ہو اٹھی۔

''بھئی کہیں نہیں۔ اٹھ کر کھڑکی بند کرنے لگا ہوں۔''

وہ اپنی بے چینی پر خود ہی خجل ہوگئی۔



اگلے روز طے شدہ پروگرام کے مطابق میں اور عرفات فرنگون کے لئے روانہ ہوئے۔ میں نے امریتا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ میری واپسی تک وہ اندیشوں سے ہلکان ہوتی رہتی۔ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ ہم سفر کے ڈپلی کیٹ کاغذات بنوانے کے لئے کسی ٹریول ایجنٹ سے ملنے گئے ہیں۔ اس ایجنٹ کے ذریعے ہم انڈین ایمبیسی سے رابطہ کریں گے۔

یہ شام کا وقت تھا۔ شہر کی سڑکوں پر گہما گہمی تھی۔ پہلے ہم بذریعہ بس چائنہ چوک پہنچے۔ وہاں سے قریباً دو کلومیٹر کا پیدل سفر کر کے رائل پیلس آئے۔ رائل پیلس سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم بگیز اور فرنگون کے درمیان اتر گئے۔ یہ فرنگون روڈ تھی۔ یہاں ملائیشین ٹیکسی ڈرائیور سے تھوڑی سی تلخ کلامی بھی ہوئی۔ کیونکہ وہ کرائے میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ شام کے سائے تاریکی میں بدل رہے تھے۔ تاہم تاریکی کا چہرہ نظر آنے سے پہلے ہی سیکڑوں سٹریٹ لائٹس قطار اندر قطار جگمگا اٹھیں۔ چند ہندوستانی سیاح ایک بہت بڑے مجسمے کی ٹانگوں میں گھس کر تصویریں اتروا رہے تھے۔ مجسمے کا ایک بازو ندارد تھا اور لگتا تھا کہ وہ سرِ راہ کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔

جوں جوں ہم فرنگون کی طرف بڑھ رہے تھے سنگاپور کی چمک دمک ماند پڑ رہی تھی۔ یہاں عمارتیں بھی زیادہ بلند نہیں تھیں۔ ہر رنگ و نسل کے مرد و زن یہاں دکھائی دے رہے تھے۔

یہ گنجان علاقہ تھا۔ چھوٹی بڑی اشیاء کی مختلف دکانیں تھیں۔ ہمیں اپنی بائیں طرف چائنیز مارکیٹ نظر آئی۔ یہاں ہر قسم و سائز کے مجسمے، مورتیاں اور کھلونے وغیرہ

برائے فروخت موجود تھے۔ ہمارے اردگرد زیادہ تر انڈین، بنگلہ دیشی اور سری لنکن دکھائی دیئے۔ پختہ رنگوں والے ہندو تھے۔ جنہوں نے اپنی سیاہ پیشانیوں پر قشقے کھینچ رکھے تھے۔ بنگلہ دیش اور مدراسی وغیرہ اپنے تیز تیز لہجوں میں بولتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر کھلے عام شراب پی جا رہی تھی اور گالی گلوچ ہو رہی تھی۔

تھوڑے فاصلے پر سڑک دائیں طرف مڑتی نظر آئی۔ یہاں ایک بہت بڑا تکہ ہاؤس تھا۔ ہم تکہ ہاؤس پر پہنچے تو عرفات نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ دیکھو لگتا ہے کسی پاکستانی کی دکان ہے۔“

میں نے بھی اس طرف نظر دوڑائی۔ بورڈ پر۔ ”لاہور ساڑھی ہاؤس“ کے الفاظ نظر آئے۔

ہم دکان پر پہنچے۔ درمیانی عمر کے چھوٹی چھوٹی داڑھی والے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پتلون قمیص کے ساتھ گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ خوش اخلاقی سے ملے۔ ان کا نام صابر سعید معلوم ہوا۔ وہ کینال پارک لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے دو بیٹے فیصل سعید اور عمر سعید یہاں سنگاپور میں جاب کرتے تھے۔ صابر صاحب کوئی تین سال پہلے ان سے ملنے یہاں آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اب وہ یہاں کپڑے کا کام کرتے تھے۔

عرفات نے کہا۔ ”صابر صاحب! ہمیں یہاں ایک انڈین خاتون گرماتا جی سے ملنا ہے۔ وہ ہوٹل چلاتی ہیں۔ غالباً تاج ہوٹل نام ہے۔“

”بالکل تاج ہوٹل ہے یہاں، اور گرماتا ہی چلاتی ہے۔ لیکن تم کیوں ملنا چاہتے ہو اس سے؟“ صابر صاحب نے ہمیں سرتاپا گھورا۔

”بس ایک ضروری کام ہے۔“

”ظاہر ہے بھئی! کوئی ضروری کام ہی ہوگا۔ ورنہ گرماتا ایسی ہستی تو نہیں کہ اسے شوقیہ ملا جا سکے۔“

”ہمیں ایک دوست نے ان کی طرف ”ریفر“ کیا ہے۔“ ”ہم تو انہیں ٹھیک

سے جانتے نہیں۔"

"بیٹھ جاؤ یار!" صابر سعید صاحب نے بید کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ان کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ ہم بیٹھ گئے۔ "کیا پیو گے۔ ٹھنڈا یا گرم؟" انہوں نے خالص پاکستانی لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ کوئی ایسی ضرورت نہیں۔"

انہوں نے زبردستی چائے منگوائی اور ہم سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ان کا کالا بھجنگ سیل مین دو بھارتی خواتین سے بھاؤ تاؤ کر رہا تھا۔

صابر سعید صاحب پوچھنا چاہتے تھے کہ ہم دونوں اپنی شکل وصورت سے شریف النفس' بھلے مانس نظر آنے کے باوجود گرماتا جیسی گندی عورت سے کیوں ملنا چاہ رہے ہیں۔"

پتہ نہیں' صابر صاحب کے لہجے میں کیا اپنائیت اور محبت نظر آئی کہ ہم انہیں ڈھکے چھپے انداز میں' تھوڑا بہت بتانے پر آمادہ ہو گئے۔ عرفات نے کہا۔"صابر صاحب ہمارا ایک بھارتی دوست شاہد یہاں سیر کے لئے آیا۔ کسی بات پر اس کا کچھ مقامی غنڈوں سے جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں ان لوگوں نے اس کا پاسپورٹ وغیرہ چھین لیا۔ شاہد بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ وہ اب پولیس وغیرہ کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بس یہاں سے واپس چلے جانا چاہتا ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ وہ غنڈے گرماتا کے کہنے سننے میں ہیں اور اگر گرماتا چاہے تو ان سے پاسپورٹ وغیرہ واپس دِلا سکتی ہے۔"

عرفات کی پوری بات سننے کے بعد صابر صاحب بولے۔"یار! تم لوگ اتنے لمبے چکر میں کیوں پڑ رہے ہو۔ انڈین ایمبیسی جاؤ اور ڈپلی کیٹ پاسپورٹ بنوا لو۔ پچھلے سال میرے بیٹے فیصل کا پاسپورٹ گم ہو گیا تھا۔ ایمبیسی والوں نے چھ سات دن میں دوسرا بنا دیا تھا۔"

"ہم نے اس پہلو پر بھی سوچا ہے سر! لیکن یہاں ایک مسئلہ ہے۔ وہ غنڈے بھی جانتے ہیں کہ شاہد متبادل پاسپورٹ کے لئے سفارت خانے سے رجوع کرے گا۔

آج کل ان کا کوئی نہ کوئی بندہ ہر وقت سفارت خانے کے آس پاس موجود رہتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اِس مرتبہ شاہد ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اسے بہت نقصان پہنچائیں گے۔" (اور یہ بات حقیقت بھی تھی۔ راکیش پانڈے' امریتا کو دیوانوں کی طرح تلاش کر رہا تھا۔ کرنیل سنگھ نے بتایا تھا کہ انڈین سفارت خانے کے اندر بھی راکیش کے کئی دوست موجود ہیں۔ امریتا کو یا ہمیں غلطی سے بھی سفارت خانے کا رخ نہیں کرنا چاہئے۔)

یہ جاننے کے بعد کہ ہم گرماتا سے ہر صورت ملیں گے' صابر صاحب نے ہمیں چند Tips دیئے۔ انہوں نے بتایا کہ گرماتا رات نو بجے کے بعد اکثر نشے میں ہوتی ہے۔ اگر ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں تو نو بجے سے پہلے مل لیں۔ ہم اپنے دوست کی والدہ' بہن یا بیوی وغیرہ کا ذکر کریں اور گرماتا کو بتائیں کہ وہ بے چاری اس کے لئے انڈیا میں بے حد پریشان ہے۔ عورتوں کے مسائل وہ ہمدردی سے سنتی ہے اور اکثر ان پر پسیج بھی جاتی ہے۔ اسے اپنے کام کے لئے خود رقم کی آفر نہ کریں لیکن اگر وہ رقم وغیرہ مانگے تو فوراً Agree کر لیں اور بھاؤ تاؤ کی غلطی نہ کریں۔

صابر صاحب سے اہم مشورہ جات حاصل کرنے کے بعد ہم گرماتا کے تاج ہوٹل پہنچ گئے۔

یہ ہوٹل باہر سے تو معمولی نظر آیا' دیواروں سے رنگ اترا ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے کچھ شیشے ٹوٹے ہوئے تھے لیکن اندر قدرے سجاوٹ نظر آئی۔ ڈانس فلور' ڈائننگ ہال اور لابی وغیرہ صاف ستھرے تھے۔ میں اور عرفات دھڑکتے دل کے ساتھ ایک آفس نما کمرے کے سامنے پہنچے۔ ایک ہٹا کٹا ملائی سامنے آیا۔ اس نے مقامی زبان میں عرفات سے کچھ پوچھا۔ عرفات نے تفصیل سے جواب دیا۔ وہ شخص پہلے تو ہمیں سر تا پا گھورتا رہا پھر ساتھ لے کر اندر ایک کشادہ کمرے میں چلا آیا۔ باقی ہوٹل کی طرح یہ کمرا بھی نیم تاریک تھا۔ فرش پر ایک بوسیدہ قالین بچھا تھا۔ ایک آٹھ فٹ لمبی اور قریباً چار فٹ چوڑی میز کے پیچھے ایک موٹی تازی عورت بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ گندی لیکن ہونٹ سیاہ تھے۔ آنکھوں کے گرد بھی سیاہ حلقے تھے جو اس کی تمباکو نوشی اور مے نوشی کو ظاہر کرتے

تھے۔ وہ پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ بال کھینچ کر ایک چھوٹی سی چوٹی کی شکل میں باندھے گئے تھے۔ وہ پان چبا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کرسیوں پر دو مقامی افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کسی کم یاب نسل کا چھوٹا سا کتا تھا۔ وہ تینوں دلچسپی سے اس "Pupy" کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ کتا گاہے بگاہے ایک باریک آواز نکال کر اس معائنے پر اپنا احتجاج نوٹ کراتا تھا۔ عورت ہندوستانی تھی لیکن دونوں مقامی افراد کی طرح وہ بھی ملائی میں بات کر رہی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ زور سے ہنستی تھی اور مردانہ انداز میں کسی ایک مرد کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی تھی۔ ہم کمرے کے ایک گوشے میں صوفے پر بیٹھ گئے اور اسے دیکھتے رہے۔

یہی گرماتا تھی۔ حلیئے کے اعتبار سے تو گرماتا کا تصور ہمارے ذہنوں میں قریباً یہی تھا۔ لیکن ہمارا خیال تھا کہ وہ ہمیں بے حد سنجیدہ اور غصیلے روپ میں نظر آئے گی۔ یہ خیال وقتی طور پر غلط ثابت ہوا تھا۔ چار پانچ منٹ کی گفتگو کے بعد گرماتا نے کتا دونوں افراد سے لے لیا اور اپنے نوکر کے حوالے کر دیا۔ دونوں افراد نے خوشامدی انداز میں گرماتا کا شکریہ ادا کیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہ کتا تحفے کے طور پر گرماتا کے لئے لائے تھے۔

دونوں افراد رخصت ہو کر چلے گئے تو گرماتا ہماری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے چہرے کی بشاشت ایکدم ہی گہری سنجیدگی میں ڈھل گئی تھی۔ تیوری چڑھی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے ہٹے کٹے ملازم کی طرف دیکھا۔ ملازم نے ادب سے جھک کر گرماتا سے چند سرگوشیاں کیں...... اور پھر باہر چلا گیا۔

آفس نما کمرے میں گرماتا اور ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ گرماتا کے عقب میں دیوار پر کچھ سیکسی پینٹنگز لگی تھیں اور دیوار گیر الماری میں شراب کی بہت سی بوتلیں اور گلاس وغیرہ سجے تھے۔ گرماتا بولی تو اس کے پان سے رنگین دانت خاصے بدصورت نظر آئے۔ ''ہاں بھئی! کس لڑکی کے سلسلے میں آئے ہو تم لوگ؟''

عرفات نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس کی گرل فرینڈ ہے جی۔ دونوں بہت عرصے سے ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ لیکن درمیان میں ایک

ایسا شخص آ گیا ہے جس نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ وہ لڑکی یہاں آ کر سخت مصیبت میں پڑ گئی ہے جی۔''

''پہیلیاں نہ بوجھواؤ۔ سیدھی بات کرو۔ کیا نام ہے لڑکی کا۔''

''امریتا...... جی...... امریتا کور۔''

''کہاں کی رہنے والی ہے؟''

''جالندھر کی۔''

''اور یہ چھوکرا؟'' گرماتا کا اشارہ میری طرف تھا۔

''یہ پاکستان کا ہے جی۔ لاہور میں رہتا ہے۔''

گرماتا نے تیز نظروں سے میری طرف دیکھا تو جھرجھری سی آ گئی۔ وہ اپنی بھاری کرخت آواز میں بولی۔ ''تم لاہور میں رہتے ہو لڑکی جالندھرن ہے۔ تم دونوں کا معاملہ کیسے پٹا؟''

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر عرفات کی طرف دیکھا۔ اس کی لق و دق پیشانی پسینے سے چمک رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ میں سب کچھ گرماتا کے گوش گزار کر دوں۔ کرنیل سنگھ نے ہمیں یہی تاکید کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ہم گرماتا کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کچھ بھی چھپائیں نہیں۔ بعد میں کچھ غلط ثابت ہو گیا تو وہ بڑی ایکدم آگ بگولا ہو جائے گی۔ اور اگر وہ آگ بگولا ہوئی تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ کرنیل سنگھ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے پانچ دس منٹ میں اپنے اور امریتا کے بارے میں گرماتا کو بھی کچھ کچھ اختصار سے بتا دیا۔ پہلے قلمی رابطے سے لے کر آج کے دن تک تقریباً سبھی واقعات گرماتا کے گوش گزار کر دیئے۔ ارباز کے کردار کو بھی میں نے مختصراً اس روداد میں سمو دیا تھا۔ موجودہ حالات میں اس کردار کو چھپانے یا ظاہر کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔

جب میری بیان کی ہوئی روداد میں راکیش پانڈے کا ذکر آیا تو گرماتا کی دلچسپی نمایاں طور پر بڑھ گئی۔ اس نے میری روداد کو دو تین منٹ کے لئے روک کر راکیش کے حوالے سے چند سوالات بھی کئے۔ کرنیل سنگھ کی کہی ہوئی یہ بات بالکل

درست ثابت ہو رہی تھی کہ راکیش کی وجہ سے گرماتا ہمارے معاملے میں دلچسپی لے گی۔
کرنیل کے مطابق راکیش سے گرماتا کی خار بازی بہت پرانی تھی اور وہ اسے زک پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ راکیش بوجوہ گرماتا سے دبتا تھا اور بسا اوقات گرماتا کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

میری روداد آخری مراحل میں تھی جب ایک نوعمر لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق بارہ تیرہ سال رہی ہوگی۔ اس نے نہایت چست پتلون اور باریک سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال ترشے ہوئے تھے۔ اس کا جسم جیسے شباب کی دہلیز پر تھا۔ کچھ دیر پہلے ہم نے جو اسمارٹ سا کتا دیکھا تھا وہ اب لڑکی کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ وہ اس کتے سمیت سیدھی گرماتا کی گود میں جا بیٹھی۔

''کتنا سندر پپی ہے ممی۔ بالکل روئی کے گالے جیسا۔'' وہ ہندی میں بولی۔

گرماتا نے لڑکی کا سر چوم کر اسے گود سے اٹھایا اور کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اب یہ تمہارا ہے۔ دوست بناؤ اسے۔''

''دوست تو یہ بن گیا ہے۔ ایک دم بن گیا ہے۔'' وہ کرسی پر نیم دراز ہو کر اسے اپنے گلے سے چمٹاتے ہوئے بولی۔

کتا بڑی شتابی سے اس کے گال چاٹنے لگا۔ وہ ہماری موجودگی کی پرواہ کئے بغیر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔

''اچھا چلو جاؤ۔ باہر لے جاؤ اسے۔ میں بات کر رہی ہوں۔'' گرماتا نے سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا ماما! جاتی ہوں۔'' وہ ٹھنکی۔

اسی دوران میں باہر سے کسی عورت نے آواز دی۔ ''ٹینا...... ٹینا...... کہاں ہو؟'' لڑکی نے ہم دونوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور کتے سمیت باہر بھاگ گئی۔

عرفات کے اشارے پر میں نے اپنی روداد کا آخری مرحلہ مکمل کیا اور گرماتا کو بتایا کہ کس طرح چند دن پہلے امریتا نے راکیش کو فون پر اپنے کسی دوست سے دلالوں کے انداز میں فحش گفتگو کرتے سنا اور کیسے وہ مکمل طور پر اس سے بدظن ہوئی۔ ہوٹل اسٹار لائٹ سے

اپنے اور امریتا کے فرار کا سارا واقعہ میں نے گرماتا کو بتایا اور یہ بھی بتایا کہ آج کل ہم کہاں روپوش ہیں۔ اس حوالے سے کرنیل سنگھ کا ضمنی تذکرہ بھی ہوا۔

میری کتھا ختم ہوئی تو گرماتا نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''یہ راکھشس (راکیش) اور جان ینگ دونوں ایک جیسے حرامی ہیں۔'' اس کے بعد اس نے دونوں کو ایک ایک زبردست قسم کی مردانہ گالی دی اور نیا پان منہ میں ٹھونس لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی اس کے قریب ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ چند باتیں کرنے کے بعد اس کا پارہ ایکدم چڑھ گیا۔ وہ ملائی میں بول رہی تھی۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے' تاہم ہونٹوں کی حرکات اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ مخاطب کی ماں بہن ایک کر رہی ہے۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں اور پان کی سرخ پیک' خون کی طرح ایک باچھ سے بہنے لگی۔ اس کا یہ روپ واقعی دل دہلا دینے والا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور اگالدان میں یوں تھوکا جیسے اپنے مخاطب کے منہ پر تھوک رہی ہو۔

کچھ دیر تک وہ منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی پھر ہماری طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہاری بات سن لی ہے میں نے۔ اب کیا چاہتے ہو تم۔'' اب اس کا لہجہ کچھ اکھڑا اکھڑا تھا۔

عرفات نے تھوک نگل کر کہا۔ ''ہم بڑی آس لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ امریتا کی جان یہاں خطرے میں ہے جی۔ اگر آپ کچھ مہربانی کریں تو وہ واپس انڈیا جا سکتی ہے۔''

''میں کیا کروں؟''

''آپ امریتا کا پاسپورٹ' راکیش سے واپس لینے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔''

''اچھا تمہیں میرے پاس بھیجا کس نے ہے؟'' وہ بدستور اکھڑے لہجے میں بولی۔

''کرنیل سنگھ نے جی۔ وہ یہاں فاسٹ اخبار میں کام کرتا ہے۔ آپ کے

حوالے سے اس نے ہمیں بڑی امید......"

"وہ سور کا بچہ جو بھی ہے' خود میرے پاس کیوں نہیں آیا۔" گرماتا نے تیزی سے عرفات کی بات کاٹی۔ "میں نے کیا اس کی بہن اٹھوا لینی تھی؟"

گرماتا کے ہیجانی لہجے نے ہم دونوں کو لرزا کر رکھ دیا۔ "وہ جی دراصل......"

"دراصل کیا......تم لوگوں نے سمجھ کیا رکھ ہے مجھے؟ جس کی دم پر راکیش کا پاؤں آتا ہے وہ میرے پاس بھاگا چلا آتا ہے۔ میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے اس حرامی کے کرتوتوں کا۔ بھاڑ میں جائے وہ سور اور بھاڑ میں جاؤ تم۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ چلو جاؤ کام کرو اپنا۔ چلو جاؤ۔" اس نے آخری الفاظ بڑے تحکم سے کہے اور اس کے ساتھ ہی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

اس شعلہ صفت عورت کے انداز نے ہم دونوں کو ہی سہا دیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ میں نے ذرا ہمت پکڑ کے کہا۔ "گرماتا جی' ہماری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی۔ معافی چاہتے ہیں۔ شاید ہم غلط وقت پر آ گئے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں گی تو پھر کبھی حاضر ہو جائیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے عرفات کو ٹہوکا دیا۔ ہم باہر نکل آئے۔ گرماتا کی مدھم بڑبڑاہٹ میرے کانوں میں پڑی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور......تقریباً عرفات کی ٹانگوں کی کیفیت بھی مختلف نہیں تھی۔ آفس نما کمرے سے نکلے تو سامنے ڈانس فلور پر تین لڑکیاں بہت مختصر لباس پہنے رقص کی مشق کر رہی تھیں۔ ٹینا نامی لڑکی جو کچھ دیر پہلے گرماتا کی گود میں بیٹھی تھی' دیوار سے ٹیک لگائے گٹار بجا رہی تھی۔ پپی اس کے اردگرد گھوم رہا تھا۔ ہم بیرونی دروازے سے نکل کر پانچ دس قدم ہی چلے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا یہ وہی تنومند ملازم تھا جس نے شروع میں ہمارا استقبال کیا تھا......اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "میڈم آپ کو بلا رہی ہیں۔"

ہم ٹھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پتہ نہیں کہ اب میڈم کے کون سے موڈ کا سامنا ہونا تھا۔ عرفات نے اثباتی انداز میں سر کو جنبش دی اور ہم دونوں ڈرے ڈرے سے واپس گرماتا کے کمرے میں پہنچ گئے۔ گرماتا نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے تو وہ اپنی مخصوص بھاری بھرکم آواز میں بولی۔ "دیکھو' تم شکلوں سے سمجھ دار لگتے ہو۔ اس طرح بغیر ریفرنس کے میں کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ جس اخبار والے نے تمہیں میرے بارے میں جانکاری دی ہے اسے اگلی دفعہ ساتھ لے کر آنا......اور دوسری بات یہ ہے کہ میں پھونک میں کچھ نہیں کرتی ہوں۔ اس میں روپڑا لگے گا۔"

"ک ک......کتنے روپے ہوں گے جی؟ م م......میرا مطلب ہے کتنی رقم؟" عرفات نے کہا۔

"اس کے بارے میں بھی بتا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے جی۔ جیسے آپ کہیں۔" پھر ذرا توقف سے بولا۔ "امریتا اور میرا یہ دوست اس وقت پردیسی اور بے سہارا ہیں جی۔ اگر آپ کے کارن ان کا کچھ بھلا ہو جائے تو یہ ساری عمر دعائیں دیں گے۔"

"ٹھیک ہے......ٹھیک ہے۔" اس نے قدرے بیزاری سے ہاتھ ہلایا۔ پھر بولی۔ "پرسوں آنا۔ شام سات بجے کے قریب۔ پھر بات کریں گے۔"



میں اور عرفات رات گیارہ بجے کے لگ بھگ کرنیل کے فلیٹ پر واپس پہنچے۔ کرنیل شہر گردی کے لئے نکلا ہوا تھا۔ امریتا ڈری' سہمی' فلیٹ کے سارے کھڑکیاں دروازے بند کئے بیٹھی تھی۔ میں واپس کمرے میں پہنچا تو وہ بے تابی سے میری طرف بڑھی اور کندھے کے قریب سے میرا بازو یوں پکڑ لیا جیسے میں ایک مدت بعد اس سے ملا ہوں۔ میں نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا تو وہ سسک کر میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ ایسے لمحوں میں وہ اپنے لمس کی ہیجان خیزی سے یکسر بے خبر رہتی تھی۔ ''کیوں چلے جاتے ہو اس طرح مجھے چھوڑ کر؟'' وہ ناک میں گنگنائی۔

''میں تمہارے لئے ہی تو گیا تھا۔''

''مجھے نہیں پتا۔ بس مجھ چھوڑ کر نہ جایا کرو۔ یا پھر اپنے ساتھ لے جایا کرو۔''

اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں گھسا دیا۔

اگلے قریباً ایک گھنٹے میں وہ ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوئی۔ میرے بازو پر اس کی گرفت بدستور قائم تھی اور وہ جیسے میرے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ ہم صوفے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ پہلے ہم ایک ٹریول ایجنٹ کے پاس گئے تھے۔ اس کے بعد سفارت خانے کے ایک افسر سے ملاقات ہوئی۔ امید ہے کہ چھ سات دن کے اندر کاغذات والا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ سفارت خانے کا رخ کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ کیونکہ وہاں راکیش پانڈے کے ہرکارے موجود ہیں اور وہ ہمیں دیکھتے ہی راکیش کی نمک حلالی کریں گے۔ ایسی اطلاعات سے امریتا مزید خوفزدہ ہو سکتی تھی۔

وہ بولی۔ ''وائی! تم باؤجی سے رابطہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

آٹھ دس دن تک ان کے پاس ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کل پھر فون کروں گا۔''

''ان کو راکیش کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دو۔ ان سے کہہ دو کہ انکل پرتاپ اور انکل راج کی طرف سے ہوشیار رہیں۔''

''ٹھیک ہے' میں کہہ دوں گا۔'' میں نے کہا۔

امریتا نے جو بات کہی تھی وہ میرے ذہن میں بھی تھی۔ اندیشہ تھا کہ امریتا کی گمشدگی کے بعد کہیں پرتاپ اور راج وغیرہ انڈیا میں امریتا کے باؤجی کو تنگ نہ کریں۔ بہرحال اپنا یہ اندیشہ ''بھی'' میں نے اپنے تک ہی رکھا۔

سامنے کیلنڈر آویزاں تھا۔ میرے کندھے سے لگے لگے امریتا نے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور بولی۔ ''آج نو تاریخ ہے نا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ ''اگر سات آٹھ دن میں کاغذ مل جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے زیادہ سے زیادہ 20 تاریخ تک میں انڈیا میں ہوں گی۔''

''انشاء اللہ۔''

''بائیس تاریخ کو باؤجی کی ساٹھویں سالگرہ ہے۔ میں اس دن ان کے ساتھ ہونا چاہتی ہوں۔''

''اگر تمہاری طلب سچی ہے اور تمہارے اندر ہمت ہے تو ایسا ضرور ہو گا۔''

وہ مندھی مندھی آنکھوں کے ساتھ کیلنڈر کو دیکھنے لگی۔ جیسے کیلنڈر کو نہیں ہندوستان اور جالندھر کو دیکھ رہی ہو۔ اپنے شہر کی گلیوں کو' اپنی سکھیوں کو' اپنے گھر کو اور باؤجی کو۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر کیک کاٹ رہی ہو۔

لیکن پھر ایکدم جیسے اس کے اندر کوئی شے بجھ گئی۔ اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ اس نے میرے کندھے سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ کھڑکی سے آنے والے ہوا کے جھونکے نے اس کے بالوں کی ایک دراز لٹ اڑا کر میری گود میں پھینک دی۔ ایک دم ہی اس کی آنکھوں سے وطن واپسی کی ساری خوشی اور چاہت معدوم ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''وائی! بیس تاریخ تک میں انڈیا چلی جاؤں گی......اور تم؟''

"میں پاکستان۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیوں؟" اس نے بے ساختہ کہا۔

"اس لئے کہ ہمیں اپنے اپنے ملک جانا ہے۔"

وہ سسک کر میرے گلے لگ گئی۔ اس کی بانہوں نے بڑے زور سے مجھے بھینچ لیا۔ کراہ کر بولی۔

"نہیں وای! مجھ سے دور نہ جانا۔ اب میں نہیں رہ سکتی۔"

اس کا لہجہ مصنوعی نہیں تھا۔ نہ ہی یہ عام لہجہ تھا۔ اس لہجے میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھنے والا منہ زور درد شامل تھا۔

میں خاموش رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ وہ دلفگار انداز میں ناک کے اندر بولی۔ "میں جانتی ہوں وای!..... میں تمہارے لائق نہیں ہوں لیکن میں اپنے من کا کیا کروں؟ یہ اب کسی صورت مانتا نہیں ہے۔ یہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ ہمیشہ، جیون کی آخری سانس تک۔ ضروری نہیں کہ مجھے اپنا جیون ساتھی ہی بناؤ۔ بس..... بس مجھے اپنے پاس رہنے دینا۔ اپنے قدموں کے قریب۔ ایک نوکرانی کی طرح۔ یا جس طرح بھی تم چاہو۔"

میں تڑپ اٹھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا میرے لئے وہ کیا مقام رکھتی ہے۔ وہ تو جسم و جان کی مالک بن چکی تھی۔ وہ تو زندگی اور امنگ کا دوسرا نام تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر خود سے جدا کیا۔ اس کی تربتر آنکھوں میں دیکھا۔ میرے لہجے میں خود بخود غصے کی لہر اُمڈ آئی۔

"امرت! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔ ایسی بات مت کرنا۔ تم میرے پیار کی توہین کر رہی ہو۔ میری توہین کر رہی ہو۔ کیا تمہارے نزدیک میں ایسا ہی کم ظرف ہوں۔"

"لیکن یہ تو حقیقت ہے نا وای کہ میری زندگی کو داغ لگ چکا ہے۔ میں اجڑ چکی ہوں۔ اور ایک بار نہیں دو بار۔ ایک بار جذباتی طور پر اور دوسری بار سچ مچ....."

"تمہاری زندگی کو داغ لگا ہے نہ تم اجڑی ہو۔ بس تمہارے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے۔ اس حادثے نے تمہارے جسم پر تو شاید کوئی داغ چھوڑا ہو لیکن تمہاری روح اور

دل و دماغ پر کوئی داغ نہیں ہے۔ میرے لئے..... میرے لئے تم بالکل اَن چھوئی ہو امریتا۔ اوس کی طرح صاف۔ لیکن جب تم ایسی بات کرتی ہو تو میں اپنی نظروں میں آپ گرنے لگتا ہوں۔ خود کو چھوٹا اور نیچ سمجھنے لگتا ہوں۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو امریتا۔"

وہ ہچکیوں سے رو دی۔ میرے ساتھ یوں پیوست ہوگئی کہ میرے جسم کا حصہ بن گئی۔ میں اس کی پیشانی، ناک اور ہونٹوں کا لمس اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنی ٹھوڑی اس کے سر کے ریشمی بالوں پر ٹکا دی۔

صبح میں نے اور عرفات نے کرنیل سنگھ کو ساری صورت حال بتائی۔ پہلے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتا رہا پھر اس بات پر آمادہ ہوگیا کہ وہ کل میرے ساتھ سرنگوں جائے گا اور گرماتا سے ملے گا۔

کرنیل سنگھ کا کچن واقعی دیکھنے لائق تھا۔ عرفات نے یہاں لکڑی کا بہت خوبصورت کام کرایا تھا۔ اس خوبصورت کچن میں خوبرو امریتا کو اپنے اور اپنے دوستوں کے لئے کھانا پکاتے ہوئے دیکھنا ایک خوش کن تجربہ تھا۔ میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ دوپٹہ کمر سے باندھ کر بالوں کو جوڑے کی شکل میں سمیٹتی تھی اور کام میں جت جاتی تھی۔ کھانا پکانے کے دوران میں بھی اس کی خواہش ہوتی تھی کہ میں اس کے آس پاس ہی رہوں۔ روٹی پکاتے پکاتے وہ روٹی توے پر ڈال کر میرے پاس آ جاتی اور کندھے سے لگ جاتی۔ پھر روٹی پلٹنے کے لئے اٹھتی اور دوبارہ میرے پاس آ بیٹھتی۔ ایک عجیب دلنواز شدت تھی اس کے رویے میں۔"

میں بے ساختہ سوچنے لگا۔ ارباز کو امریتا سے سب سے بڑی شکایت یہ رہی تھی کہ اس کے پیار میں شدت نہیں تھی۔ جب جالندھر میں شادی کے حوالے سے دو ٹوک فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو وہ نہ کر سکی۔ اس نے معمولی مزاحمت کے بعد حالات کے سامنے سر جھکا دیا۔ ارباز نے اس حوالے سے امریتا کو مصلحت پسند، کم کوش اور مفاد پرست جیسے خطابات دیئے تھے۔ لیکن آج مجھے جو امریتا نظر آ رہی تھی وہ جالندھر والی امریتا سے یکسر مختلف تھی۔ میں اپنے لئے اس کے بے پناہ جذبے کو محسوس کرتا اور دیکھتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ میرے لئے ہر حد تک جانے کو تیار ہے۔ آنکھیں بند کر کے ہر

طوفان سے ٹکرا سکتی ہے۔ اس کے دیوانے جذبے نے جیسے چند ہی دن میں مجھے بھی دیوانہ کر ڈالا تھا۔

یہ سب کیا تھا...... کب شروع ہوا تھا...... کیسے پروان چڑھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ایک سوال ذہن میں اٹھتا تھا۔ امریتا کا یہ والہانہ پن ارباز کی دفعہ کہاں تھا؟ اس سوال کا جواب شاید یہ تھا کہ تب یہ والہانہ پن امریتا کے اندر سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے کہ ارباز خود بھی اس والہانہ پن سے محروم تھا۔ ارباز کی محبت سطحی تھی۔ اس کو جواب بھی سطحی طریقے سے ملا تھا۔ میرے جذبے عمیق اور منہ زور تھے۔ مجھے ''جواب میں بھی'' منہ زور جذبوں سے سابقہ پڑ رہا تھا۔

اگلے روز شام سات بجے کے لگ بھگ میں اور عرفات' کرنیل سنگھ کے ساتھ ایک بار پھر گرماتا کے پاس پہنچے۔ ہمارے پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں قمار خانے میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ گرماتا برہم موڈ میں لگتی تھی۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ آج واپس چلے جائیں۔ لیکن کرنیل کے لئے دوبارہ وقت نکالنا دشوار تھا۔ ہم کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے پھر کرنیل کے دل میں نجانے کیا آئی کہ وہ گرماتا سے ملنے کے لئے اکیلا ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' عرفات نے پوچھا۔

''تیری پھوپھو سے ملنے۔'' اس نے کہا اور بغیر کچھ مزید کہے سنے گرماتا کے آفس کی طرف چلا گیا۔ ہم وہیں ڈائننگ ہال میں بیٹھے رہے۔

''کہیں کوئی پھڈا نہ ہو جائے۔'' میں نے عرفات سے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں ہو گا۔ دیکھنے میں یہ کرنیلا چغد نظر آتا ہے لیکن اس کے پیٹ میں داڑھی ہے۔ بڑی جہاندیدہ قسم کی شے ہے۔ دیکھنا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لے گا۔''

ہم وہیں بیٹھ کر اپنے دل کی دھڑکنیں گنتے رہے۔ سامنے سرنگون کی سڑک کا فٹ پاتھ نظر آ رہا تھا۔ سرِ راہ ایک چبوترے پر کچھ اوباش بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سے دو نے گود میں لڑکیاں بٹھا رکھی تھیں۔ شراب خانہ خراب کے جام بھی حرکت میں تھے۔

''یار! اس جگہ کا ماحول خاصا خراب ہے۔ لگتا ہے کہ یہ علاقہ سنگاپور کا حصہ نہیں۔'' میں نے عرفات سے کہا۔

''ایک حد تک تمہاری بات ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔

''شاید تم نے دیکھا نہیں' جب ہم تکہ ہاؤس سے کالی کے مندر کی طرف مڑتے ہیں' سامنے ہی ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔ اس پر لکھا ہے یہاں سے سرنگون شروع ہوتا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کو فلاں فلاں آزادیاں حاصل ہیں۔ سنگاپور کے فلاں فلاں قانون یہاں بے اثر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہاں کے مکینوں کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ فلاں فلاں طریقے سے سنگاپور کے قوانین کا مذاق اڑا سکتے ہیں۔ ابھی تک تم نے یہاں کچھ دیکھا ہی نہیں۔ کسی دن اتوار کو یہاں آؤ۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ بے لگام آزادی کیا ہوتی ہے۔''

ایک مقامی لڑکی جو دعوت انگیز انداز میں اپنے جسم کو اچھال اچھال کر چل رہی تھی عرفات کو آنکھ مارتے ہوئے گزری۔ عرفات نے بھی جواب میں ''اخلاقاً'' آنکھ دبائی۔ لگتا تھا یہ ادب آداب اسے خوب آتے ہیں۔

کرنیل کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی۔ ہم اس کے انتظار کا وقت باتوں میں کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد کرنیل کی صورت نظر آئی تو ہماری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ تیزی سے ہمارے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سادہ کاغذ اور قلم تھا۔ مجھ سے بولا۔

''دامی بھائی! بھابو جی کے سارے کوائف لکھو اس کاغذ پر اور اپنے بھی۔''

''کچھ بات بنتی نظر آتی ہے؟'' عرفات نے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں۔''

میں نے ٹھیک ٹھیک کوائف لکھ دیئے۔ وہ کاغذ لے کر واپس چلا گیا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی پانچ دس منٹ بعد ہو گئی۔

''چلو آؤ چلیں۔'' وہ آتے ساتھ بولا۔

ہم تاج ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ جوا خانے' شراب خانے' ناچ گھر...... عیاشی کے اڈے' سب کے سب آباد ہو گئے تھے۔

گلیوں میں مے کش لڑکھڑاتے پھر رہے تھے۔ کہیں کسی جگہ غالباً ہوائی فائرنگ ہو رہی تھی۔ چائنیز مارکیٹ کے پاس سے ہم نے ٹیکسی لی اور فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور چینی تھا۔ ہم پنجابی میں بات کرنے لگے۔ ''ہاں' کیا تیر چلایا ہے؟'' عرفات نے کرنیل سے پوچھا۔

''وہ تیری پھوپھو نیم رضامند تو ہو گئی ہے۔اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''کیا کہتی ہے؟''

''کہتی ہے کہ چھوکری کے صرف کاغذ واپس لینے کا کام ہی نہیں ہے۔ اصل کام تو یہ ہے کہ اسے حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکالا جائے۔اور وہ ٹھیک کہتی ہے۔''

''پھر؟''

''اس کام کے لئے اس نے دس ہزار سنگاپوری ڈالر مانگا ہے۔''

''دس ہزار؟ یار اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں گے ہم؟'' عرفات نے حیرت سے کہا۔

''یہی میں نے کہا ہے تمہاری پھوپھو سے۔ وہ لالچو کچھ نرم تو پڑی ہے۔ شاید رعایت دینے پر آمادہ ہو جائے۔ مگر ابھی وشواس سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

''کیا کہتی ہے۔ راکیش سے کاغذ واپس لے گی یا ڈپلی کیٹ بنوائے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا آئیڈیا ہے کہ راکیش سے ہی واپس لے گی۔ وہ راکیش کو دبا سکتی ہے۔ مجھے پتہ ہے اس کا۔''

''ٹائم کتنا لگے گا؟'' عرفات نے پوچھا۔

''ٹائم کے بارے میں نہیں بتاتی۔ کہتی ہے جیسے ہی راکھشس (راکیش) سے ملاقات ہوئی کوئی حل نکال لے گی۔''

''اور اگر دو مہینے ملاقات نہ ہو تو ہم تیرے فلیٹ میں دبک کر بیٹھے رہیں گے۔''

''تو بیٹھے رہنا۔ میں کرایہ تو نہیں مانگ رہا تم سے۔''

''لیکن یار! کوئی ٹائم فریم؟''

''ٹائم فریم جا کر پوچھ اپنی پھوپھو سے۔ اور دو چار نئے فیشن کی گالیاں بھی سن لے۔'' کرنیل نے جل کر کہا۔

بہرحال کرنیل سنگھ کی باتوں سے امید کی کرن تو روشن ہوئی تھی۔ میرے پوچھنے پر کرنیل نے بتایا کہ گرماتا نے اس کا فون نمبر لے لیا ہے اور کہا ہے کہ ایک دو دن تک وہ خود ہی رابطہ کرے گی۔

فلیٹ واپس پہنچے تو ایک بنگلہ دیشی عورت درمیانے سائز کا شاپر اٹھائے فلیٹ میں سے نکل رہی تھی۔ امریتا دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ کرنیل نے بنگلہ دیشی عورت کو روک کر پوچھا۔

''کیا ہے یہ؟''

''غریب تھی۔ میں نے اپنے کچھ کپڑے دیئے ہیں۔''

میں اور امریتا کمرے میں چلے آئے۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بڑی بے قراری سے میرا انتظار کرتی رہی ہے۔ میں تھکا تھکا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔

''سافٹ ڈرنک لو گے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ڈرنک لینے کچن کی طرف چلی گئی۔ میری نگاہ بستر کے تکیے کی طرف گئی۔ سفید تکیے کے نیچے سے دو کارڈ سائز تصویروں کے کونے جھانک رہے تھے۔ میں نے تکیہ اٹھایا۔ تکیے کے نیچے آٹھ دس تصویریں تھیں۔ یہ سب کی سب امریتا کی تھیں۔ صرف دو تصویروں میں امریتا کے ساتھ راکیش بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دو تصویریں غالباً کیمرے کو آٹو پر سیٹ کر کے اتاری گئی تھیں۔ ایک میں راکیش امریتا کے کندھے پر بازو رکھے کھڑا تھا۔ دوسری میں اس نے امریتا کو عقب سے بانہوں میں لیا ہوا تھا۔ امریتا کے بال راکیش کے شانے پر بکھرے تھے۔ یہ ساری تصویریں بڑے جدید کیمرے سے اتاری گئی تھیں۔ فوکس اور روشنی وغیرہ کا بھی پورا خیال رکھا گیا تھا۔ امریتا کی تین چار تصویریں تو بہت زبردست آئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کسی ماڈل کی تصویریں ہوں۔ ان تصویروں میں امریتا کے بے مثال بالوں کو خاص طور سے Caputre کیا گیا تھا۔

اچانک امریتا کمرے میں داخل ہوئی۔ میرے ہاتھ میں تصویریں دیکھ کر وہ

بری طرح چونکی۔شاید وہ انہیں مجھ سے چھپانا چاہتی تھی۔

کوک کی بوتل میرے سامنے رکھتے ہوئے اس نے تصویریں مجھ سے لے لیں۔

''یہ کب کی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سنگاپور آنے کے بعد سکائی ویو میں اتاری تھیں اس نے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔اس کے ساتھ ہی اس نے تین چار تصویروں کو اوپر نیچے رکھا اور درمیان سے دو کر دیا۔میرے روکتے روکتے اس نے باقی تصویروں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔

''کیا کر رہی ہو امرت! اتنی اچھی تصویریں ہیں۔''

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ساری تصویروں کے پرزے پرزے کر دیئے۔

''میں اب بیتے دنوں کو بالکل بھلا دینا چاہتی ہوں۔ان دنوں کی کوئی نشانی رکھنا نہیں چاہتی۔'' وہ بڑے کرب سے بولی۔

''اس بنگلہ دیشی عورت کو کیا دیا تم نے۔''

''شادی والے کپڑے تھے' جوتے تھے' میک اپ کا تھوڑا سا سامان تھا۔جھمکے تھے' سب دے دیا ہے۔ان تصویروں کو بھی جلانے لگی تھی' اتنے میں تم آ گئے۔''

وہ تصویروں کے پرزے اکٹھے کر کے کچن میں لے گئی۔میں اسے عقب سے دیکھ رہا تھا۔اس کے کان خالی تھے۔وہ خاصے قیمتی جھمکے تھے۔ڈیڑھ دو تولے سونا تو لگا ہو گا۔بڑی عجیب لڑکی تھی یہ۔میں حیرت زدہ بیٹھا رہا۔

اتنے میں عرفات نے دروازے پر مدھم دستک دی۔''آ جاؤ'' میں نے کہا۔

وہ شام کا انگلش اخبار لئے کمرے میں داخل ہوا۔''یہ دیکھو خبر! راکیش اور جان ینگ میں میچ پڑا ہوا ہے۔'' عرفات نے ایک جگہ انگلی رکھی۔

میں نے خبر پڑھی۔سرخی تھی۔''رائل پیلس میں دو ٹولیوں کے درمیان اسٹریٹ فائٹ۔تین افراد شدید زخمی۔دکانوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔''

متن میں لکھا تھا۔''آج سہ پہر اوڈی کسینو کے مالک جان ینگ اور اس کے ایک کاروباری حریف راکیش پانڈے کے کارندوں میں زوردار تصادم ہوا۔اس تصادم میں دونوں طرف سے ڈنڈے' بوتلیں اور آہنی راڈ وغیرہ استعمال کیے گئے۔اس تصادم

میں کم از کم سات افراد زخمی ہوئے جن میں سے تین شدید زخمی ہیں۔تصادم میں متعدد دکانوں کے شیشے اور ''ڈس پلے'' ٹوٹ گئے۔پولیس نے چھ افراد کیخلاف مقدمہ درج کر لیا ہے۔جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے' جان ینگ اور راکیش کی پارٹیوں میں کسی انڈین لڑکی کے لئے جھگڑا چل رہا ہے۔راکیش عرف راکیش پانڈے انڈین لڑکی کو اپنی بیوی بتاتا ہے اور جان ینگ پر اس کے اغواء کا الزام لگا رہا ہے۔''

عرفات بولا۔''خبر تشویش ناک تو ہے لیکن اس کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب تمہارے سامنے ہی ہے۔راکیش کا خیال ہے کہ ہوٹل اسٹار لائٹ سے امریتا کے غائب ہونے میں جان ینگ کا ہاتھ ہے۔''

''ہاں یہ بات تو یقیناً اس کے دماغ میں آئی ہو گی۔اسے معلوم ہے کہ براڈوے سے ہوٹل کے قریب میرے اور امریتا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

''لیکن میرے شہزادے' ایک بات سوچنے والی ہے۔اگر......''

''امریتا آ رہی ہے۔'' میں نے تیزی سے عرفات کی بات کاٹی اور اخبار ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔



اگلے پانچ چھ دن میں میں دو دفعہ گرماتا انڈین کی طرف گیا۔ ایک دفعہ کرنیل میرے ساتھ تھا' دوسری دفعہ عرفات' پہلی مرتبہ گرماتا وقت سے پہلے ہی شراب پی کر اتنا غفیل پڑی تھی اور اپنے ملازموں کو واہیات گالیاں دے رہی تھی۔ دوسری دفعہ وہ کہیں گئی ہوئی تھی۔ اس کی نوخیز بیٹی ہوٹل میں تتلی کی طرح منڈلاتی پھرتی تھی۔ اس نے نیکر اور ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس لڑکی کی اٹھان غضب کی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دو تین سال تک دیکھنے والوں پر تابڑ توڑ بجلیاں گرائے گی۔ جب ہم نے اسے دیکھا وہ ہوٹل کے ہی ایک ہال نما کمرے میں کراٹے کھیل رہی تھی۔ چھت سے سینڈ بیگ جھول رہا تھا اور وہ اسے ککیں رسید کر رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہم نے اسے ہوٹل کے ایک ادھیڑ عمر خانساماں پر پانی کی بالٹی گراتے اور بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ وہ یہاں کی ڈارلنگ تھی۔ ہر کوئی اس کے لاڈ دیکھتا تھا اور بے بی کہہ کر بلاتا تھا۔ (سرنگون آنے جانے کے دوران میں ایک دو دفعہ صابر سعید صاحب سے بھی ہیلو ہیلو ہوئی لیکن ہم ان کے پاس بیٹھ نہیں سکے۔)

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ اتوار کا دن تھا اور پندرہ تاریخ تھی۔ سہ پہر کے وقت کرنیل سنگھ کا فون اخبار کے دفتر سے آیا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

''دامی! گرماتا کی کال آئی ہے۔ اس نے آج شام چھ بجے کا ٹائم دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے' ہم تیار ہو جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی بس تھوڑا سا کام ختم کر کے پانچ بجے تک آ جاؤں گا۔''

گرماتا نے آخری ملاقات میں کرنیل سے کہا تھا کہ ہو سکے تو ہم امریتا کو بھی ساتھ لائیں۔ وہ امریتا کا مؤقف اس کی اپنی زبان سے سننا چاہتی تھی۔ کرنیل سنگھ کا

خیال تھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا کام جلد ہو جائے۔ مصیبت زدہ خواتین کے لئے گرماتا کا کٹھور دل اکثر پسیج جاتا ہے۔

پروگرام کے مطابق میں' امریتا' کرنیل اور عرفات پانچ بجے کے لگ بھگ فلیٹ سے نکلے۔ امریتا نے آج پوری آستین کی قمیص اور ٹرائزور پہن رکھا تھا۔ سر پر حسب سابق اس نے سکارف اوڑھ لیا تھا۔ وہ دیکھنے میں بالکل ملائیشین مسلم لگ رہی تھی۔ ہم نے فلیٹ کے دروازے سے ہی ٹیکسی لے لی۔ اس ٹیکسی نے ہمیں سرنگون میں تاج ہوٹل کے مین دروازے پر اتارنا تھا۔ امریتا بمشکل فلیٹ سے باہر نکلنے پر راضی ہوئی تھی۔ اسے راضی کرنے کے لئے میں نے یہ امید بھی دلائی تھی کہ واپسی پر ہم کسی کال آفس سے باؤجی کو فون بھی کریں گے۔

جس وقت پانچ بج کر پندرہ منٹ پر بڑے سائز کی لگژری ٹیکسی کار کرنیل سنگھ کے فلیٹ سے روانہ ہوئی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آج کی یہ شام میری زندگی کی ہنگامہ خیز شام ثابت ہو گی اور میرے دل و دماغ پر اس کے نقوش ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جائیں گے۔ کچھ بھی تو خاص نہیں تھا آج۔ وہی رواں دواں ٹریفک' وہی سیکڑوں فلک بوس عمارتوں کی ہزار ہا روشن کھڑکیاں اور ہر کھڑکی میں زندگی اپنے اپنے ڈھنگ سے حرکت کرتی ہوئی۔ فٹ پاتھوں پر سیاحوں کی ٹولیاں اور پارکوں میں رومانی جوڑوں کی چہل قدمیاں لیکن یہ شام ہمارے لئے کچھ ڈرامائی منظر لے کر آئی تھی اور ہم دھیرے دھیرے ان مناظر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

چھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب ہم سرنگون میں تاج ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے۔ آج اتوار کا دن تھا اور عرفات نے مجھے بتایا تھا کہ اتوار کے دن یہاں بے حد ہلا گلا ہوتا ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ سنگاپور میں موجود نچلے طبقے کے سارے آوارہ گرد اور اوباش یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں میں انڈین' بنگلہ دیشی' پاکستانی' نیپالی' کورین' غرض ہر رنگ نسل کے افراد شامل تھے۔ پیشہ ور عورتیں بے ہودہ لباس پہنے سر عام تھرکتی پھرتی تھیں۔ کہیں کہیں خوش فعلیاں جاری تھیں۔ مساج ہوم بھی آباد نظر آتے تھے۔ ہم ان مناظر سے نگاہ چراتے ہوئے تاج ہوٹل میں گھس گئے۔

کچھ دیر ہمیں گرماتا کے آفس سے باہر لابی یا ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑا۔ قریباً

پانچ منٹ بعد سیاہ فام آوارہ گردوں کی ایک ٹولی اپنے کسی کام سے فارغ ہو کر باہر نکلی اس کے چند منٹ بعد ہمیں بلاوا آ گیا۔ عرفات باہر ہی بیٹھا رہا۔ میں اور کرنیل سنگھ، امریتا کے ساتھ گرماتا کے آفس نما کمرے میں پہنچے۔ گرماتا حسب سابق اپنی طویل میز کے پیچھے بیٹھی تھی۔ ایک قبول صورت مدراسی لڑکی جس کے ہاتھ اور چہرے پر چوٹوں کے نیل تھے، سر جھکائے بید کی کرسی پر موجود تھی۔ اس کے پہلو میں ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ شکل سے لڑکی کا باپ یا بڑا بھائی دکھائی دیتا تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی کا باپ ہے۔ ہم نے سلام کیا اور ایک طرف رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔ گرماتا نے ہماری جانب دیکھا اور ادھیڑ عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''لو یہ ایک اور آ گئے ہیں تمہارے جیسے۔''

گرماتا ادھیڑ عمر شخص اور اس کی بیٹی پر برس رہی تھی۔ اس کی زبان بڑی بازاری تھی لیکن وہ جو بات کہہ رہی تھی وہ ہمیں اتنی بری نہیں لگی۔ وہ ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہو کر بولی۔

''آخر کیوں کرتے ہو تم لوگ ایسا؟ تمہارے سامنے لڑکیاں برباد ہوتی ہیں۔ ''سیکس گھروں'' میں پہنچتی ہیں۔ شرابیوں کے بچے جنتی ہیں، ماریں کھاتی ہیں، ایڈز سے مرتی ہیں۔ پھر بھی تمہاری عقل کام نہیں کرتی۔ کیوں نہیں کرتی؟''

''بب......بس، میڈم غلطی ہو گئی۔'' ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

''بس میڈم غلطی ہو گئی۔'' گرماتا نے بڑے قہر سے ادھیڑ عمر شخص کی نقل اتاری۔

''اوئے عقل کے اندھے! یہ کوئی معمولی غلطی ہے۔ تو نے اپنے ہاتھ سے اپنی بیٹی کی زندگی برباد کی۔ وہاں ہندوستان میں پاکستان اور بنگلہ دیش میں کیا نہیں ہے، جو یہاں ہے۔ جس کے لئے تم اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اجنبی چھوکروں کے ساتھ سمندر پار بھیج دیتے ہو۔ تم یہ نہیں سوچتے تمہاری بچیاں تمہاری آنکھوں سے دور پرائے دیس میں ہوں گی تو کچھ بھی ہو جائے گا ان کے ساتھ۔''

''میڈم! وہ بڑا چالباز تھا۔ اس نے ہماری مت مار کر رکھ دی تھی۔ بڑے بڑے لوگوں سے اپنی رشتے داری بتاتا تھا۔ اس نے کچھ سمجھ ہی نہیں آنے دی ہم پتی پتنی

کو۔ ہم سے جو کچھ ہوا اس پر بہت شرمندہ ہیں۔ آپ کی کرپا ہے کہ آپ نے ہماری مدد کی۔ جیسی بھی ٹوٹی پھوٹی بیٹی ہمیں ملی ہے، مل تو گئی ہے۔ ہم سارا جیون آپ کے احسان مند رہیں گے۔'' ادھیڑ عمر شخص نے گرماتا کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

گرماتا کا چڑھا ہوا پارہ قدرے نیچے اتر آیا۔ اس نے پان کی پیک اگالدان میں تھوک کر تازہ گلوری منہ میں رکھی۔ نیا سگریٹ سلگایا اور دو تین گہرے کش لے کر قدرے پرسکون ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے دکھ جھانکنے لگا۔ بولی ''بھگوان کا واسطہ ہے، جا کر کہو ہندوستانیوں سے۔ اچھے رشتوں کے لالچ میں اپنی بیٹیوں کو انجانے مردوں کے ساتھ انجانے دیشوں میں نہ بھیجیں۔ یہاں جو کچھ ان کے ساتھ ہوتا ہے وہ کہنے سننے کے لائق نہیں ہے۔ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں۔ اپنے ملک کی غریبی، تنگی ترشی، باہر کی عیش وعشرت سے بہت بھلی ہے۔ میں نے یہاں ان بدنصیب لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ ہوتے دیکھا ہے، تمہیں سناؤں تو تمہارے کلیجے پھٹ جائیں۔ تمہاری بیٹی کے ساتھ بہت کچھ ہوا ہے لیکن پھر بھی سمجھو کہ کچھ نہیں ہوا۔ اوپر والے کا شکر کرو یہ زندہ سلامت تمہیں مل گئی ہے۔ اب اسے لے کر نکل لو یہاں سے۔''

لڑکی اور اس کا باپ دونوں رو رہے تھے۔ لڑکی کے باپ نے میز کے پیچھے جا کر گرماتا کے پاؤں چھونے کی کوشش کی تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔ اس نے اپنے ایک کارندے کو اشارہ کیا اور وہ باپ بیٹی کو لے کر باہر چلا گیا۔

گرماتا نے کرنیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''صحافی صاحب! دیکھا تم نے۔ یہ دو چچا زاد بہنیں بنگلور سے بیاہ کر یہاں آئی تھیں۔ ایک کا پتی منشیات فروش نکلا۔ اس نے پتنی کے اٹیچی میں ہیروئن بھر کر یہاں سمگل کی۔ وہ بے چاری چانگی ایئرپورٹ پر پکڑی گئی۔ یہاں منشیات سمگل کرنے کی سزا موت ہے۔ اب وہ قسمت کی ماری جیل میں سڑ رہی ہے۔ اس دوسری کا نام نہاد پتی اسے ایک ملٹری آفیسر کے بیڈروم میں چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ یہ وہاں سے بھاگی اور غنڈوں کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ اسے دن رات ننگی فلمیں دکھاتے رہے۔ چھ ماہ تک یہ جگہ جگہ برباد ہوتی رہی۔ اس کا باپ اسے ڈھونڈنے نکلا۔ قسمت اچھی تھی کہ یہ زندہ اسے واپس مل گئی ہے۔''

گرماتا کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ اس کا یہ روپ ہمارے لئے بالکل

نیا تھا۔ ان لمحوں میں وہ سرنگون کی بدنام فاحشہ کی بجائے ایک دردمند سماجی کارکن نظر آئی۔ بڑا تضاد تھا اس کی شخصیت کے ان دو پہلوؤں میں۔

کچھ دیر بعد وہ امریتا کی طرف متوجہ ہوئی۔ امریتا اسکارف میں تھی اور نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ گرماتا نے کہا۔ ''تم ہو امریتا کور؟''

''جی۔'' امریتا نے کہا۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے' تم کتنی بڑی کٹھنائی (مصیبت) میں پھنسی ہوئی ہو؟''

''جج...... جی...... جی نہیں۔''

''راکھشس جسے تم لوگ راکیش کہتے ہو' ایک بھیڑیے جیسا ہے۔ چیر پھاڑ دیتا ہے تم جیسی چھوکریوں کو۔''

امریتا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

گرماتا نے میری اور کرنیل کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم دونوں تھوڑے سے کے لئے باہر جاؤ۔ میں اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

امریتا نے چپکے سے میرا بازو پکڑا جیسے مجھے اٹھنے سے روکنا چاہتی ہو۔ بہرحال میں اٹھ گیا' اور کرنیل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں اسے ہوائی فائرنگ ہی سمجھا لیکن پھر ہوٹل کے مین دروازے کی طرف سے چند چلاتی ہوئی آوازیں بلند ہوئیں۔ صرف دو سیکنڈ بعد تڑ تڑ کی خوفناک آواز سے رائفل کا برسٹ چلا اور مجھے محسوس ہوا کہ لابی کا دیوار گیر شیشہ چکنا چور ہو کر گر گیا ہے۔

''اوہ گاڈ! یہ کیا ہے۔'' کرنیل نے گھبرا کر کہا۔

میں نے عقب میں ایک ڈرامائی منظر دیکھا۔ تنومند گرماتا نے اپنی میز کی دراز سے ایک پسٹل نکالا۔ ساتھ میں گولیوں والی بیلٹ تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی عقبی دروازے کی طرف گئی۔ ساتھ ساتھ وہ چلاتی ہوئی آواز میں اپنے کارندوں کو ہدایات بھی دے رہی تھی۔ امریتا بھاگ کر میرے پاس آ گئی۔ چند سیکنڈ کے لئے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اتنے میں عرفات بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔

کرنیل نے ایک تنگ راہداری کی طرف اشارہ کیا۔ ہم کرنیل کے پیچھے اس راہداری میں گھس گئے۔ پورے ہوٹل میں بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ فائر بھی ہو رہے تھے۔ ہم جس راہداری میں گھسے تھے وہ ہمیں ہوٹل سے باہر نہیں لے گئی ایک مقفل دروازے کے سامنے ختم ہو گئی۔ یہ پریشان کن صورتحال تھی۔ ہمارے عقب میں فائر ہو رہے تھے۔ عرفات کی نگاہ ایک تنگ زینے پر پڑی۔ ہم نے یہ زینے طے کئے اور اوپر ایک ٹیرس نما جگہ پر آ گئے۔ کرنیل نے ہم سب کو ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑا کر دیا۔ فائرنگ اور ہڑبونگ کی آوازیں اب اس راہداری کے وسط سے آنے لگیں جہاں سے ہم نکل کر آ رہے تھے۔

آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گولی دو مقامات سے چل رہی ہے۔ یقیناً یہ فائرنگ کا تبادلہ تھا۔ فلموں ڈراموں میں گولی چلتے دیکھنا اور سننا اور بات ہے۔ لیکن جب آپ حقیقت میں کسی کھلی جگہ پر ہوں اور آپ کے اِردگرد نادیدہ ہاتھ ٹرائیگر دبا کر دھماکے کر رہے ہوں تو سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم ہر لحظہ اندھی موت کی زد میں ہیں۔ ایسی ڈرامائی صورتحال سے میرا پالا پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ امریتا میرے بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔ عرفات بھی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

''وہ دیکھو۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ نیچے ہوٹل کی بغلی راہداری میں تین افراد ایک لڑکی کو کھینچتے اور گھسیٹتے ہوئے پارکنگ کی طرف لے جا رہے تھے۔ لڑکی ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی اور بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ یہ دبلی پتلی لڑکی گرماتا کی بیٹی ٹیٹا تھی۔ اس کے چلانے کی باریک آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

پھر اچانک دائیں طرف سے تین چار افراد برآمد ہوئے اور لڑکی سے زبردستی کرنے والوں پر پل پڑے۔ خوفناک گھونسہ بازی کرتے یہ لوگ ہوٹل کے ریسپشن کی طرف ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

''ہائے ربا۔'' امریتا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

وہ چھوٹا سا Pupy جسے چند دن پہلے ہم نے ٹیٹا کی گود میں دیکھا تھا' امریتا کے پاؤں کے قریب سے نکلا اور خوفزدہ آوازیں نکالتا ایک تاریک گوشے میں اوجھل ہو گیا۔

اسی دوران میں ہماری نگاہ ہوٹل کی نچلی چھت پر گئی۔ ہوٹل کا ایک دہشت زدہ

ملازم چھت سے چھلانگ لگا کر کھڑکی کے شیڈ پر آیا اور نیچے کودا۔ اس کے عقب میں ایک اور شخص نے بھی یہی عمل کیا۔ اس دوسرے شخص کے ہاتھ میں غالباً کوئی تیز دھار آلہ بھی تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ شخص پہلے والے شخص کا پیچھا کر رہا ہے۔ پیچھا کرنے والے کی ''جھلک'' نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس گول مٹول چہرے والے شخص کو پہچانتا تھا۔ یہ ان دو افراد میں سے ایک تھا جنہوں نے ہوٹل براڈوے کے قریب مجھ سے مارا ماری کی تھی۔ یہی بندہ تھا جس نے پہلے میرے کندھے اور پھر چہرے پر چاقو کا وار کیا تھا۔ مجھے نوے فیصد یقین ہو گیا کہ یہ وہی بندہ ہے۔

میں نے کرنیل سنگھ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے' یہ جان ینگ کے بندے ہیں۔'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''کیا کسی کو دیکھا ہے تم نے۔'' کرنیل نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں ان میں سے ایک کو پہچانتا ہوں۔''

''یہ تو خطرناک سچویشن ہے۔'' کرنیل بڑبڑایا۔

نوخیز لڑکی پٹنا کی خوفزدہ چیخیں ایک بار پھر سنائی دینے لگی تھیں۔ اس امر میں شبے کی گنجائش کم ہی تھی کہ جان ینگ کے لوگ گرماتا کی بیٹی کو اٹھانے کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔ قریباً دو منٹ مزید اسی طرح گزر گئے۔ عمارت کے مختلف حصوں سے بھاگ دوڑ اور شور شرابے کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ لوگ دروازے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گاہے بگاہے فائر بھی ہو جاتا تھا۔ فائر کی آواز سننے کے بعد کرنیل بتاتا تھا کہ یہ رائفل کا ہے' یہ پسٹل کا یا فلاں چیز کا ہے۔ ہم دل ہی دل میں دعا گو تھے کہ کہیں سے پولیس آ جائے اور اس خطرناک صورت حال کا خاتمہ ہو۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا ہمارے لئے ازحد تشویش ناک تھا۔ اگر یہ لڑائی اس بالائی منزل تک پہنچ جاتی اور جان ینگ کے لوگ (اگر وہ واقعی جان ینگ کے تھے) ہمیں پہچان لیتے تو کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ امریتا ہمارے ساتھ تھی اور امریتا کو ڈھونڈنے کے لئے یہ لوگ دیوانوں کی طرح شہر کی گلیوں میں پھرتے رہے تھے۔

قریباً دو منٹ کے بعد یکایک صورت حال تبدیل ہو گئی۔ یہ بھی ایک ڈرامائی تبدیلی تھی۔ دو لگژری گاڑیاں بڑی تیزی سے ہوٹل کے فرنٹ پارکنگ لاٹ میں پہنچیں۔

ان میں سے ایک نیلی پجارو جیپ تھی۔ دوسری مٹیالے رنگ کی جیگوار تھی۔ گاڑیاں پوری طرح رکنے سے پہلے ہی ان میں سے کئی مسلح افراد چھلانگیں لگا کر اترے اور برق رفتاری سے ہوٹل کی اینٹرینس کی طرف لپک گئے۔ دونوں گاڑیوں کے سوا سب کچھ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ان نئے افراد کے آتے ہی ایکدم فائرنگ میں شدت آ گئی۔ مختلف اقسام کے ساعت شکن دھماکوں سے پوری عمارت لرز اٹھی۔ یہ خودکار رائفل' پسٹل اور ریوالور وغیرہ کے دھماکے تھے۔ ہمیں نیم تاریکی میں گاہے بگاہے شعلے لپکتے بھی دکھائی دیئے۔ بالکل یوں لگا کہ یہ تین منزلہ عمارت میدان کارزار بن گئی ہے۔ ہم پیچھے ہٹ کر مزید محفوظ جگہ پر چلے گئے۔ امریتا نے اتنی مضبوطی سے میرا بازو پکڑ رکھا تھا کہ انگلیاں گوشت میں پیوست ہو گئی تھیں۔ اس دوران میں ایک چھوٹی کار بڑی برق رفتاری سے پارکنگ میں سے نکلی اور لہراتی ہوئی سرنگون روڈ کی طرف اوجھل ہو گئی۔

اچانک امریتا کے ہونٹوں سے سہمی ہوئی چیخ نکل گئی۔ ہمارے عقب میں صرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور بہت سا غصیلا شور سنائی دیا۔ اب ہم سامنے کی طرف بھی نہیں نکل سکتے تھے کیونکہ وہاں فائرنگ ہو رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں' میں نے اپنی زندگی کا خوفناک ترین منظر دیکھا۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے کوئی نہایت بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تمتمائے ہوئے نہایت کرخت چہرے والے جان ینگ کو دیکھا۔ وہی جان ینگ جس کی کچھ جھلکیاں مجھے کیسل کلب کے ہال کمرے میں نظر آئی تھیں۔ جان ینگ کے ہاتھ میں لمبے بیرل والا سیاہ رنگ کا پسٹل تھا۔ اس کے ساتھ دو افراد مزید تھے۔ ایک کے پاس چھوٹی نال کی رائفل تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں ایک مضبوط لٹھ تھی۔

جان ینگ اور اس کے ساتھیوں نے ہم چاروں کو دیکھا۔ ایک شخص نے کرنیل سنگھ کو زوردار دھکے دیئے۔ دوسرا عرفات پر پل پڑا۔ اتنے میں ایک تیسرا شخص نمودار ہوا۔ یہ بھی شکل سے ملائی یا تھائی لگتا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے دھیان سے امریتا کو دیکھا اور جان ینگ سے کچھ کہا۔ جان ینگ عقاب کی طرح امریتا کی طرف آیا۔ ایک طوفانی جھٹکے سے اس نے امریتا کا سرمئی اسکارف نوچ پھینکا۔ امریتا کے لمبے ریشمی بال اس کی پنڈلیوں تک بکھر گئے۔ ان لمحوں میں میں نے جان ینگ کی

ورم زدہ آنکھوں میں ایک تیز چمک محسوس کی۔ جیسے غیر متوقع اور حیران کن طور پر کوئی نہایت قیمتی و نادر شے اس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ اس نے تحیر آمیز خوشی سے لتھڑے ہوئے لہجے میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور پھر امریتا کو اس کے بالوں سے جکڑ لیا۔ امریتا اب ہیجانی انداز میں چلا رہی تھی اور مدد طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف عرفات چند چوٹیں کھانے کے بعد کسی طرف نکل گیا تھا۔ کرنیل بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میرے لئے یہ قیامت کے لمحے تھے۔ امریتا جان ینگ کے شکنجے میں تھی۔ اور مجھے مدد طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں امریتا کے لئے بڑی سے بڑی مشکل سے ٹکرانے کا عزم رکھتا تھا...... لیکن تصور اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں جکڑ کر میرے اعصاب شل ہو گئے۔ اور میری کیفیت سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میرے سامنے سنگاپور کا کوئی عام غنڈہ نہیں تھا...... وہ معروف دادا گیر تھا۔ جس کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ جو بندے کو چیونٹی کی طرح مسلتا تھا۔

چند ساعتوں کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ میں اسی طرح سکتہ زدہ کھڑا رہوں گا اور سنگاپوری عقاب پھڑپھڑاتی چڑیا کو دبوچ کر اوجھل ہو جائے گا۔ لیکن پھر اچانک میرے اندر اس توانائی نے لہر لی جس کا سرچشمہ صرف اور صرف امریتا کی ذات تھی۔ وہ توانائی جس نے مجھ جیسے کمزور اور معمولی شخص کو براڈوے والے واقعے میں کمزور اور معمولی نہیں رہنے دیا تھا...... آج پھر یہ توانائی میرے رگ و پے میں پھیلی۔ میں کچھ دیر کے لئے ہر مصلحت' اندیشے اور خوف سے بیگانہ ہو گیا۔ میرا اور جان ینگ کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ نہ طاقت میں نہ ہمت میں' نہ ہتھیار بندی اور مہارت میں۔ یہ شہباز کو ممولے سے لڑانے والی بات تھی' یہ شیشے کو لوہے سے ٹکرانے والا عمل تھا۔ لیکن حقائق گواہ ہیں کہ کبھی کبھی بے نام جذبوں کی پراسرار حدت شہباز کو ممولے سے لڑا دیتی ہے۔

ایک کلین شیو غنڈہ مجھے عقب سے کھینچ رہا تھا اور ساتھ ساتھ میری گردن کے عقبی حصے پر مکے رسید کر رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور جان ینگ کی طرف بڑھا...... اس وقت میری آنکھوں کے سامنے دھند چھائی تھی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں نے جان ینگ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا اور اسے دیوانہ وار دھکیلتا ہوا دور لے گیا تھا۔ امریتا کے بال جان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ وہ چکنے فرش پر گر گئی۔ دوسری طرف میں اور جان بھی ایک صوفے پر اوپر نیچے گرے۔ میری گردن پر مکے مارنے والا شخص بھی میرے اوپر ہی گرا۔ وہ آہنی ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹنے لگا۔ میں دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ "امریتا بھاگ جاؤ...... امریتا بھاگ جاؤ۔"

پھر میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے ایک امید افزا منظر دیکھا۔ کسی طرف سے کرنیل برآمد ہوا اور امریتا کو لے کر زینوں کی طرف دوڑا۔ امریتا مڑ مڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی مگر کرنیل اسے کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے جسم و جان کی پوری قوت سے جان کو جکڑا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا اب میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔ میں نے سنگاپور کے ایک نامی بدمعاش پر ہاتھ ڈالا تھا...... اب اسی جگہ میری ہڈیاں توڑی جا سکتی تھیں' گولیاں مار مار کر چھلنی کیا جا سکتا تھا...... یا پھر یہاں سے کسی عقوبت خانے میں لے جا کر زندگی اور موت کے درمیان لٹکایا جا سکتا تھا۔ ابھی کچھ نہیں ہوا تھا...... ابھی یہ سب کچھ چند ساعتوں کی دوری پر تھا لیکن میں ابھی سے اپنے جسم کو بے پناہ اذیت کے شکنجے میں محسوس کر رہا تھا۔

میرے اوپر چڑھے ہوئے غنڈے نے مجھے گردن سے دبوچ کر پیچھے کھینچا اور ایک دیوار سے دے مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچے۔ میں نے خود کو بے پناہ ضربوں کے لئے تیار کر لیا۔ ایک دو شدید چوٹیں مجھے لگیں بھی لیکن پھر ایکدم صورت حال بدل گئی۔ میں نے دھندلائی نظروں سے گرماتا انڈین کو دیکھا...... اس کے ساتھ اس کے بپھرے ہوئے ہرکارے تھے۔ گرماتا کا سر پھٹا ہوا تھا اور لہو نصف چہرے کو سرخ کر رہا تھا۔ گرماتا کے ہاتھ میں ایک چار پانچ فٹ لمبا آہنی راڈ تھا۔ وہ چیل کی طرح جان ینگ پر جھپٹی اور وحشیوں کی طرح چلا چلا کر اسے ضربیں لگانے لگی۔ اس کے مشتعل ساتھیوں میں سے ایک نے جان کے ساتھی کی ٹانگوں پر فائر کئے۔ یہ سب کچھ میری نگاہ کے عین سامنے ہوا۔ وہ شخص بھاگنے کے لئے مڑا لیکن لڑکھڑا کر گر گیا۔

میرے دل سے آواز آئی۔ "دائم! اگر تم چند سیکنڈ بھی یہاں رہے تو کوئی گولی تمہیں چاٹ جائے گی۔" میں اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا زینوں کی طرف بڑھنے لگا۔ غیر متوقع طور پر تنگ زینوں میں میرا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ میں ہانپتا کانپتا ہوا نیچے لابی میں

پہنچا۔ یہاں چاروں طرف ٹوٹے ہوئے شیشے اور گولیوں کے خول بکھرے تھے۔ مجھے امریتا' کرنیل اور عرفات کہیں نظر نہیں آئے۔ گرماتا کے درجن بھر ساتھیوں نے مجھے اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا۔ بالائی منزل پر اکا دکا فائر اب بھی ہو رہے تھے۔ اتنے میں ہوٹل کا ایک سکھ ملازم ہاتھ میں پستول لئے مین دروازے پر نمودار ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے ملائی زبان میں کچھ کہا۔ وہ سب تیزی سے زینوں کی طرف بڑھے اور بیسمنٹ میں اتر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ بیسمنٹ سے چند زینے مزید اترنے کے بعد یہ لوگ ایک ڈھلوان راہداری میں آگے بڑھے اور ایک نیم تاریک بند کمرے میں آ گئے۔ یہاں فرش پر قالین بچھا تھا۔ ایک طرف کینوس کے تھیلوں میں کچھ رائفلیں پڑی تھیں اور شراب کی بوتلوں کے کریٹ رکھے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ ہوٹل کی پوشیدہ پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔



اس تہلکہ خیز واقعے کے قریباً 12 گھنٹے بعد اسی پناہ گاہ میں گرماتا انڈین سے دوبارہ میری ملاقات ہوئی۔ گرماتا کے سر پر ایک بڑی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس وقت امریتا' کرنیل اور عرفات بھی اس کے ساتھ تھے۔ معلوم ہوا کہ امریتا اور کرنیل کو زینوں سے اترتے ہی گرماتا کے آدمی مل گئے تھے۔ وہ ان دونوں کو محفوظ رستے سے گزار کر ایک ساتھ والی بلڈنگ میں لے گئے۔ کچھ دیر بعد عرفات کو بھی وہاں پہنچا دیا گیا۔ اب تک یہ لوگ وہیں پر تھے۔ عرفات کی پنڈلی پر گہری چوٹ آئی تھی۔ وہاں پٹی بندھی تھی اور وہ بری طرح لنگڑا رہا تھا۔

گرماتا نے مجھ سے پوچھا۔ ''تجھے تو کہیں زیادہ چوٹ نہیں آئی۔''

میں نے نفی میں جواب دیا۔

وہ پان چباتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔ اوپر تھوڑی ہی دیر میں پولیس آ گئی تھی۔ پولیس والے اس حرامی جان ینگ کو ہتھکڑی لگا کر یہاں سے لے کر گئے ہیں۔ بڑا شور مچا رہا تھا کتے کا بچہ۔ دھمکیاں دے رہا تھا۔ لیکن اب سستے میں جان نہیں چھوٹے گی اس کی۔ تین چار سال تو کہیں نہیں گئے۔ دو بندوں کی جان گئی ہے یہاں۔ اور حرامی جان رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔''

''دو...... بندے...... مرے ہیں؟'' کرنیل سنگھ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' گرماتا کے لہجے میں کرب کی جھلک تھی۔

''ایک تو یہاں ہوٹل میں میرا ملازم لکھی رام تھا۔ دوسرا راکیش کا ساتھی تھا۔ راکیش خود بھی سخت گھائل ہوا ہے۔ اس کے پیٹ میں تین گولیاں لگی ہیں۔ ہسپتال میں پڑا ہے۔''

"آپ راکیش پانڈے کی بات کر رہی ہیں؟" کرنیل سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں، تو اور کس کی کر رہی ہوں۔"

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ دو گاڑیوں پر جو بندے بعد میں آئے تھے وہ راکیش اور اس کے ساتھی تھے۔ ان کا ٹکراؤ جان ینگ کے کارندوں سے ہوا تھا۔ شاید اس باہمی ٹکراؤ کے سبب ہی میری اور امریتا کی جان بچ پائی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ غالباً ٹینا بھی اغوا ہونے سے رہ گئی تھی۔

یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس انداز سے سوچنا تو کسی طور ٹھیک نہیں تھا کہ جان ینگ امریتا کو کھوجتا ہوا یہاں تاج ہوٹل میں پہنچا تھا۔ وہ تو گرماتا کی بیٹی ٹینا کو اٹھانے کے چکر میں تھا۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ عین اس وقت میں اور امریتا وغیرہ بھی یہاں موجود تھے۔ لیکن یہ دوسرا اتفاق کیونکر ہوا تھا۔ راکیش پانڈے عین وقت پر یہاں کیسے آ دھمکا تھا؟ کیا وہ گرماتا کی مدد کے لئے آیا تھا۔ لیکن گرماتا کے ساتھ تو راکیش کا دشمنی اور عناد کا رشتہ تھا؟ اس سارے ہنگامہ خیز واقعے کے پیچھے کوئی اسرار نظر آ رہا تھا۔

گرماتا بڑے زہرناک لہجے میں کرنیل اور عرفات کو بتا رہی تھی۔ "وہ حرام کا جنا (جان ینگ) میری بچی کو اٹھانے کے لئے آیا تھا۔ سالے کنجر کو پتہ نہیں تھا کہ گرماتا کی بیٹی پر ہاتھ ڈالنا کتنا کٹھن ہے۔ آگ اور خون کے سات سمندر بھی پار کر لیتا تو میری ٹینا کو ہاتھ نہ لگا سکتا۔ بڑی ماریں کھائی ہیں گرماتا نے...... اور اب اور مار نہیں کھائے گی۔ اب تو مارے گی اور بھگا بھگا کر مارے گی۔" وہ ننگی گالیاں بکنے لگی۔

پھر اس نے لرزاں ہاتھوں سے ہونٹوں میں سگریٹ دبایا۔ ایک دراز قد غنڈے نے تیزی سے آگے بڑھ کر لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔

گرماتا نے بڑی گہری نظروں سے امریتا کو دیکھا' پھر اسی انداز سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ اوپر نیچے سر ہلاتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں...... میں جانتی ہوں وہ کتے کا پلا میری ٹینا پر ہاتھ ڈالنے کے لئے کیوں آیا تھا؟"

اس دوران میں ایک مسلح شخص کارڈلیس فون تھامے دروازے پر نظر آیا۔

"گرماتا جی منتری صاحب کا فون ہے۔" اس نے ہندی میں کہا۔

گرماتا ریسیور تھامتی ہوئی تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

اگلے قریباً اٹھارہ گھنٹے ہم چاروں نے اسی نیم تاریک بیسمنٹ میں گزارے۔ عرفات کی پنڈلی سوج گئی تھی۔ میری گردن اور کمر میں بھی سخت اینٹھن تھی۔ تاہم اس تکلیف اور پریشانی پر یہ احساس غالب تھا کہ ہم ایک جان لیوا واقعے کی لپیٹ سے صاف بچ گئے ہیں۔ دوسری منزل کی گیلری کے سامنے پیش آنے والے واقعات بار بار میری نگاہوں میں گھومتے تھے اور مجھے ششدر کر دیتے تھے۔ ان لمحوں میں دو طرفہ فائرنگ کے درمیان میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ بڑے ہیجانی لمحے تھے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے امریتا کو جان ینگ سے چھڑانے کے لئے' جان ینگ جیسے دبنگ شخص کو بازوؤں میں جکڑا تھا اور اسے دھکیلتے ہوئے صوفے پر گرا تھا۔ اس وقت میرے دل و دماغ نے فیصلہ دے دیا تھا کہ اب میں ایک مردہ شخص ہوں' چند سیکنڈ بعد یہاں میری لاش پڑی ہوگی۔ میں اپنے گھر کو' اہل خانہ کو اور امریتا کو اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ جان ینگ کے فولادی جسم کا لمس بار بار مجھے یاد آتا تھا اور میں اندر سے لرز جاتا تھا۔

ان اٹھارہ گھنٹوں میں ہم نے کھانے کے نام پر فقط چند لقمے لئے۔ امریتا نے یہ لقمے بھی نہیں لئے اور ٹیٹرا پیک دودھ کے دو چار گھونٹوں پر اکتفا کیا۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ آنے والے چند گھنٹوں یا دنوں میں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ ان اٹھارہ گھنٹوں میں فقط ایک بار کرنیل سنگھ گرماتا کے بلانے پر تہہ خانے سے باہر گیا۔ واپس آ کر اس نے صرف یہ بتایا کہ گرماتا نے ایک دو ضروری باتیں معلوم کی ہیں۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ واپسی پر کرنیل سنگھ کے ہاتھ میں ایک ملائی اخبار بھی تھا۔ اس میں اتوار والے خونی واقعے کی خبر تفصیل سے موجود تھی۔ اس خبر کے مطابق تاج ہوٹل میں ہونے والی لڑائی میں دو افراد ہلاک اور دس کے قریب شدید زخمی ہوئے تھے۔ ان شدید زخمیوں میں راکیش پانڈے بھی شامل تھا۔ دونوں ہلاک شدگان کی تصویریں بھی اخبار میں چھپی تھیں۔ راکیش کے ساتھی کی تصویر دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ مجھے

اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ نیچے نام دیکھا تو جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ مرنے والے کا نام گپتا ہی تھا۔

مجھے یہ منحوس صورت ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ اس شخص کا تعلق جالندھر اور جالندھر کے تھانے سے تھا۔ کرکٹ میچ کے خاتمے کے بعد ہماری پولیس رپورٹس گم ہوگئی تھیں اور نتیجے میں ہم حوالات جا پہنچے تھے۔ یہاں ایک اے ایس آئی گپتا کا رویہ ہمارے ساتھ کافی سخت رہا تھا۔ حوالات میں ارباز اور راج سنگھ میں ہاتھا پائی کے بعد اے ایس آئی گپتا نے ہمیں گندی گالیاں دی تھیں اور ہمیں مخاطب کر کے بولا تھا......

''تم دونوں مسلوں کی بدمعاشی ناک کے راستے نہ نکال دی تو اپنے باپو کا نہیں۔ ننگا کر کے چھتر ماروں گا تم دونوں کو۔''

اس کے الفاظ زہریلے تیروں کی طرح دل پر زخم لگا گئے تھے اور ان زخموں کے نشان کئی ماہ گزرنے کے باوجود ابھی تک دل پر موجود تھے۔ آج میں اسی بدزبان گپتا کی خونچکاں لاش دیکھ رہا تھا۔ گولی اس کی آنکھ سے ذرا نیچے لگی تھی اور رخسار کو بدنما طور پر ادھیڑ گئی تھی۔ گپتا یقیناً پرتاپ اور راج سنگھ کا یار تھا۔ اس حوالے سے وہ راکیش کا بھی یار ہوا۔ اب پتہ نہیں وہ کیسے اور کب یہاں پہنچا تھا یا شاید اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی تھی......اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے۔

میں کافی دیر تک گپتا کی صورت دیکھتا رہا اور جالندھر تھانے میں گزرے ہوئے روز و شب کو یاد کرتا رہا۔

تہہ خانے میں ہم چاروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ امریتا ایک کونے میں سمٹی سمٹی سوگئی تھی۔ ایک چادر سے اس نے خود کو پاؤں سے گردن تک ڈھکا ہوا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی اس کے چہرے پر جیسے اندیشوں کے بادل منڈلا رہے تھے۔ میں عرفات اور کرنیل سنگھ کو گپتا کے متعلق بتانے یا نہ بتانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کرنیل سنگھ خود ہی بول اٹھا۔ اپنی نیلی پگڑی کو درست کرتے ہوئے بولا۔ ''وائی' عرفات' تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔''

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ دھیرے سے کہنے لگا۔ ''آشا ہے کہ آج شام تک مِس امریتا کے کاغذات مل جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ دو تین دن تک وہ یہاں

سے انڈیا روانہ ہوسکے۔''

''واقعی؟'' عرفات نے حیرانی سے کہا۔

''نہیں مخول کر رہا ہوں۔'' وہ جل کر بولا۔ ''اوئے کھوتوف! یہ کوئی ٹائم ہے جوک بازی کا۔''

''نہیں میرا مطلب تھا کہ......گرماتا نے بتایا ہے؟''

کرنیل سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک دو بڑی اہم سماچار ملیں ہیں۔ لیکن اپنے تک رکھو تو بتاؤں گا۔''

میں نے اور عرفات نے اسے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا۔

وہ ہمارے کچھ اور قریب سمٹ آیا اور بولا۔ ''مجھے شک تو پہلے سے تھا لیکن اب وشواس ہوگیا ہے۔ گرماتا اور راکیش میں پتی پتنی کا رشتہ رہا ہے......اس حوالے سے ٹینا گرماتا ہی کی نہیں راکیش کی بیٹی بھی ہے۔''

''اوہ گاڈ!'' میں نے ہونٹ سکوڑے۔ عرفات کی آنکھیں بھی وا تھیں۔

کرنیل بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یاد ہے نا' کل گرماتا نے ہم سے بات کرتے ہوئے کہا تھا' میں جانتی ہوں وہ کتے کا پلا جان میری ٹینا پر ہاتھ ڈالنے کے لئے کیوں آیا تھا۔ اس فقرے کے پیچھے ایک خاص جانکاری کا اعلان تھا۔''

''کیسی جانکاری؟'' عرفات نے پوچھا۔

''جان ینگ راکیش کی بیٹی کو اٹھانے اس لئے آیا تھا کہ وہ راکیش سے اپنی رقم پوری کرنا چاہتا تھا۔ وہ رقم جو اس نے کئی ماہ پہلے امریتا کے لئے ایڈوانس دے رکھی تھی۔ یہ اس شدید کھینچا تانی کا منطقی انجام تھا جو پچھلے کئی ماہ سے جاری ہے۔ جان نے راکیش کو بار بار وارننگ دی کہ وہ امریتا کو اس کے حوالے کر دے۔ جب ہر کوشش ناکام ہوئی تو وہ بدترین دشمنی پر اتر آیا۔ اس نے چند دن پہلے راکیش کو فون پر دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ''مال'' ہینڈ اوور نہیں کیا تو وہ ایسی چوٹ لگائے گا کہ راکیش کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ یہ سنگین چوٹ یہی تھی۔ وہ امریتا کے بدلے راکیش کی نوعمر بیٹی اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا...... کہنے سننے میں یہ سب کچھ بڑا فکشن ٹائپ لگتا ہے لیکن میں تم کو کیا بتاؤں مترو! یہاں سنگاپور اور ملائیشیا وغیرہ کی انڈر ورلڈ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ

فکشن سے بہت آگے کی چیز ہے۔ ہم لوگوں نے تو پرسوں اس کی کیول ایک چھوٹی سی جھلک ہی دیکھی ہے۔"

واقعات کی بہت سی کڑیاں ایکدم میری نگاہوں کے سامنے ملنا شروع ہو گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ پرسوں تاج ہوٹل میں تین گروہوں میں جو خونریز جھڑپ ہوئی اس کے ڈانڈے آگے جا کر ہمارے ساتھ ہی ملتے تھے۔ یہ بڑا سنسنی خیز انکشاف تھا۔

کرنیل سنگھ اپنے مخصوص لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "راکیش کی سی آئی ڈی بھی کچھ کم تیز نہیں ہے۔ جب وہ جنگلیٹ "جان" اپنے گماشتوں کے ساتھ تاج ہوٹل کو روانہ ہوا تو راکیش کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ تیز رفتاری سے یہاں پہنچ گیا اور یہاں جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ سؤرای (سؤر جمع حرامی) راکیش پیٹ میں تین سوراخ کرا کے اسپتال میں پڑا ہے۔ جان اپنے آٹھ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار ہو چکا ہے اور بکیز کے پولیس سٹیشن میں ہے۔"

"بڑا زبردست انکشاف کیا ہے تم نے کرنیل بھائی۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "ہم اخبار والوں کا کام ہی انکشاف کرنا ہے۔" پھر ذرا توقف سے کہنے لگا۔ "بے شک یہ بڑا انکشاف ہے...... لیکن اس سے بڑا ایک "انکشاف" اور بھی ہے بلکہ انکشافو ہے۔ شاید تمہیں وشواس کرنے میں دشواری ہو لیکن ریالٹی...... ریالٹی ہی ہے۔"

ہم ہمہ تن گوش ہو گئے۔

وہ بڑے انداز سے سگریٹ سلگا کر بولا "کچھ دن پہلے تم نے میرے دفتر سے اخبار کا ایک تراشا لیا تھا۔ اس تراشے میں راکیش کی ایک پرانی تصویر بھی تھی۔ تصویر میں وہ ایک معصوم لڑکی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ تصویر کے کیپشن کے مطابق وہ لڑکی راکیش کی پتنی تھی۔ یاد ہے نا تمہیں؟"

ہم دونوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ "یہ بات تم دونوں کے لئے بہت حیرت کا کارن (باعث) ہو گی کہ تیرہ سال پہلے کی وہی معصوم لڑکی آج کی بدنام عورت گرماتا انڈین ہے۔"

ہم دونوں اچھل پڑے۔ یہ انکشاف واقعی ششدر کر دینے والا تھا۔ تراشے میں راکیش کی دلہن کے خدوخال اور گرماتا کے نقوش ایک ساتھ نگاہوں میں گھومنے لگے...... ذہن نے ایک دو سیکنڈ میں فیصلہ دے دیا کہ یہ سب ناممکن نہیں ہے۔ بے شک آج کی گرماتا ایک فربہ اندام...... اور بھدے چہرے والی کرخت عورت تھی لیکن اس کے خدوخال میں تیرہ چودہ برس پہلے والی معصوم لڑکی کی جھلک موجود تھی۔ تبدیلی بہت حیران کن تھی لیکن ناممکن نہیں تھی۔

کرنیل سنگھ کہہ رہا تھا۔ "اب تک کی جانکاریوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تیرہ سال پہلے گرماتا ایک سیدھی سادی بھارتی لڑکی تھی۔ وہ اسی طرح راکیش کی عیاریوں کا شکار ہوئی اور اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ کر یہاں سنگاپور پہنچ گئی۔ یہاں اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھیڑیوں سے بھرے ہوئے ایک تاریک جنگل میں اکیلی ہرنی کی طرح تھی۔ اسے بھگا بھگا کر مارا گیا۔ نوچا کھسوٹا گیا۔ اس کی آبرو کا لہو پیا گیا۔ اس نے دو بار آتما ہتیا کی کوشش بھی کی لیکن ناکام رہی۔ دھیرے دھیرے اس نے موت اور ذلت کے گھیرے میں جینا سیکھ لیا۔ وہ جینے لگی۔ وقت نے اسے جیون گزارنے کے نئے ڈھنگ سکھائے۔ اس نے سوچ لیا کہ جب اسے ہوس کاروں کے سامنے بکنا ہی ہے تو وہ اپنی پوری قیمت وصول کرے گی...... اور خود کرے گی۔ ایک دن اس نے غنڈ بنے (غنڈے کمینے) راکیش کی تشریف پر بھی لات مار دی۔ راکیش سے اس کی ایک بچی بھی تھی۔ وہ گرماتا نے بزور اپنے پاس رکھ لی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا رہا اس کا Imagine ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔"

کرنیل کی حاصل کردہ معلومات حیران کن تھیں۔ ہم دونوں دم بخود تھے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "راکیش گرماتا کو طلاق دے چکا ہے؟"

"اس بارے میں میں ابھی وشواس سے کچھ نہیں کہہ سکتا بہر حال موجودہ صورتِ حال طلاق جیسی ہی ہے۔"

"راکیش اپنی بیٹی کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتا؟" عرفات کے سوال میں حیرت تھی۔

"یقیناً کرتا ہوگا اور ہو سکتا ہے اس سلسلے میں اس نے کورٹ وغیرہ سے رجوع

بھی کیا ہو لیکن اگر گرماتا ایک خراب ماحول میں رہ رہی ہے تو وہ لفنگوں کی گنگا جل میں نہاتا ہے۔ اس کا شمار سنگاپور کے چند گنے چنے دلالوں میں ہوتا ہے۔ پھر گرماتا انڈین کا زور بھی زیادہ ہے۔ بڑے بڑے پاٹے خانوں سے رابطے ہیں اس کے۔ اس نے بیٹا کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور بڑی 'لبرٹی' کے ماحول میں اس کی پرورش کر رہی ہے۔ کیا پتہ کل وہ بھی دولت مند مردوں کو اپنے گھٹنے کے نیچے دبائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سے اپنی سندرتا کا خراج بھی وصول کرے۔"

"یار! تیری باتوں نے تو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ واقعی یقین نہیں ہو رہا۔" عرفات نے کہا۔

"لیکن ابھی یہ باتیں کیول اپنے تک ہی رکھنی ہیں گروجی۔" کرنیل نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"سمجھو فی الحال ہم شیر کے منہ میں ہیں' بلکہ شیرنی کے منہ میں۔"

امریتا بدستور سوئی پڑی تھی۔ سچ کہتے ہیں' نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

اسی روز رات کے وقت ایک اور سنسنی خیز واقعہ ہوا۔ دس گیارہ بجے کا وقت یا شاید اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ تہہ خانہ میں ایک چھوٹا ٹی وی رکھوا دیا گیا تھا۔ ہم ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں تہہ خانے سے باہر کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ پھر دروازہ کھلا اور تین چار افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں گرماتا بھی تھی۔ اس کے سر پر بدستور سفید پٹی تھی۔ اپنی سرخ شرٹ کی آستینیں اس نے اڑسی ہوئی تھیں۔ پان کی جگالی تو وہ ہر وقت کرتی ہی رہتی تھی۔ گرماتا کے ساتھ جو شخص تھا اسے دیکھ کر میرے اور امریتا کے طوطے اڑ گئے...... یہ پرتاپ سنگھ تھا۔ اس نے پتلون قمیص اور پگڑی پہن رکھی تھی۔ پگڑی کی وجہ سے وہ کچھ اور بھی قوی ہیکل دکھائی دیتا تھا۔ مجھے بعینہٖ یہی محسوس ہوا کہ ہم جالندھر کی کسی تفریح گاہ میں بیٹھے ہیں اور پرتاپ اپنی انگارہ آنکھوں کے ساتھ اچانک وہاں آ دھمکا ہے۔ ہمیں ڈرانے سہمانے کے لئے۔ امریتا بھی ایکدم سکڑ کر میرے قریب آ گئی (ہمیں پرتاپ بالکل تندرست نظر آیا حالانکہ راکیش نے امریتا کو بتایا تھا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔)

ہمیں پرتاپ کے چہرے پر خشونت کی بجائے نرمی اور رقت کے آثار نظر

آئے۔ امریتا کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔ امریتا ڈر کر کچھ پیچھے ہٹ گئی۔ وہ اشک بار لہجے میں بولا۔ "بیٹی یہ کیا ہوا ہے؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تمہارے اور راکیش کے درمیان اتنی جلدی اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ واہگرو میرے حال پر کرپا کرے۔ میں بمبئی میں تھا۔ بس تین چار دن پہلے ہی مجھے راکیش نے فون کیا کہ امریتا نہیں مل رہی۔ اسے شک ہو رہا تھا کہ شاید جان ینگ کے بندوں نے تمہارے ساتھ کچھ کیا ہے...... تمہیں اٹھوا لیا ہے۔"

"جو کچھ کیا ہے تمہارے لاڈلے سپوت نے ہی کیا ہے پرتاپ۔ وہ حرامی یہاں اس کی زلفوں کو بیچ کر اسے روپے ڈھالنے والی مشین بنانا چاہ رہا تھا۔" گرماتا نے بڑے زہرناک لہجے میں کہا۔

پرتاپ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ "ربا! میں کیا منہ دکھاؤں گا اپنے یار کو' کتنے مان سے میں نے اس کے سامنے جھولی پھیلائی تھی۔ اور اس نے بھی کتنے وشواس سے اس کڑی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ اب یہاں پردیس میں اس وچاری کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں کون دوشی ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

مجھ سے چپ نہیں رہا گیا۔ میں نے ایک قدم آگے آتے ہوئے کہا۔ "انکل! خوامخواہ آنسو نہ بہاؤ۔ امریتا کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں تم برابر کے قصوروار ہو۔" میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

پرتاپ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید پہلے اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ ایک دو سیکنڈ میں ہی وہ مجھے پہچان گیا۔ اس کے چہرے پر رنگ سا گزرا لیکن پھر فوراً اس نے خود کو سنبھال لیا۔ باقاعدہ آنسو گرا کر بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو بھائیا! میں ہی قصوروار ہوں۔ یہ میرا ہی اپرادھ ہے۔ میں نے سوچا تھا یہ نیک بیو کی نیک کڑی ہے۔ رج کے سمجھدار بھی ہے۔ اس وگڑے تگڑے (راکیش) کو سنبھال لے گی۔ اس کی وجہ سے اس حرامی کے جیون میں سدھار آ جائے گا۔ میں خود بھی بس آٹھ دس دن میں یہاں سنگاپور آنے والا تھا۔ مجھے یہاں ان دونوں کے ساتھ رہنا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ ہم باپ بیٹی مل کر اس اتھرے گھوڑے کے منہ میں لگام ڈالیں گے۔ اسے ڈھنگ سے چلنا سکھائیں گے۔ پر اتنی جلدی اتنا کچھ ہو جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

پرتاپ سنگھ کی آواز میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس وقت بھی نشے میں ہے۔

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ سننے میں بھلا لگ رہا تھا۔ لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس میں حقیقت کتنی ہے اور یقیناً امریتا بھی جانتی تھی۔ یہ خبیث شخص اپنے خوبرو بیٹے کے ہر جرم میں برابر کا شریک تھا۔ اسے تو اپنے بیٹے سے بھی پہلے سلاخوں کے پیچھے پہنچنا چاہئے تھا۔ یہ انصاف اور قانون کی بے بسی تھی کہ یہ لوگ تاحال آزاد پھر رہے تھے لیکن کب تک؟ آخر تو جرم اپنی تعزیر کو صدا دیتا ہی ہے، آخر تو آستیں کا لہو پکارتا ہی ہے۔

پرتاپ سنگھ نے ایک دو منٹ مزید واویلا کیا۔ وہ چرب زبان تھا اور ایک ماہر وکیل کی طرح اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گرماتا نے امریتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں کڑیے! یہ تیرا انکل کیا کہہ رہا ہے؟''

امریتا خاموش کھڑی رہی۔ اس کا سر جھکا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ امریتا کی خاموشی سے پرتاپ نے کچھ مزید حوصلہ پکڑا۔ وہ آگے آیا۔ ''امرت! تجھے پتہ نہیں، مجھے کتنا جھٹکا لگا ہے یہ سب کچھ جان کر۔'' اس نے امریتا کے شانے تھامتے ہوئے کہا۔

جونہی اس کے ہاتھوں نے امریتا کے جسم کو چھوا، امریتا کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ ہم سب کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی تڑپ گئی۔ ہم میں سے شاید کسی کو امریتا کے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ ایک قدم پیچھے ہٹ کر امریتا نے ایک زور کا طمانچہ شرابی پرتاپ سنگھ کے منہ پر رسید کیا۔ چٹاخ کی آواز پورے بیسمنٹ میں گونجی۔

''تم بڑے راکشس ہو۔'' وہ غم و غصے میں ڈوب کر بولی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چہرہ بازوؤں میں چھپایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کا کومل بدن جیسے طوفان کی زد میں آ گیا تھا۔

طمانچہ کھا کر بڑے راکھشس (شیطان) کا سر کچھ اور جھک گیا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ پرتاپ کی ساری باتوں کا یہ بڑا جامع جواب امریتا نے دیا تھا۔ اس کی پیش کی ہوئی ساری صفائیاں امریتا نے ایک ہی ''زناٹے دار دلیل'' سے تہس نہس کر دی تھیں۔

گرماتا نے بڑے تمسخر سے پرتاپ کو دیکھا۔ ''آ جاؤ سسر جی! میرا خیال ہے کہ تسلی بخش جواب تمہیں مل گیا ہے۔'' وہ بولی۔

پرتاپ نے جواب میں کچھ کہنا چاہا..... ''گرماتا جی۔

''اب اپنی چونچ بند رکھ بڈھے گدھ! ورنہ اور ذلیل ہو گا۔ آ جا اب باہر۔''

پرتاپ نے کانپ کر مشتعل گرماتا کو دیکھا اور پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میں نے ہچکیوں سے روتی ہوئی امریتا کو دلاسا دینے کے لئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اگلے بارہ گھنٹے بھی وہیں تہہ خانے میں گزرے۔ ہم شاید تذبذب کی کیفیت میں تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونا ہے۔ کرنل سنگھ اپنے آفس میں فون کر چکا تھا کہ وہ ایک دو دن کے لئے ''جوہر بارو'' جا رہا ہے..... مگر اب اسے بھی تشویش تھی، وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی چنّی کو کوالالمپور سے واپس لانے کے لئے جانا تھا۔ پروگرام کے مطابق اس نے فی الحال چنّی کو اپنے فلیٹ میں واپس نہیں لانا تھا۔ بلکہ کسی عزیز کے گھر پہنچانا تھا۔ وہ فی الوقت جان ینگ وغیرہ کے حوالے سے کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک دو بار کرنل سے کہا کہ وہ گرماتا سے رابطہ کرے۔ لیکن وہ بھی مجبور تھا۔ گرماتا کا کہنا تھا کہ وہ خود ہی ہمیں تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرے گی۔ ہوٹل کے دو باوردی ملازم ہمیں کھانا اور دیگر ضروریات وقت پر پہنچا رہے تھے۔ لیکن ان سے ہم پیغام رسانی کا کام نہیں لے سکتے تھے۔ یہ دن کوئی نو دس بجے کا وقت تھا۔ میں واش روم کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور گرماتا نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں وہسکی کی کوارٹر بوتل دبی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں دو مسلح کارندے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں کورڈلیس فون تھا۔

گرماتا نے بے تکلفی سے وہسکی کا ایک چھوٹا جرعہ لیا اور امریتا سے مخاطب ہو کر بولی۔

''لے کڑیے! یہ ہیں تیرے کاغذ، یہ ساتھ میں ٹکٹ بھی ہے۔ کل ڈھائی بجے چانگی ایئرپورٹ سے تیری فلائٹ ہے۔''

امریتا ششدر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں

سے اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ پکڑا۔

گرماتا نے کہا۔ ”تیرا اٹیچی بھی میں نے لے لیا ہے راکھشس سے۔ اوپر میرے دفتر میں پڑا ہے۔ جاتے ہوئے لے لینا۔ رستے میں خرچ پانی کے لئے تھوڑے بہت روپے تو ہوں گے نا تیرے پاس؟“

امریتا نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”بس اب پھوٹ جا یہاں سے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ اور میری طرف سے اپنے باپو سے ایک بنتی کرنا ہاتھ جوڑ کر۔“ گرماتا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔ اس نے کہا ”پوربی ناری (مشرقی عورت) کے لئے اپنے دیش کی آدھی روٹی‘ کالا پتی اور کرایے کا گھر پرائے دیش کی پوری روٹی‘ سونے پتی اور چھ کینال کی کوٹھی سے زیادہ اچھے ہیں۔ بھگوان کے لئے اپنی اولادوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں۔ چاہے وہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے..... اچھے رشتوں اور دھن دولت کے لئے انہیں پرائے دیشوں کی بھٹی میں نہ جھونکیں۔“

گرماتا کی سوجی ہوئی سیاہ آنکھوں میں مجھے کرب کی ایک تیز لہر نظر آئی۔ یہ شاید اس کے جیون بھر کا دکھ بول رہا تھا۔ میں بڑے دھیان سے اس پینتیس چالیس سالہ بدنما عورت کو دیکھنے لگا۔ ہاں یہی تھی تیرہ سال پہلے کی دبلی پتلی اور سمٹی سمٹائی سی دلہن۔ جس کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے سپنے سجے تھے۔ اخباری تراشے کی تصویر میں اس کی پیشانی‘ ناک اور ہونٹ بہت نمایاں تھے۔ وقت اکثر لوگوں کو تبدیل نہیں کرتا لیکن کچھ کو اتنا تبدیل کرتا ہے کہ ان کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ سب کچھ آنکھوں سے دیکھنے اور جاننے کے بعد بھی یقین نہیں آتا۔ میں گرماتا کو دیکھتا رہا اور کرنیل سنگھ کی باتیں کانوں میں گونجتی رہیں۔

گرماتا نے کوارٹر بوتل سے ایک چھوٹا سا گھونٹ اور لیا۔ پھر بوتل کو پتلون کی سائیڈ پاکٹ میں اڑس لیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سگریٹ دبا تھا۔ سگریٹ کا ایک کش لے کر اس نے ہم سب کو طائرانہ نظروں سے دیکھا اور واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔

کرنیل سنگھ اس کے پیچھے گیا۔ تہہ خانے کے دروازے سے چند قدم آگے اس نے گرماتا سے چند سرگوشیاں کیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اخلاقی طور پر اس معاوضے کا ذکر کر رہا ہے جو گرماتا نے کاغذات کی واپسی اور امریتا کی بحفاظت روانگی کے لئے مانگا تھا۔

کرنیل کی بات سن کر گرماتا نے لاپرواہی سے کرنیل کو ہلکا سا دھکا دیا اور ہاتھ لہرا کر بولی۔

”او جا جا۔ کام کر اپنا۔ بڑا آیا ”پے مینٹ“ کرنے والا۔“ اس کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کے انداز میں غصے کے باوجود محبت کی جھلک تھی۔

امریتا کا جہازی سائز سوٹ کیس کچھ دیر بعد بیسمنٹ میں پہنچ گیا۔ اس میں اس کے شادی کے ملبوسات تھے۔ سوٹ کیس کی پاکٹ میں دو چار گہنے بھی تھے۔ باقی جیولری راکیش نے شاید کہیں اور رکھی ہو گی۔ امریتا نے عجیب بیزاری کے عالم میں اس سامان کو دیکھا۔ پھر وہ اس بات پر تل گئی کہ وہ یہ سب کچھ یہیں چھوڑ جائے گی‘ اپنے ساتھ نہیں لے جائے گی۔ میں نے بمشکل اسے سمجھایا کہ وہ اس طرح تماشا نہ بنائے۔ انڈیا جا کر ایئرپورٹ سے نکلتے ہی وہ چاہے سب کچھ پھینک دے لیکن یہاں سے لے جائے۔ عرفات نے بھی اسے قائل کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اس سامان میں کچھ چیزیں ایسی بھی تو ہوں گی جو اس کے باؤجی نے بڑی چاہت سے اسے دی ہوں گی۔

رات کو کسی وقت گرماتا کے ایک بنگالی کارندے نے انڈیا میں امریتا کی بات بھی کرا دی۔ یقیناً ایسا اس نے گرماتا کی ہدایت پر ہی کیا تھا۔ یہ دراز قد بنگالی‘ شکل سے غنڈہ نظر آنے کے باوجود سوٹ بوٹ میں تھا۔ وہ مجھے اور امریتا کو اوپر ایک آفس نما کمرے میں لے گیا۔ یہاں سرخ رنگ کا ایک اسپیشل فون سیٹ پڑا تھا۔ فون سیٹ کے ساتھ وی سی آر کی طرح کا ایک ڈوائس بھی رکھا تھا۔ دراز قد بنگالی نے امریتا کو بتایا کہ وہ یہاں سے انٹرنیشنل کال کر سکتی ہے۔ امریتا نے لرزتے ہاتھوں اور برستی آنکھوں کے ساتھ باؤجی کا نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ چوتھی پانچویں کوشش میں اسے کامیابی ہوئی۔ باؤجی کی آواز سن کر امریتا کی جو حالت ہوئی اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے دو تین صفحوں کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ باپ بیٹی میں بہت جذباتی گفتگو ہوئی۔ فون کے مائیک کے ذریعے یہ باتیں میں بھی سن رہا تھا۔ باؤجی روتے ہوئے بار بار کہہ رہے تھے۔

”مجھے شما کر دے بیٹی! میں نے تیرے لئے غلط فیصلہ کیا۔“ باؤجی کے پاس

ان کا کوئی شاگرد پولیس افسر بھی موجود تھا۔ اس کا نام دربار سنگھ تھا۔ دربار سنگھ نے امریتا کو چھوٹی بہن کہہ کر مخاطب کیا اور پیشکش کی کہ وہ اسے لینے کے لئے خود سنگاپور آ جاتا ہے۔ امریتا نے دربار سنگھ اور باؤ جی کو پوری تسلی دی اور کہا کہ اب فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ واہگرو نے چاہا تو وہ کل رات تک انڈیا پہنچ جائے گی۔ دربار سنگھ اور باؤ جی نے کہا کہ وہ اسے لینے کے لئے ''دہلی'' ائرپورٹ پر خود موجود ہوں گے۔

☆......☆......☆

اور یہ وقت جدائی تھا۔ مجھے ہرگز علم نہیں تھا کہ یہ وقت اتنی جلدی آ جائے گا۔ بے پایاں خوشی اور گہرا غم آپس میں گھل مل گئے تھے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد امریتا اور کرنیل سنگھ گرماتا کی فراہم کردہ خصوصی گاڑی میں ایئرپورٹ روانہ ہو رہے تھے۔ امریتا کا اٹیچی اس گاڑی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ امریتا کو ''سی آف'' کرنے کے بعد کرنیل سنگھ کو واپس یہیں پر میرے اور عرفات کے پاس آ جانا تھا۔ اس کے بعد ہم تینوں نے فیصلہ کرنا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔

امریتا تصویر بنی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ آنسوؤں کی بارش کے بعد اس کا چہرہ سفید گلاب کی طرح کھلا کھلا تھا۔ اس کے بے مثال بال ایک طویل آبشار کی طرح اس کے کندھے سے گرتے ہوئے اس کی گود میں خمیدہ ہوتے ہوئے اس کی پنڈلیوں تک چلے گئے تھے۔ عرفات اور کرنیل صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ دیر کے لئے باہر جا چکے تھے۔

امریتا نے عجیب دل گداز لہجے میں کہا۔ ''دای! ہم ملیں گے نا؟''

''اگر جذبے سچے ہیں تو ضرور ملیں گے۔''

''کہیں کوئی دیوار تو ہمارے درمیان نہیں آ جائے گی۔''

''ارادے مضبوط ہوں تو دیواریں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔''

اس نے میرے ہاتھ تھامے۔ عجیب لاڈلے انداز میں ناک کے اندر گنگنائی۔ ''دیر تو نہیں لگاؤ گے؟''

''نہیں۔ بہت جلد آؤں گا۔ تھوڑے دن...... بس تھوڑے دن۔''

''کتنے دن؟''

''بس اتنے دن کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ تمہیں رہنے کے لئے چھت اور عزت کی روٹی دے سکوں۔ اس کے بعد مجھے تمہارے پاس آنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔''

''چھت اور روٹی کیا بہت ضروری ہیں دای؟ یہ سب کچھ تو جیون اور محبت کے ساتھ ہی چلتا رہتا ہے۔ جہاں ہم دونوں کا پریم ہوگا وہاں دنیا کی ہر شے میسر ہو جائے گی۔''

''نہیں امرت! میں تمہاری پیشانی پر ایک شکن دیکھنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ میرے سارے جسم کے ٹکڑے ہو جائیں۔ میں تمہیں بہت سکھ دینا چاہتا ہوں امرت! بہت سکھ۔ پلیز اس کے لئے مجھے تھوڑا سا وقت دے دو۔''

اس نے عجیب محبت بھری شوخی سے مجھے دیکھا۔ ایک بار پھر ناک میں گنگنائی۔

''مجھ سے پیچھا تو نہیں چھڑا رہے ہو؟''

''اب میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔'' میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے۔ وہ آہ کھینچ کر میرے سینے سے لگ گئی۔

''میں دن رات تمہارا انتظار کروں گی دای!...... مجھے دیر تک نہ رلانا۔''

''تم رونا نہ...... بس جلدی ملنے کی دعا کرنا۔''

''میں ہر شام اپنے کمرے میں بیٹھوں گی۔ اس کھڑکی کو کھولوں گی جو تمہارے لاہور کی طرف کھلتی ہے۔ ہواؤں میں تمہاری خوشبو سونگھا کروں گی۔''

''اور میں بھی ہر شام چھت پر جاؤں گا۔ جہاں بیٹھ کر تمہیں پہلا خط لکھا تھا۔''

''تم نے اچھا یاد دلایا...... ہمارے درمیان قلم کا رابطہ تو برقرار رہے گا نا؟'' وہ میرے ساتھ لگے لگے بولی۔

''اگر تم چاہو گی تو ضرور رہے گا۔''

''میں تمہارے لاہور پہنچتے ہی تمہیں پتر لکھوں گی۔ تم جواب دو گے نا؟''

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

''نہیں، اپنے منہ سے اقرار کرو۔''

''ہاں دوں گا۔''

''بس ایک آخری وعدہ...... ایک آخری وعدہ اور کرووای!''

''کیا؟''

''مجھے جان سے تو نہیں مارو گے؟''

''کیا مطلب؟''

''مجھے بھول گئے تو میں مر جاؤں گی۔ بھولو گے تو نہیں؟''

''نہیں؟'' میں نے جذب سے کہا اور اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

اور پھر...... اور پھر وہ چلی گئی۔ سنگاپور کے ساحلوں کی ساری خوبصورتی، گلاب، چنبیلی اور مولسری کے پھولوں کی ساری خوشبو اپنے ساتھ لے کر۔ ایشیا کا عظیم الشان شہر اپنی تمام تر رعنائیوں اور رنگوں کے باوجود اداس ہو گیا۔



ٹھیک تین روز بعد میں بھی سنگاپور سے لاہور کے لئے پرواز کر رہا تھا۔ میرا پہلا ٹکٹ کینسل کروانے، نیا بنوانے اور دیگر ضروری تبدیلیوں میں کرنیل سنگھ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ کرنیل اور عرفات، مجھے چانگی ایئرپورٹ پر ''سی آف'' کرنے کے لئے موجود تھے۔ میں دیر تک دونوں کے گلے لگا رہا۔ میرے پاس الفاظ نہیں تھے کہ اس دیارِ غیر میں اپنے ساتھ ان کے تعاون کا شکریہ ادا کر سکتا۔ بس میری آنکھوں کی نمی ہی میرے دل کی ترجمان تھی۔

گرماتا کے دو اہلکار خاص بھی وقتِ رخصت ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ وہ صرف ملائی بول سکتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کرنیل سنگھ کے ذریعے مجھے بتایا کہ گرماتا نے میرے اور امریتا کے لئے پیغام بھیجا ہے۔ نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اگر انڈیا میں امریتا کو راکیش وغیرہ کی طرف سے کسی طرح کی پریشانی ہو تو مجھے آگاہ کرے۔ میں یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا مزاج درست کروں گی۔

یہ بہت بڑی بات تھی...... بہت بڑی۔ بے شک گرماتا ایک بدنام اور غلط کار عورت تھی۔ اس کے کردار کی وکالت کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا لیکن اس نے جو کچھ ہمارے لئے کیا تھا۔ اسے فراموش کرنا بھی آسان نہیں تھا۔

وہ ایک ابر آلود سہ پہر تھی۔ میرا ٹکٹ ملائیشین ایئرلائن کا تھا۔ اس پرواز کو براستہ Penang بنکاک پہنچنا تھا۔ بنکاک سے پی آئی اے کی رابطہ پرواز کے ذریعے مجھے لاہور روانہ ہونا تھا۔ سنگاپور کے ایئرپورٹ سے جہاز فضا میں بلند ہوا تو پورا شہر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ یہ رنگوں روشنیوں کا شہر تھا، یہ سپنوں کا جزیرہ تھا۔ اس جزیرے کا کچھ حصہ فوج نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے، وہاں مشقیں وغیرہ ہوتی ہیں۔ اگر فوج

اس علاقے کو بھی کھلا علاقہ قرار دے دے تو شاید کچھ ہی عرصے میں وہاں بھی فلک بوس عمارتوں کا جنگل اگ آئے' اور تل دھرنے کو جگہ نہ رہے۔ سنگاپور میں قیام کے دوران میں' میں نے کچھ لوگوں سے سنا تھا کہ یہاں جگہ کی اتنی قلت ہے کہ یہ لوگ سمندر میں کوڑا کرکٹ پھینک کر اسے بھرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سمندر کو کون بھر سکتا ہے۔ ہاں۔ یہ ممکن ہے کہ لاکھوں ٹن کوڑا پھینک کر چند گز یا چند فٹ جگہ میسر آ جائے۔ یہ لوگ اسے بھی غنیمت سمجھیں گے۔

فضا سے سنگاپور کا نظارہ کیا تو جگہ کی قلت کا شدت سے اندازہ ہوا۔ سمندر کے کناروں تک فلک بوس عمارتیں کھڑی ہو چکی ہیں۔ میں اس ''شہرِ ہزار رنگ'' کو دیکھنے لگا۔ بلندی کچھ اور بڑھی تو ملائشیا کا جنوبی کنارہ بھی نظر آنے لگا۔ جہاز اوپر جا رہا تھا۔ سنگاپور قدرے چھوٹا نظر آنے لگا۔ تاہم سڑکوں اور چوراہوں کے نشانات اب بھی واضح تھے۔ ہاں یہی گلی کوچے تھے جہاں میں نے اپنی زندگی کے پرآشوب ترین دن گزارے تھے۔ کیسے کیسے واقعات اور کیسے کیسے لوگوں سے پالا پڑا تھا۔ محبت کرنے والا دوست عرفات' ظہیر عباس کا ہم شکل شرمیلا نوجوان ظہیر صادق' لوگوں کو نت نئے خطاب دینے والا اور یاروں کا یار کرنیل سنگھ...... دو پاکستانی آنٹیاں زیب اور ریحانہ' شعلہ بدن آوارہ مزاج مسز فو اور پھر راکیش عرف راکھشس' چنگیز خان کی صورت والا جان ینگ جو اپنے نامعلوم تھائی باس کے لئے گھوڑے اور لڑکیاں جمع کرتا تھا' اور...... اور ایک انوکھا یادگار کردار گرماتا انڈین۔

اور ہاں یہیں پر مجھے وہ لڑکا لڑکی بھی تو ملے تھے جو ایک فیری پر سینتھوسا آئی لینڈ جا رہے تھے۔ لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے شانے سے لگی کوئی گیت گا رہی تھی۔ وہ دونوں میرے لئے اجنبی تھے' وہ گیت بھی میرے لئے اجنبی تھا۔ میں اسے سمجھ نہیں پایا تھا لیکن مجھے لگا تھا وہ اداسی اور جدائی کا گیت ہے۔ اس میں ساحل سے بچھڑ جانے والی لہروں اور شجر سے بچھڑ جانے والے پتوں کا ذکر ہے' اس میں نیلی آنکھوں والی اس دوشیزہ کا ذکر ہے جو آخری بار اپنے محبوب سے ملتی ہے' اور آخری بار ہاتھ لہرا کر کسی ان دیکھے سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ میں اس گیت کو سمجھ نہیں سکا تھا لیکن اس نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ اب وہ لڑکا لڑکی نجانے کہاں تھے؟ بہت سے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی

دنیا کی بھیڑ میں گم ہو چکے تھے' دوبارہ کبھی نظر نہ آنے کے لئے لیکن ان کی صورتیں کسی Snap Shot کی طرح میرے ذہن پر نقش تھیں۔

''الوداع سنگاپور'' ہاں' اس عظیم الشان شہر کی سیکڑوں فلک بوس عمارتیں تھیں۔ ان ''سیکڑوں سیکڑوں'' عمارتوں کی ہزار ہا کھڑکیوں میں زندگی اَن گنت کیفیتوں میں حرکت کر رہی تھی۔ اور میں اس شہر کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ کچھ نہایت شیریں' کچھ نہایت تلخ یادیں اپنے دامن میں سمیٹ کر۔

سنگاپور دور رہ گیا تو میں نے ایک بار پھر اسے گھوم کر دیکھا۔ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس شہر میں واقعی جان ینگ نام کا ایک دہشت ناک غنڈہ موجود ہے۔ اور میں نے واقعی باہوش وحواس اس غنڈے کو اپنی بانہوں میں جکڑا تھا' اور بھینچا تھا اور وحشت سے دھکیل کر ایک صوفے پر پھینکا تھا...... ہاں' میں نے کیا تھا یہ سب کچھ۔

☆......☆......☆

اس کے بعد کے کچھ واقعات میں ذرا اختصار سے بیان کروں گا۔ میں لاہور اپنے گھر واپس پہنچا تو امی ابو اور بھائی کا رویہ کچھ کھچا کھچا تھا۔ خاص طور سے امی دل گرفتہ نظر آتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ میری غیر موجودگی میں گھر والوں کو یہ علم ہو گیا تھا کہ میں ملائشیا کام کی تلاش میں نہیں گیا تھا۔ بلکہ یہ سفر کسی انڈین لڑکی کے سلسلے میں تھا۔ اور لڑکی بھی ایسی جو غیر مذہب کی ہے۔

ظاہر ہے کہ میرے خلاف یہ ماحول ارباز نے ہی پیدا کیا تھا۔ اس کے سوا کسی کو ''انڈین لڑکی'' کے بارے میں بھلا کیا معلوم تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ ارباز نے یہ بات واشگاف الفاظ میں نہیں کہی ہو گی۔ حسب عادت اشاروں کنائیوں میں یا کسی کے توسط سے اس نے یہ بات میرے اہل خانہ تک پہنچا دی تھی۔ سنگاپور میں ارباز سے میری جو ٹیلی فونک بات ہوئی تھی۔ اس میں ارباز نے ایک زہریلا فقرہ کہا تھا اور یہ فقرہ ابھی تک میرے کانوں میں گونجتا تھا۔ اس نے کہا تھا...... دامی! اگر امریتا کے حوالے سے تمہاری کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تو تم فوراً پاکستان واپس آ جاؤ۔

اس فقرے نے اس کے سارے احساسات کی ترجمانی کر دی تھی۔

امی کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ ان سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ اپنے اور امریتا کے حوالے سے ہر بات صاف صاف ان تک پہنچا دوں گا۔ اور ان سے کہوں گا کہ اب میرے بارے میں وہ خود فیصلہ کریں اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ اپنی سب سے پیاری اور محترم ہستی سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ دل کی ہر واردات بلاتبصرہ ان کے سامنے بیان کر دی۔

انہوں نے سب کچھ بڑی رقت آمیز شفقت سے سنا۔ آخر میں وہ رونے لگیں۔ ''دامی! میں نے کیا سوچا تھا تیرے لئے اور یہ تو کس طرف چل پڑا ہے۔ دامی! یہ کیا ہوا ہے ہمارے ساتھ؟''

میں نے ان کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خود خبر نہیں امی! لیکن میں آپ کے سَر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ جب ہم انڈیا گئے تو میری دلی خواہش تھی کہ ارباز اور امریتا کسی طرح ایک ہو جائیں۔ میں نے ان دونوں کو ملانے کی سخت کوشش کی تھی۔ دیوانوں کی طرح جالندھر میں پھرتا رہا تھا۔ جب امریتا کی شادی طے ہو گئی تو میں نے ارباز کے ساتھ مل کر آنسو بہائے تھے۔ میں سچ کہتا ہوں امی! اس وقت دور دور تک میرے ذہن میں امریتا کے لئے اس طرح کا کوئی خیال نہیں تھا۔ یہ سب اس وقت ہوا جب امریتا ہماری وجہ سے مشکل میں پھنسی اور ارباز نے اس کی طرف سے آنکھیں بالکل بند کر لیں...... بالکل قطع تعلق کر لیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے آپوں آپ ہی وہ سب کچھ ہوتا چلا گیا جو مجھے امریتا کے قریب لے گیا۔''

امی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''کبھی ارباز نے تم سے اس بارے میں کوئی بات کی ہے؟''

''نہیں۔ وہ اس بارے، میں کچھ کہنا سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب آیا ہوں تو بات کروں گا۔ میری کوشش ہو گی کہ میری طرف سے اس کا دل صاف ہو۔''

''کبھی اس لڑکی نے ارباز کے بارے میں کچھ کہا؟''

''ہاں۔ جب ہم کرنیل کے فلیٹ میں تھے' ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔ ''دامی! کبھی کبھی سوچتی ہوں' کہیں میری طرف سے اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی۔ لیکن پھر اس کا جواب میرے من کے اندر سے ہی آتا ہے اور یہ جواب ''نہیں'' میں ہوتا

ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے مجھ سے پریم کیا ہی نہیں تھا اور نہ شاید میں نے کیا تھا۔ وہ تو بس ایک بے ڈھنگا سا چھ سات دن کا تعلق تھا جو جالندھر میں شروع ہو کر وہیں ختم ہوا۔ ارباز سے مل کر مجھے یہی لگا تھا کہ میں کسی اجنبی شخص سے ملی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ کوئی اور ہے۔ شاید اسے بھی ایسا ہی لگا ہو۔''

امی نے ایک گہری سانس لی۔ آنکھیں سوچ میں ڈوبی تھیں۔ ''اگر ارباز اور اس لڑکی کی شادی ہو جاتی تو پھر؟ میرا مطلب ہے' پھر تیری سوچ کیا ہوتی؟''

''تب کے بارے میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں امی۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ پھر امرت میرے لئے ایک عام لڑکی ہوتی۔ میں اسے ارباز کی بیوی کے طور پر ہی دیکھتا۔ لیکن اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ میرے دل میں کوئی ایسی بات پیدا ہوتی بھی تو اسے میرے دل کے اندر کہیں بہت گہرائی میں ہی رہنا تھا۔'' پھر میں نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''آپ تو مجھے جانتی ہیں نا امی! آپ کا کیا خیال ہے۔ ایسا ہوتا تو کیا ہوتا؟''

وہ ہولے سے بولیں۔ ''وہی ہوتا جو تو کہہ رہا ہے۔ تو ساری زندگی اپنے اندر گھلتا رہتا پر تیری زبان پر کچھ نہ آتا۔ میں جانتی ہو تیرے اندر بڑا صبر ہے۔''

''آپ کا بیٹا ہوں نا۔''

انہوں نے بھیگے لہجے میں کہا۔ ''شاید اوپر والے نے اسی لئے ہم ماں بیٹا کو اس سخت امتحان میں ڈالا ہے۔''

وہ خاموش ہو گئیں۔ میں بھی خاموش رہا۔ خاموشی گہری ہوئی تو وہ اندھی آواز میں بولیں۔ ''اب مجھے بتا' میں ارسہ اور اس کی ماں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''امی! میں جانتا ہوں' ارسہ اس گھر کی بہو بننا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ لیکن ایک بات میں آپ سے سچ سچ بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ ہم دونوں کے بیچ کوئی ایسا گہرا تعلق کبھی بھی نہیں رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے سنگاپور جانے کے بعد میرے بارے میں جو باتیں پھیلی ہیں ان سے ارسہ اور خالہ کو دکھ ہوا ہو گا۔ لیکن مجھے پتہ ہے کہ وہ بہت جلد نارمل بھی ہو جائیں گے۔''

''ابھی تک تو نہیں ہوئی ہیں نارمل۔'' امی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''دو تین ہفتے ہو گئے ہیں۔ وہاں سے کسی نے فون تک نہیں کیا ہے۔ میں فون کرتی ہوں تو

جواب نہیں ملتا۔‘‘

’’آپ خالہ کے پاس خود چلی جائیں نا۔ سنا ہے وہ کچھ بیمار بھی رہی ہیں۔‘‘

’’ہاں‘ دل تو چاہتا ہے۔ لیکن سوچتی ہوں وہاں گئی تو کوئی تلخ بات نہ ہو جائے۔ ابھی کچھ دن تک دیکھتی ہو‘ حالات کس رخ پر جاتے ہیں۔‘‘ امی نے کہا۔

ان کے لہجے میں امید کی موہوم سی کرنیں بھی تھیں۔ جیسے انہیں توقع ہو کہ شاید مستقبل قریب میں صورتحال میں مثبت تبدیلیاں آجائیں گی۔ کوئی ایسی صورت نکل آئے گی کہ وہ بہن کے سامنے سر اٹھا کر جا سکیں گی۔

ابو مجھ سے زیادہ بات نہیں کر رہے تھے۔ میں جتنی بات کرتا تھا‘ بس اس کا جواب دیتے تھے۔ اور وہ بھی خراب موڈ میں۔ بڑے بھائی کا بھی یہی حال تھا۔ ان دونوں کی خفگی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ مجھے ماسٹرز کئے اب قریباً دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ابھی تک میں ایک پیسہ بھی کما کر گھر نہیں لا سکا تھا۔ اب اوپر سے یہ امریتا والا معاملہ ہو گیا تھا۔ میں ملائشیا گیا تو ابو نے اپنی جیب سے 20 ہزار روپیہ دیا تھا۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس والوں کی قسط انہوں نے کسی سے ادھار لے کر ادا کی تھی۔ بھائی کی مالی پوزیشن بھی اچھی نہیں تھی۔ ان کے سسر ہارٹ کے مریض تھے۔ ان کا بائی پاس متوقع تھا۔ ان کے علاج کی ساری ذمے داری بھی بھائی پر پڑی ہوئی تھی۔

میں ان حالات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اور پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ اب میں ان حالات کو بدل سکوں گا۔ یہ ایک انوکھا عزم تھا۔ ایک انجانی سی تحریک تھی۔ میں خود کو بالکل نیا محسوس کر رہا تھا۔ تازہ دم اور پرجوش۔ یہ کیسی توانائی تھی؟ ہاں یہ وہی توانائی تھی جس کا اولین تجربہ مجھے ہوٹل براڈوے کے نواح میں ہوا تھا۔ اپنی امریتا کو جابر ہاتھوں کے جبر سے بچانے کے لئے میں اپنی توانائیوں کو جھٹک کر عقاب کی طرح ملائی غنڈوں پر جھپٹا تھا۔ پھر ایسا ایک دوسرا تجربہ سرنگون روڈ کے ہوٹل تاج میں ہوا تھا۔ اسی بے نام توانائی نے مجھے امریتا اور ’’سنگاپور کے نامی بدمعاش‘‘ کے بیچ دیوار بنا دیا تھا۔ اب یہی توانائی ایک بار پھر میری نس نس میں دوڑ رہی تھی۔ میں کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ اپنے اردگرد پھیلی معاشی بدحالی سے ٹکرا کر اسے ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا۔ میں اپنے لئے ایک ایسا راستہ بنانا چاہتا تھا‘ جو معاشی آسودگی اور خوشحالی کی طرف جاتا ہو۔ میں اپنے لئے‘

اپنے اہل خانہ کے لئے اور سب سے بڑھ کر امریتا کے لئے روشن تر زندگی کا خواہاں تھا۔ میں جانتا تھا میری طرح امریتا بھی ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسی ’’سفید پوشی‘‘ جس کی سرحدیں غیر محسوس طور پر مفلسی کے ساتھ ملا کرتی ہیں۔ میں امریتا کو مفلسی کے ایک دائرے سے نکال کر دوسرے دائرے میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ میری تمنا تھی‘ میں اپنے ہاتھ تب اس کی طرف بڑھاؤں جب میرے اردگرد تنگدستی کے بادل مکمل طور پر چھٹ چکے ہوں۔

نوکری کی تلاش میں دفتروں کے چکر تو میں پہلے بھی کاٹا کرتا تھا لیکن اب اس مہم پر نکلا تو مجھے لگا کہ کوئی ان دیکھی طاقت میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ میں خود کو پہلے سے کہیں مضبوط اور پراعتماد محسوس کر رہا تھا۔ دو پرائیویٹ فرموں میں میرے دو پہلے انٹرویوز بڑے اچھے رہے۔ پھر مرے کالج سیالکوٹ میں ایک لیکچرار کی خالی آسامی کے لئے اپلائی کیا تو وہاں بھی امید کی کرنیں نظر آئیں۔ اسی دوران میں کالج کے زمانے کا ایک پرانا دوست ملا۔ وہ شاہدرہ کے علاقے میں ایک اکیڈمی چلا رہا تھا۔ اب وہ اکیڈمی کی اور ایک برانچ لوئر مال کے علاقے میں کھولنا چاہتا تھا۔ یہاں مڈل سے گریجوایشن تک کی کلاسیں ہونا تھیں۔ میرا اس سے رابطہ ہوا اور اس نے کہا کہ وہ اس نئی برانچ کے حوالے سے مجھے اہم ذمے داری سونپے گا۔

میں صبح ہلکا سا ناشتہ کر کے گھر سے نکلتا تھا اور رات گئے واپس آتا تھا۔ اس دوران میں انڈیا سے امریتا کا پہلا خط آ گیا۔

اس نے لکھا تھا۔ ’’تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ خط روانہ کر رہی ہوں۔ یہاں چند دن حالات کچھ اپ سیٹ رہے۔ اب سب نارمل ہے۔ باؤ جی بھی Stable ہو رہے ہیں۔ کل کہہ رہے تھے‘ میرا گھومنے پھرنے کو جی چاہتا ہے۔ پہلے گردوارہ پادشاہی گئے۔ پھر بڑی جامع مسجد گئے‘ پھر تلسی مندر کا چھوٹا سا راؤنڈ لگایا۔ ان کا گھومنا پھرنا اسی طرح کا ہوتا ہے۔ حسب وعدہ اپنے کمرے میں اس کھڑکی میں بیٹھی ہوں جو تمہارے لاہور کی طرف کھلتی ہے۔ آسمان پر شام کا شفق رنگ پھیلا ہوا ہے۔ تمہاری شکل نگاہوں میں ہے۔ من کانپ رہا ہے۔ پتہ نہیں کیوں وہ شعر یاد آ رہا ہے۔

میں ایک پھول تھا‘ وہ مجھے رکھ کے بھول گیا

تمام عمر اسی کی کتاب میں گزری
من ڈرتا ہے کہ کہیں مجھے بھی کوئی کتاب میں رکھ کر بھول نہ جائے......

......یہ ایک طویل خط تھا۔ اس خط کا اختتام ان الفاظ پر ہوا۔ ''......کل شام باؤ جی مجھ سے کہہ رہے تھے۔ پریشان کن سوچوں سے دھیان ہٹانے کے لئے کچھ پڑھا کرو۔ انہوں نے مجھے ٹیگور کا ایک ناول اپنی الماری سے نکال کر دیا ہے۔ میں کل رات گئے تک ناول سامنے رکھے بیٹھی رہی۔ کچھ بھی پڑھا نہیں گیا۔ اس موقع کے لئے ایک شعر ہے۔ مگر لکھتے ہوئے شرم بھی آ رہی ہے۔ اوں......اوں......اچھا نہیں لکھتی۔ اچھا لکھ ہی دیتی ہوں۔

بس ایک چہرہ کتابی نظر میں ہے ناصر
کسی کتاب سے میں استفادہ کیا کرتا

خدا حافظ۔ ست سری اکال۔ تمہارے جواب کا انتظار رہے گا۔

میں نے بھی تفصیلی خط لکھا۔ یہاں کے حالات کا ذکر کیا اور روزگار کے سلسلے میں جو کوششیں میں کر رہا تھا اس کی تفصیل بیان کی۔ پتہ نہیں کیوں آخر میں میں نے اپنا وہی خط کوٹ کر دیا جو 82ء کی اس پر بہار شام کو پہلی بار امریتا کو لکھا تھا۔ میرے اور امریتا کے تعلق میں اس خط کا بہت ہی اہم مقام تھا۔ وہ شاعری نہیں تھی۔ لیکن اس نے شاعری ہی کی طرح ہم دونوں کے دلوں پر اثر کیا تھا اور ہمیں ایک انمٹ رشتے میں باندھا تھا۔

''آج لاہور کی اس خوش رنگ شام میں' اپنے گھر کی چھت پر' اپنے لفظوں میں سما کر آپ مجھ سے ملی ہیں۔ میں نے آپ کو محسوس کیا ہے۔ یہ کاغذ پر لکھے لفظ بھی کیا چیز ہوتے ہیں امریتا۔ کہنے کو ساکت' و جامد ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں دنیا جہان کے رنگ' ذائقے' لمس اور جذبے حرکت کرتے ہیں۔ یہ سوچوں اور مزاجوں کا آئینہ بن کر انجانے لوگوں کو ایک دوسرے سے یوں منسلک کر دیتے ہیں۔ جیسے وہ زمانوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ پہلے پہل میں نے کہاں دیکھا تھا آپ کو؟ شاید ساون کی پہلی بارش میں......شاید......سرما کی اس دھوپ میں جو کئی دن کے بعد نکلی تھی' یا گرمیوں کی ایک ٹھنڈی چاندنی رات میں' یا......'' اور میں لکھتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

میرے دیرینہ دوست ابرار شاہ نے اکیڈمی کی نئی برانچ کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ دس ہزار روپے ماہانہ کرائے پر ایک اچھی بلڈنگ حاصل کر لی گئی تھی۔ ابرار مجھے اس برانچ کا چارج سونپنا چاہ رہا تھا۔ یہ بڑی خوش آئند پیش رفت تھی۔ ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کا سکوپ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ بہت دنوں سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ دو افراد سے ملاقات کروں۔ ایک ارباز اور دوسرے ارسہ۔ جس طرح میں نے ای سے ہر بات کھل کر بیان کر دی تھی۔ اسی طرح میں ارباز سے بھی زیادہ کچھ چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ میں ایک ہمراز دوست کی طرح اپنی ساری دلی واردات اسے بتا دینا چاہتا تھا۔ جہاں جہاں مجھ سے غلطی ہوئی اس کا اقرار بھی کرنا چاہتا تھا۔ اور معافی بھی مانگنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اگر خالہ' خالو اجازت دیتے تو میں ارسہ سے بھی کھلے دل کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔

پہلے میں ارباز کی طرف روانہ ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ سوموار کا دن تھا۔ مجھے علم تھا کہ سوموار کی شام ارباز ''جم'' نہیں جاتا اور اکثر گھر میں ہی ہوتا ہے۔

میں اپنے دوست ابرار کی موٹر سائیکل پر نکلا۔ راستے میں میں وہ الفاظ ڈھونڈتا جا رہا تھا۔ جن میں مجھے ارباز سے بات کرنا تھی۔ اور اس کے سوالات کے جواب دینا تھے۔ سنگاپور سے لاہور آتے ہی مجھے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ارباز کے ڈیڈی...... انکل نفیس نے اس کی منگنی اپنے ایک کاروباری دوست کی بیٹی کے ساتھ طے کر دی ہے۔ یہ کراچی کے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ توقع تھی کہ لڑکی اپنے ساتھ وراثت میں ''لاہور فیکٹری ایریا'' کا ایک بڑا پلاٹ بھی لے کر آئے گی۔

میں ارباز کے گھر پہنچا۔ اس کی نئی سرخ ٹویوٹا کار گیراج میں کھڑی تھی۔ ان ٹچ اور اسکریچ فری۔ انکل نفیس گھر میں نہیں تھے۔ آنٹی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سرد مہری سے بات کی اور بتایا کہ ارباز اوپر اپنے کمرے میں ہے۔ ارباز کے بھائی نے بھی بس سلام لینے پر ہی اکتفا کیا۔

میں اوپر پہنچا۔ دروازے پر دو تین بار دستک دی۔ آخر دروازہ کھلا اور ارباز کی صورت نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا۔ ایک سیکنڈ کے لئے لگا کہ وہ دروازہ بند کر دے

گا۔ پھر شاید اس سے اتنی جلدی اتنی زیادہ بے مروتی نہیں ہو سکی۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا۔ گلے لگنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا موڈ دیکھ کر گلے لگنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میں پیشکش کے بغیر ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کیا حال ہے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں...... شاپ سے فون آیا تھا۔ وہیں پر جا رہا ہوں۔ ابو تو کراچی گئے ہوئے ہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ پیچھا چھڑانے کے لئے شاپ کا بہانہ کر رہا ہے۔ میری آمد سے پہلے وہ بڑے ایزی موڈ میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''دس پندرہ منٹ نہیں دو گے مجھے؟'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''کیا کہنا ہے؟''

''یار! ضروری تو نہیں کہ کچھ کہنا ہی ہو۔ اتنے دنوں بعد ملے ہیں۔ کیا ہم ایک آدھ گھنٹا اکٹھے بیٹھ بھی نہیں سکتے۔''

اس کا چہرہ ایکدم سرخ ہو گیا۔ میری طرف سے رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

''جو باتیں تم کرنے آئے ہو وہ میں سننا نہیں چاہتا اور نہ ہی میرے پاس وقت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب کا پوسٹ مارٹم نہ کرو۔'' وہ مجھے دیکھ کر قہر سے بولا۔ ''بس جو کچھ ہو چکا ہے اس پر مٹی ڈال دو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ میں یہ گندا چیپٹر بند کر چکا ہوں۔'' اس کے آخری الفاظ تیر کی طرح میرے سینے پر لگے۔ میں نے کہا۔ ''ارباز! سنو تو سہی میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ پھنکارا۔ ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم میرے سچے کھرے دوست ہو۔ چراغ لے کر ڈھونڈوں گا تو بھی پورے پاکستان میں تم جیسا خیر خواہ مجھے نہیں ملے گا۔ اور امریتا تمہاری بہن تھی۔ تم اسے بہن سمجھ کر خط لکھا کرتے تھے۔ پھر میں تمہیں بہنوئی کے طور پر اچھا لگا۔ تم نے امریتا مجھے سونپ دی۔ لیکن پھر جب تم نے دیکھا کہ وہ مشکل میں پھنس گئی ہے اور میں اس سے بے وفائی کر کے اس سے پیچھے ہٹ گیا ہوں تو تم نے مجبوراً اپنے لئے دوسرا کردار ڈھونڈا۔ تم محبوب کی حیثیت سے سامنے آئے اور امریتا کی کشتی کو

ظالم طوفانوں سے نکال کر کنارے پر لے آئے۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناں تم؟''

''خدا کے لئے ارباز...... خدا کے لئے۔ میری بات تو سنو۔''

''میں سن چکا ہوں۔ سن چکا ہوں میں۔ میں کوئی دو سال کا بچہ نہیں ہوں' نہ ہی روٹی کو چوچی کہتا ہوں۔ جانتا ہوں میں۔ تیری یاری نبہت پہلے سے تھی اس دغاباز کے ساتھ۔ لیکن ادھر تو نے ارسہ پر بھی پوری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ ارسہ حاضر تھی اور وہ کمینی انڈیا میں بیٹھی تھی۔ تیرے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ انگور کھٹے سمجھ کر تو مجھے بیچ میں لے آیا اور زبردستی میرا اس سے رابطہ کرا دیا۔ لیکن جب تو میرے ساتھ میرا خیر خواہ بن کر انڈیا گیا اور تو نے اس کی لشک پشک دیکھی تو تو بے ایمان ہو گیا۔ تیرا ''عشق'' پھر سے انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ تو اوپر سے تو میرا یار رہا۔ لیکن اندر سے یار مار بن گیا۔ اس کے بعد تو نے جو بھی قدم اٹھایا وہ اپنی حرص ہوس کے لئے اٹھایا۔ مجھے یقین ہے' اگر وہ حرامزادی چپ چاپ گائے بکری کی طرح شادی کے منڈپ پر بیٹھ گئی تھی تو یہ بھی تیرا ہی کیا دھرا تھا۔ میں اندھا نہیں ہوں' سب کچھ نظر آ گیا ہے مجھے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر اور تیرے ساتھ اس پر بھی۔'' وہ تیزی سے باتھ روم میں گھس گیا اور دروازے کو بڑے زور سے بند کر دیا۔

میں سکتے کی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ دل رو رہا تھا اور شاید پورا جسم رو رہا تھا۔ جو شخص کچھ سن ہی نہیں رہا تھا' میں اسے بتاتا کیا' اسے سمجھاتا کیا۔ میرے دل کی گہرائی میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس پسٹل ہو اور میں اپنی کنپٹی میں گولی اتار کر یہیں ارباز کی دہلیز پر ٹھنڈا ہو جاؤں اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں نکل جاؤں۔ دور بہت دور' کبھی واپس نہ آؤں۔ جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے اس کی قرار واقعی سزا پاؤں' میں بیٹھا رہا۔ وہ باہر نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ میں انتظار کر کر کے واپس چلا جاؤں۔ لیکن میں جانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں اس کے پاؤں پر سر رکھ کر بھی اسے منانا چاہتا تھا۔ میں نے دیکھا کمرے میں ایک خوبرو لڑکی کی تین چار بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں۔ یہ وہی تھی جس کے ساتھ ارباز کی شادی ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک نسبتاً چھوٹی تصویر ارباز کی میز پر تھی۔ اس فریم شدہ تصویر میں ارباز اور لڑکی زرق برق لباس میں پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ یقیناً یہ تصویر ارباز کی

پرشکوہ منگنی کی تھی...... میں ارباز کا انتظار کرتا رہا۔

......قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ بگولے کی طرح باتھ روم سے نکلا۔ اس نے کپڑے چینج کئے ہوئے تھے۔ میری طرف دیکھے بغیر اس نے کمرے کی لائٹ بند کی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''ارباز! میری بات سنو......'' اس نے نہیں سنی۔ میں بھی اس کے پیچھے کمرے سے نکلا۔ میں نہیں جانتا تھا' باہر کتنا بڑا حادثہ میرا منتظر تھا۔

ارباز کے قدم زینوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اس کا بازو تھاما۔ ''ارباز! خدا کے لئے میری بات سنو'' میرے الفاظ رو رہے تھے۔ اس نے بے حد طیش اور جھلاہٹ کے عالم میں خود کو چھڑانے کے لئے مجھے دھکیلا۔ میں ٹیرس کے حفاظتی جنگلے کے بالکل ساتھ کھڑا تھا۔ نیچے قریباً پچیس فٹ کی دوری پر سنگ مرمر کا فرش تھا۔ میں جنگلے سے ٹکرا کر ڈگمگایا۔ بائیں طرف ایک بوہن بیل کی موٹی شاخیں تھیں۔ میں نے اضطراری طور پر ان شاخوں کو تھامنا چاہا مگر ناکام رہا۔ ایکدم سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے تہہ و بالا ہو گیا۔ میں پہلے نیچے آرائشی فوارے کی نوکیلی سلاخوں پر گرا پھر فرش سے ٹکرا گیا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔



بعد کے چند دن میں جو کچھ تھا وہ ایک بھیانک سپنے جیسا تھا۔ مجھے لاہور جنرل اسپتال کے ایک کمرے میں ہوش آیا۔ میں نے دائیں ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پھر میں نے بائیں ہاتھ سے اپنے سر کو چھوا۔ ایک بڑی پٹی نے میرے سر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اپنے گرد شناسا چہرے دیکھے۔ ابو' بھائی جان' امی اور ارباز۔ ارباز پریشان چہرے کے ساتھ مجھ پر جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا۔ تب میں ایک بار پھر گہری غنودگی یا بے ہوشی کی حالت میں چلا گیا تھا۔

چند گھنٹے یا شاید ایک دو دن بعد میں نے خود کو ایک اور جگہ پر پایا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' یہ میو ہسپتال تھا۔ یہاں مجھے دائیں ٹانگ کے ایک بڑے آپریشن کے لئے لایا گیا تھا۔ میری اس ٹانگ میں پاؤں سے گھٹنے تک ملٹی پل فریکچر ہوئے تھے۔ کچھ یہی حالت دائیں بازو کی بھی تھی۔

میو ہسپتال میں آنے کے بعد بیماری اور علاج کا ایک طویل اور تکلیف دہ چکر شروع ہوا۔ میری دائیں ٹانگ اور دایاں بازو شدید طور پر زخمی ہوئے تھے۔ ایک لمبے آپریشن کے بعد میری پنڈلی کی دونوں ہڈیوں Tibia ...... اور Fibula کی مرمت کی گئی تھی اور نٹ بولٹ کسے گئے تھے۔ پنڈلی کی بڑی ہڈی "Tibia" میں جس جگہ پلیٹیں لگی تھیں۔ ایکسرے کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ پاؤں کی پیچیدہ ہڈیوں میں دو تین ہیئر لائن فریکچر بھی موجود ہیں۔ زیادہ بری حالت میرے بازو کی تھی۔ قریباً 25 فٹ کی بلندی سے فرش پر گرنے سے پیشتر میں بری طرح آرائشی فوارے کے آہنی جنگلے سے ٹکرایا تھا۔ اس تصادم نے کہنی سے نیچے نیچے دائیں بازو کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ صرف بازو کی ہڈیاں ہی نہیں ٹوٹی تھیں گوشت اور پٹھے بھی بری طرح کچلے مسلے گئے تھے۔ گہرے زخموں

کی وجہ سے بازو کو ابھی آپریٹ نہیں کیا گیا تھا۔

ارباز اور اس کے گھر والے میری تیمارداری کو آ رہے تھے۔ خاص طور سے ارباز قریباً روزانہ ہی چکر لگاتا تھا۔ والد اور بھائی نے مجھ سے اس بات کی تصدیق چاہی کہ ارباز نے اپنے کمرے کے سامنے خود کو مجھ سے چھڑانا چاہا اور میں حادثاتی طور پر اوپر سے گر گیا۔ میں نے مکمل تصدیق کی‘ اور کہا کہ اس حادثے میں ارباز کا مطلق قصور نہیں۔ ارباز کے سامنے بھی میں نے یہ بات پورے اخلاص سے کہی۔ ہمارے مالی حالات پہلے ہی اچھے نہیں تھے۔ اب میرے علاج معالجے پر بھی روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ لیکن آس تھی کہ آنے والے دن بہتر ہوں گے اور میں اچھا ہو جاؤں گا۔ مگر جب سات آٹھ دن بعد میری طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی اور سینئر سرجن نے میرے بازو کے تفصیلی معائنے کے بعد یہ خبر سنائی کہ بازو میں زہر پھیلنا شروع ہو گیا ہے اور اسے کاٹنا پڑے گا تو مجھ پر اور اہل خانہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

یہ کوئی چھوٹا سانحہ نہیں تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال کو ذہن آسانی سے قبول نہیں کیا کرتا۔ میں ہرگز اپنے بازو سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اہل خانہ کی سوچ بھی یہی تھی۔ میں نے روتے ہوئے بڑے بھائی کی منت کی۔ ”بھائی! میرا بازو بچا لیں...... کسی بھی طرح...... کسی بھی طریقے سے...... کسی اور ڈاکٹر کو دکھا لیں‘ کسی اور ہسپتال چلے جائیں۔“

بڑے بھائی نے کہا۔ ”اب باہر کے ملک جانے سے تو ہم رہے۔ جو کوشش بھی کرنی ہے یہیں پر کرنی ہے۔ اور دای! میو اسپتال کے آرتھوپیڈک ڈاکٹر پورے ملک میں مانے ہوئے ہیں۔ وہ جو مشورہ دے رہے ہیں‘ غلط نہیں ہے۔ تمہارا ہاتھ بچاتے بچاتے ہم خدانخواستہ تمہاری زندگی سے محروم ہو جائیں تو یہ عقلمندی نہیں ہے۔“

...... اور پھر کاٹ دیا گیا میرا بازو۔ کہنی سے نیچے سے علیحدہ کر کے اور کسی پولیتھین بیگ میں ڈال کر کسی کوڑے وان میں پھینک دیا گیا۔ وہ میری زندگی کی المناک ترین گھڑیاں تھیں۔ میں اپنے بازو کی جگہ پر سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا ایک ٹنڈ دیکھ رہا تھا اور اس ٹنڈ کے ساتھ ساتھ میری مفلوج ٹانگ بھی اَن گنت بندھنوں میں جکڑی تھی۔

گرم آنسو میرے رخساروں پر پھیلنے لگے۔ اپنے کٹے بازو کو دیکھ کر سب سے

پہلے میرے ذہن میں امریتا کا ہی خیال آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ پتا نہیں کیوں ہر صدمے کے موقع پر سب سے پہلے وہی یاد آتی تھی۔ 25 فٹ کی بلندی سے فرش پر گرتے ہوئے وہی یاد آئی تھی‘ جنرل اسپتال میں ہوش میں آنے کے بعد اسی کا چہرہ نگاہوں میں گھوما تھا اور اب اپنے ادھورے جسم کو دیکھ کر بھی اسی کی سوگوار صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔

یہ کیا ہوا تھا میرے ساتھ؟ میں تو امریتا کی خاطر آسمان کے تارے توڑنا چاہ رہا تھا۔ اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر کے اس کے رستے میں کہکشاں بچھانا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ محبت کی بخشی ہوئی تمام توانائیوں کو بروئے کار لا کر اپنے اور اپنے پیاروں کے لئے ”نئی تقدیر“ لکھوں گا۔ اور یہ سب کچھ مجھے اپنی دسترس میں محسوس بھی ہو رہا تھا۔ مگر آغازِ پرواز میں ہی میں منہ کے بل زمین پر گرا تھا۔ آنکھوں میں سجے ہوئے سارے رنگین سپنے چکنا چور ہو گئے تھے۔

وہ بڑے اندوہناک شب و روز تھے۔ میں بدترین قنوطیت کا شکار ہو گیا۔ اکلوتے بازو میں منہ چھپا کر آنسو بہاتا اور چپ چاپ پڑا رہتا۔ اسپتال کا وارڈ ایک زنداں کی شکل اختیار کر گیا۔ حادثے کے اولین دنوں میں پیدا ہونے والا ہمدردی کا ریلا گزر گیا تھا۔ اب میرے تیماردار ایک ایک کر کے اوجھل ہو رہے تھے۔ سب سے پہلے تو ارباز ہی اوجھل ہوا۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ اس کے دل میں جو گرہ بیٹھی ہے۔ وہ مجھے ملنے والی بدترین ”سزا“ کے بعد بھی ڈھیلی نہیں پڑی تھی۔ اور وہ سزا بھی عجیب تھی۔ نہ میں کہہ سکتا تھا کہ یہ سزا مجھے ”دی گئی“ ہے‘ نہ کہہ سکتا تھا کہ اتفاقاً مجھے ”مل گئی“ ہے۔ ارباز نے بھی دانستہ نہیں گرایا تھا۔ لیکن یہ عمل مکمل طور پر غیر دانستہ بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی جذبات کے شدید ریلے میں دانستہ اور غیر دانستہ کی سرحدیں اس طرح باہم ملتی ہیں کہ انہیں جدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا میں اسے بھول جانا چاہتا تھا۔ ارباز کے علاوہ اب بڑے بھائی بھی کم کم آنا شروع ہو گئے تھے۔ بھابی نے تو شروع کے چند دنوں کے بعد صورت ہی نہیں دکھائی۔ ان کے پاس یہ معقول بہانہ بھی تھا کہ وہ اپنے والد کی تیمارداری کر رہے ہیں۔ ابو کی ”میرے ساتھ ناراضگی“ بھی ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد پھر بحال ہو گئی تھی۔ شفقت پدری اپنی جگہ لیکن تلخ حقائق اپنی جگہ تھے۔ اب ماں رہ گئی تھی۔ اور ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ سائے کی طرح آخر تک

اپنی اولاد کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ زندگی میں آنے والے سخت ترین مقامات پر بھی اپنے بچوں سے پیچھے نہیں ہٹتی۔

ماں ہمہ وقت میرے سرہانے موجود رہتی تھی۔ یقیناً چپکے چپکے میری بدنصیبیوں پر آنسو بھی بہاتی ہوگی۔ لیکن میرے سامنے وہ ایکدم پرامید نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔

انہی دنوں مجھے جالندھر کی امریتا کا ایک اور خط ملا۔ اس نے لکھا تھا۔

''بہت لمبا انتظار کرایا ہے تم نے۔ پندرہ تاریخ والے پتر کا جواب ابھی تک نہیں آیا۔ سوچتی تھی جب تک جواب نہیں آئے گا اگلا پتر نہیں لکھوں گی۔ لیکن اپنے ارادوں پر میرا بس ہی کہاں ہے۔ ارادے تو آزاد لوگوں کے ہوتے ہیں۔ میری آزادی کو تمہارے پریم نے اتنی موٹی زنجیریں پہنا رکھی ہیں کہ میں کسمسا بھی نہیں سکتی۔ بقول شاعر

کھینچ رکھا ہے مرے گرد ترے غم نے حصار
قید میں ہوں میں تمہاری' مرا زنداں تم ہو

کیا بات ہے جناب' کیا دوش ہوگیا ہے۔ پتر کیوں نہیں آرہا......

آگے جا کر اس نے ذرا شوخی کے انداز میں لکھا تھا...... سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں جب مرد خوشحال ہوتا ہے تو اس کی نظر خوب تر کی تلاش میں بھٹکنے لگتی ہے۔ تمہارے پچھلے پتر سے انداز ہو رہا تھا کہ تمہیں اچھی جاب ملنے والی ہے۔ کہیں زیادہ بڑے افسر تو نہیں لگ گئے ہو...... یہاں انڈیا میں تو نوجوان افسروں پر لڑکیاں پتنگوں کی طرح مَر مٹتی ہیں...... اور...... اور تم پر تو ایک مَر مٹنے والی پہلے سے موجود ہے...... تمہاری خالہ زاد۔ ہائے ربا...... تمہیں تو شاید غصہ لگ گیا ہے۔ منہ ایک دم لال ہوگیا ہے۔ اچھا بھئی شما چاہتی ہوں۔ دراصل پریم میں بندہ باؤلا سا ہو جاتا ہے۔

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا جو کہیں آپ کا دل بھی میری طرح

امریتا کے خط سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری بیماری کے دوران میں بھی اس کا ایک خط آیا تھا جو بوجوہ مجھے نہیں مل سکا۔ شاید وہ ابا جان یا بھائی عاصم کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ امریتا کا خط مجھے نہال کر دیا کرتا تھا۔ لیکن آج اس خط نے خوشی کی بجائے غم دیا۔

دل و دماغ پر پڑا ہوا بوجھ کئی گنا بڑھ گیا۔ میں نے جواب نہیں لکھا۔ میں لکھ بھی کیسے سکتا تھا۔ میں لکھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ اور قابل ہوتا بھی تو کیا لکھتا۔

قریباً ڈیڑھ ماہ بعد میں میو اسپتال کے آرتھوپیڈک وارڈ سے اپنے گھر واپس آ گیا۔ لیکن میں اپنے گھر نہیں آیا تھا۔ اب یہ کسی اور کا گھر تھا۔ بھائی اور ابو نے مالی مجبوریوں کے سبب یہ دس مرلے کا گھر فروخت کر دیا تھا۔ اب ہاؤس بلڈنگ فنانس والوں کو اس کی باقی اقساط نئے مالک نے ادا کرنا تھیں۔ نئے مالک سے مکان خالی کرنے کے لئے دو ماہ کی مہلت لی گئی تھی۔ بھائی عاصم اپنے سسرالیوں کے ہاں شفٹ ہونے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ والد صاحب اسی آبادی میں کرائے کا مکان ڈھونڈنے کی فکر میں تھے۔

بہت سے اور دکھوں کے ساتھ ساتھ اب ای کو گھر سے بے گھر ہونے کا دکھ بھی لاحق ہوگیا...... وہ اکثر گم سم رہتیں۔ انہی دنوں مجھے یہ حیران کرنے والی خبر ملی کہ ارسہ کی منگنی ہوگئی ہے اور صرف ایک ماہ بعد اس کی شادی ہو رہی ہے۔

خالہ خالو نے کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی اور چٹ منگنی پٹ بیاہ والا کام کیا تھا۔ شاید انہیں اندیشہ تھا کہ کسی روز میری والدہ جھولی پھیلا کر ان کی دہلیز پر پہنچ جائیں گی...... پرانے ناتوں کا حوالہ دیں گی اور میری معذوریوں کے لئے بیساکھی حاصل کرنے کی کوشش کریں گی۔

اور شاید ان کے اندیشے ٹھیک ہی تھے۔ کسی وقت مجھے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں ای کی مامتا انہیں دھکیل کر میرے لئے خالہ کی دہلیز پر نہ پہنچا دے۔ اگر ایسا ہوتا تو توہین اور رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہونا تھا۔ ارسہ بھی بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر بڑی تیزی سے بدلی تھی۔ سنگاپور سے میرے واپس آنے کے بعد اس نے ایک بار بھی مجھ سے بلاواسطہ یا بالواسطہ رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی...... چلو جو ہوا اچھا ہی ہوا...... میں نے سوچا۔ میری بیساکھی بننے سے کہیں...... کہیں بہتر تھا کہ وہ کسی کی دلہن بن گئی تھی۔

''خوش رہو...... آباد رہو...... زندگی کی ساری خوشیاں پاؤ۔'' میرے دل کی گہرائیوں سے اس کے لئے دعا نکلی۔

لیکن امی کے لئے یہ سب کچھ جھیلنا کافی دشوار ثابت ہوا۔ وہ کئی دن تک چپکے چپکے آنسو بہاتی رہیں۔ انہوں نے ارسہ کا دکھ جھیلا اور میں نے ان کا دکھ جھیلا......

میرے بازو کا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ ٹانگ کا پلاسٹر بھی اتر چکا تھا۔ لیکن گھٹنے سے نیچے ٹانگ کی ٹوٹ پھوٹ کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ میرے لئے سہارے کے بغیر چلنا ناممکن تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں ساری ورزشیں کر رہا تھا۔ قوت ارادی سے بھی کام لے رہا تھا مگر بہتری کی رفتار معمولی تھی۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میرے جس بازو کے نیچے بیساکھی نے جگہ بنانی تھی وہ بازو ہی نہیں تھا۔ بیساکھی کو فقط بغل کے نیچے رکھنے سے ہی کام تو نہیں چلتا اسے مضبوطی سے تھامنا بھی پڑتا ہے۔ میرے نانا کی ایک پرانی ویل چیئر تھی' وہ میرے استعمال میں آ گئی۔ لیکن اسے بھی میں خود سے حرکت دینے کے قابل نہیں تھا۔

قریباً ڈیڑھ ماہ کے وقفے سے امریتا کا ایک اور خط آیا۔ اس خط میں امریتا روئی اور سسکیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس بے چاری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی جلدی خط و کتابت کی طرف سے بے خبر کیوں ہو گیا ہوں۔ ہمارے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ خط و کتابت ہی تھی۔ ٹیلی فون وغیرہ کی سہولت ان دنوں آسانی سے میسر نہیں تھی۔ میں نے یہ خط بھی درد کی بہت سی نشانیوں کے ساتھ ہی رکھ دیا۔

انہی دنوں ہم نے مکان تبدیل کیا اور کرائے کے نسبتاً چھوٹے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ والد صاحب نے کچھ قرضہ وغیرہ ادا کیا۔ کچھ رقم بھائی عاصم نے ان سے لے لی۔ کرائے کے مکان میں اٹھ کر بھی ہمارے معاشی حالات جوں کے توں ہی رہے۔ ایک دن پتہ چلا کہ ارباز کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو رہی ہے۔ ارباز مجھ سے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ملتا تھا۔ شادی پر بھی اس نے صرف کسی کے ہاتھ کارڈ بھجوانے پر ہی اکتفا کیا۔ جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ دیا ہو' نہ ہی آؤ تو اچھا ہے۔ میں نہیں گیا۔ انہی دنوں ''خان کلینک'' میں اپنے دیرینہ دوست ڈاکٹر جاوید امین کے مشورے پر میں نے اپنے لئے ایک خاص قسم کی لائٹ ویٹ بیساکھی بنوائی۔ میرے کٹے ہوئے بازو کا بالائی حصہ بیساکھی کے بالائی حصے سے منسلک ہو جاتا تھا اور مجھے چلنے کے لئے ضروری سپورٹ فراہم کرتا تھا۔ لیکن یہ چلنا بھی کیا چلنا تھا۔ اپنے آپ پر ترس آتا تھا۔

حادثے سے پہلے ابرار شاہ نے مجھے اکیڈمی کی ایک برانچ کی ذمے داری سونپنے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن حادثے کے بعد جہاں اور بہت کچھ بدلا وہاں ابرار کا پروگرام بھی بدل گیا۔ ایک روز کسی تیسرے شخص کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ایک ماہ پہلے ابرار کی اکیڈمی کام شروع کر چکی ہے۔ ابرار کے ایک کزن نے اس میں کچھ پیسہ لگایا ہے اور اس کا انتظام بھی وہی چلا رہا ہے۔ میں ایک اور آہ بھرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ مجھے ابرار سے بھی کوئی شکوہ نہیں تھا۔ ایک معذور شخص جو خود کو نہیں اٹھا پا رہا تھا' ایک ادارے کا بوجھ کیسے اٹھاتا۔

☆......☆......☆

والدہ کو ذیابیطس کی تکلیف بہت پرانی تھی۔ سن 80ء کے اوائل میں بھی وہ بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ بچنے کی صورت نظر نہیں آتی تھی لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے شفا دی۔ اب قریباً چار سال بعد بیماری نے پھر ان پر غلبہ پایا۔ پہلے جوتے کی رگڑ کے سبب پاؤں پر ایک زخم ہوا' اس زخم کے لئے تیز دوائیں کھائیں تو معدہ اور گردے متاثر ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ جیسے ریت مٹھی میں سے پھسل جاتی ہے اسی طرح ''مجھ اپاہج'' کی قیمتی ترین متاع بھی میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ وہ چلی گئیں۔ میرے اور اپنے سارے دکھوں سے منہ موڑ کر...... اگست 84ء کی اس حبس زدہ شام کو مجھے اپنی معذوریوں کا احساس اتنی شدت سے ہوا کہ جسم کا ہر ریشہ چیخ گیا۔ میں اپنی ماں کی چارپائی کو کندھا نہیں دے سکا تھا۔

اس دن میں بہت رویا تھا۔ ایک بچے کی طرح سسک سسک کر۔ اور آنسو بہانے کے لئے ایک مہربان شانہ بھی مہیا نہیں تھا مجھے۔ ماں کے جانے کے بعد مجھے چند دن پہلے کا ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ اس دن امریتا کا ایک اور خط آیا تھا۔ یہ خط ہمارے پہلے والے گھر کے پتے پر آیا تھا۔ وہاں سے امی لے آئیں۔ امی نے اپنے آنچل میں سے لفافہ نکال کر مجھے دیا تھا' اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی چلی گئی تھیں۔ پھر انہوں نے کہا تھا۔

''دامی! تو اب بھی اس کے خطوں کا انتظار کرتا ہے نا؟''

''نہیں امی۔''

"نہیں تو کرتا ہے۔ تیری آنکھیں کہتی ہیں۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی انتظار کرتا ہے۔"

"پتہ نہیں امی۔"

"تو اسے جواب کیوں نہیں دیتا۔ کیوں خود کو اور اسے اندھیرے میں رکھ رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے امی! میں کسی دن لکھوں گا اسے...... سب کچھ بتا دوں گا۔"

"ابھی لکھ دے۔ سچ بولنے میں دیر نہیں کرتے۔"

"اچھا امی! لکھ دوں گا۔"

وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی تھیں۔ "مجھے نہیں لگتا دامی! کہ تو لکھے گا۔ پتہ نہیں تو کیا چاہتا ہے۔ کیوں اس گورکھ دھندے میں الجھا رہنا چاہتا ہے۔"

میں نے دل میں کہا تھا۔

تم مانگتے ہو مجھ سے' میری آخری خواہش
بچہ تو کبھی اپنے کھلونے نہیں دیتا

ماں نے میرا سر اپنی مہربان آغوش میں رکھ لیا تھا اور رونے لگی تھی۔ اب وہ مہربان آغوش نہیں رہی تھی۔ وہ آنسو بھی نہیں رہے تھے۔ بس کانوں میں گونجتی ہوئی آوازیں رہ گئی تھیں۔

میں نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ امریتا کو کم از کم ایک بار خط ضرور لکھوں گا۔

ماں کے جانے کے بعد میں نے یہ وعدہ پورا کیا۔ ایک دن میں گھر کی چھت پر چلا گیا۔ یہ وہ چھت نہیں تھی جس پر بیٹھ کر میں نے امریتا کو پہلا خط لکھا تھا' لیکن یہ شام تو ویسی ہی تھی۔ یہ فضا بھی وہی تھی۔ آسمان پر شفق کے رنگ' پرندوں کی قطاریں اور اکا دکا پتنگوں کا رقص بھی وہی تھا۔ پہلا خط بہت طویل تھا لیکن یہ آخری خط مختصر تھا۔ شاخ اور کونپل کا ملاپ ایک طویل عمل ہے لیکن جدائی ایک لمحے میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ میں نے لکھا۔

"امرت! بے شک لفظوں میں بڑی طاقت ہے' لیکن کچھ واقعات میں لفظوں سے بڑھ کر طاقت ہوتی ہے۔ یہ ان کے مفہوم بدل دیتے ہیں۔ شکیپیئر نے دنیا کو اسٹیج

اور انسانوں کو "ڈرامے کے کردار" کہا تھا۔ کبھی کبھی یہ کردار پتلی تماشا کے کردار بن جاتے ہیں۔ نادیدہ ہاتھ کی نادیدہ ڈوریں انہیں اپنی مرضی سے حرکت میں لاتی ہیں۔ حرکت کرنے والوں کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ یہاں آ کر حالات کچھ ایسے ہوئے ہیں کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ سب کچھ تہہ و بالا ہو گیا ہے۔ میں تمہیں تفصیل بتا کر مزید رنجور کرنا نہیں چاہتا......

ہاں امرت! میں اپنے اور تمہارے درمیان جدائی کے سائے دیکھ رہا ہوں۔ ان سایوں کی "وید" دکھ دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ اس بات کا یقین بھی ہو جاتا ہے کہ ہماری محبت سچی تھی۔ کیونکہ جدائیوں کا تحفہ تو سچی محبت کرنے والوں کو ہی ملتا ہے۔

لکھنے کو بہت کچھ ہے۔ لیکن دلاسا دینے کو کچھ بھی نہیں۔ اگر حالات میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی تو تمہیں آگاہ کروں گا۔ فی الحال اجازت۔ باؤجی اور شانتی کو میری طرف سے بہت سلام۔ خدا حافظ

میں نے خط پوسٹ کر دیا۔ اس خط کے بعد پورے چار ماہ تک امریتا کا کوئی خط نہیں آیا۔ پھر ایک دن پرانے گھر والی آنٹی نے انڈیا سے آنے والا خط لا کر مجھے دیا۔ یہ امریتا کی طرف ہی سے تھا۔ خط کے الفاظ سسکیاں بھرتے محسوس ہوئے تھے۔

"کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان اتنا کٹھور' اتنا بے رحم ہو سکتا ہے۔ پچھلے چار ماہ میں میں نے ہر ہر پل تمہارے پتر کا انتظار کیا ہے۔ ہر آہٹ پر دروازے کی طرف بھاگتی رہی ہوں۔ پوسٹ آفس کے چکر لگائے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں کس طرح دیوانوں کی طرح پھرتی رہی ہوں۔ لیکن تمہیں بتانے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ تم تو شاید دور نکل گئے ہو۔ سوچتی تھی جب تک تمہارا پتر نہیں آئے گا میں بھی نہیں لکھوں گی۔ اپنی طرف سے۔ تم سے روٹھی ہوئی تھی۔ تمہیں غصہ دکھا رہی تھی۔ بے وقوف ہوں۔ پتہ نہیں تھا تم تو میرے اور اپنے لکھے ہوئے سارے لفظوں پر سیاہ قلم پھیر چکے ہو۔

بس ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں تم سے۔ میں تو پہلے ہی اجڑی ہوئی تھی' برباد تھی۔ مجھے اور برباد کر کے کیا ملا تمہیں۔ کیوں آئے تھے میرے پیچھے وہاں سنگاپور میں؟

مجھے مرجانے دیا ہوتا وہاں ان غنڈوں کے بیچ میں۔ وہیں پر کہیں کسی شمشان میں میری چتا جل گئی ہوتی۔ خاک بہہ گئی ہوتی میری' وہاں کسی ساحل پر۔ یوں تمہارے پتر کے انتظار میں رو رو کر اندھی تو نہ ہوتی۔ دن رات گھل گھل کر تو نہ مرتی...... کیا ملا تمہیں' مجھے دوسری مرتبہ اجاڑ کر۔

بڑے بے رحم ہو۔ مجھ پر ذرا ترس نہ کھایا۔ ذرا سا ترس کھا لیتے تو مجھے کہہ دیتے...... تم میرے لائق نہیں ہو۔ تم ایک رانڈ ہو۔ تمہیں کوئی رنڈوا بیاہے گا' یا سارا جیون اکیلے گزارو گی۔ تمہیں کوئی ادھیکار نہیں ہے عام لڑکیوں کی طرح سوچنے کا اور سپنے دیکھنے کا۔ جاؤ اپنے جالندھر میں اور اپنی اوقات کے مطابق جیو...... میں لاہور جا رہا ہوں اور اپنی حیثیت کے مطابق جیوں گا...... وہاں میری خالہ زاد میرا انتظار کر رہی ہے۔

کاش مجھ پر ترس کھاتے اور مجھ سے کہہ دیتے یہ سب کچھ...... کاش۔''

یہ جالندھر کی امریتا کا آخری خط تھا۔ اس کے بعد اس کا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ نہ ہی اس کی کوئی خبر مجھ تک پہنچی۔

اس خط کے آنے کے دو تین ماہ بعد تک میں لاہور میں ہی رہا۔ ماں کے جانے کے بعد سب کچھ پرایا لگتا تھا۔ ہر شے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ قبرستان جا کر پہروں ماں کے سرہانے بیٹھا رہتا تھا۔ انہی دنوں والد صاحب نے ملازمت بھی چھوڑ دی۔ بھائی عاصم نے سبزہ زار میں پانچ مرلے کا اپنا مکان بنا لیا تھا۔ انہوں نے والد صاحب سے کہا کہ وہ کرائے کا مکان چھوڑ دیں اور ان کے پاس رہنے کے لئے آ جائیں۔ میں سمجھ گیا کہ اب میرے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بھائی کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا' ہاں ابو کے دل میں میرے لئے چاہت موجود تھی' لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں ان پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ ایک روز میں نے اپنے اکلوتے ہاتھ سے دیر تک اپنے ابوجی کے پاؤں دبائے...... قبرستان میں جا کر دیر تک ماں کی ڈھیری کے پاس بیٹھا رہا اور پھر کراچی چلا گیا۔ کراچی میں میرے ایک دوست تنویر رضا صاحب تھے۔ وہ پہلے فوم کی ایک ایجنسی میں ملازمت کرتے تھے۔ اب انہوں نے اپنا ایک بڑا سا ''پی سی او'' بنایا ہوا تھا اس کے علاوہ انہیں لکھنے لکھانے کا شوق بھی تھا۔ وہ اکثر مجھے کراچی آنے کے لئے کہتے رہتے تھے۔

تنویر صاحب نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے دو منزلہ گھر کی ایک بیٹھک مجھے رہنے کے لئے دے دی...... اور کوشش کرنے لگے کہ مجھے کوئی چھوٹا موٹا روزگار میسر ہو سکے۔ میں نے اب بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق کر لی تھی۔ تنویر صاحب نے ایک دن مجھے دو تین انگلش میگزین لا کر دیئے اور مجھ سے کہا کہ میں فلاں فلاں آرٹیکل کا اردو ترجمہ کروں۔ میں نے یہ کام شوق اور محنت سے کیا۔ تنویر رضا صاحب کو میرا کیا ہوا ترجمہ پسند آیا۔ دس پندرہ روز بعد انہوں نے مجھے ایک اخبار کا جمعہ ایڈیشن لا کر دیا (ان دنوں جمعہ کی تعطیل ہوتی تھی اور جمعہ ایڈیشن چھپتے تھے) اس میگزین میں میرا' ترجمہ کیا ہوا آرٹیکل موجود تھا۔ یہ روس افغان جنگ کے حوالے سے تھا۔ عنوان تھا ''وادی پنج شیر کا شیر۔''

تنویر صاحب نے بتایا۔ میرے دو آرٹیکل اور چھپیں گے۔ ان تینوں کا معاوضہ انہوں نے چھ سو روپیہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں انگریزی مضامین اور فیچرز وغیرہ کے ترجمے کرنے لگا اور اس کے معاوضے سے میری گزر بسر ہونے لگی۔ میں نے کچھ بچت بھی کی اور بڑے اصرار کے ساتھ اپنے محسن تنویر صاحب کو بیٹھک نما کمرے کا کرایہ دینا شروع کر دیا۔ کسی وقت میرے کئے ہوئے تراجم پر میرا نام چھپتا تھا۔ کسی وقت نہیں چھپتا تھا۔ لیکن معاوضہ مجھے مل جاتا تھا۔ یہ کام میرے میلان کے عین مطابق تھا۔ سفید کاغذ پر لفظ اتارتے ہوئے مجھے عجیب سا سکون محسوس ہوتا تھا۔

میں نے لاہور سے قریباً ہر ناطہ توڑ لیا تھا۔ اور لاہور سے ناطہ توڑنے کا مطلب یہ تھا کہ ماضی سے میرا ناطہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے چند بار بھائی جان کے ایڈریس پر والد صاحب کو خط ضرور لکھا۔ مگر اپنا ایڈریس نہیں بتایا۔ دو بار فون پر بھی والد اور بھائی سے بات ہوئی۔ انہیں بس یہی معلوم تھا کہ میں کراچی میں کہیں رہتا ہوں...... اس طرح تین برس گزر گئے' مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ امریتا اب کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟ اور میں اس بارے میں جاننا چاہتا بھی نہیں تھا۔ میں اپنی کٹی پھٹی مفلس زندگی سے امریتا کو بہت دور رکھنا چاہتا تھا۔ امریتا کے بارے میں سوچتا تھا تو کسی وقت کسی شاعر کا کہا ہوا یہ سادہ سا شعر سماعت میں گونجنے لگتا تھا۔

"دو غریبوں کی دوستی کیسی
میرے آنگن میں چاندنی کیسی"

میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔تم نے پانچ سال پہلے اپنے اور امرت کے بیچ ارباز کو لاکر ایک سنگین جرم کیا۔اس جرم کی سزا میں تم اپاہج ہوئے۔لیکن یہ سزا ابھی قرار واقعی نہیں ہے۔ابھی تمہیں اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ بھگتنا ہوگا' اور تمہیں بھگتنا چاہئے۔یہ بات نہیں تھی کہ امریتا کے لئے اب دل میں محبت نہیں تھی۔یہ محبت موجود تھی۔بلکہ اب تو یہ جسم کے ایک ایک رگ ریشے میں رچ بس چکی تھی۔لیکن جب میں اپنے ٹوٹے پھوٹے جسم اور اپنی مفلوک الحالی کو دیکھتا تھا تو امریتا کو جسمانی طور پر پانے کی تڑپ ایکدم کہیں سینے کی گہرائی میں سو جاتی تھی۔اپنے حالات پر صبر سا آنے لگتا تھا۔دل سے آواز آتی تھی جس افسانے کو انجام تک لانے میں تمہاری عزت نفس مجروح ہوتی تھی اسے تم نے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑ دیا۔اچھا کیا۔محبت صرف ایک دوسرے کو پالینے کا نام ہی تو نہیں ہے۔ایک دوسرے کو کھو دینے کا نام بھی تو محبت ہے۔ راتوں کو پچھلے پہر چپکے چپکے آنسو بہانے کا نام بھی تو محبت ہے۔یہ دلنشیں احساس کتنا اہم ہے کہ دنیا میں کہیں کسی جگہ ایک ایسا شخص موجود ہے' جو آپ کو سوچتا ہے۔کچھ ان کہیاں اپنے سینے میں دبا کر آپ کے لئے آہ بھرتا ہے اور اس کی آنکھیں نم ہوتی ہیں۔

محبت کیا ہے؟ ایک انوکھا احساس ہے۔ایک ناقابل تشریح جذبہ ہے۔شاید اسی لئے ایک خوش رنگ پھول نے اس متجسس لڑکی سے کہا تھا' محبت کو کوئی نام نہ دو۔بس اسے اپنے دل کی اتھاہ گہرائی سے محسوس کرو۔دیکھو چاند سے جو نور کی کرن زمین تک آ رہی ہے وہ پیار ہے۔اور میری پتی پر شبنم کا جو موتی ٹھہرا ہوا ہے وہ پیار ہے۔

ہاں پیار ایسا ہی انوکھا جذبہ ہے۔اس میں ملن اور جدائی کا مطلب ایک ہی ہے۔یہ ان کیفیتوں سے ماورا ہوتا ہے۔نہ یہ ملنے سے کم ہوتا ہے' نہ جدا ہونے سے کم ہوتا ہے۔پانی کی فطرت بہنا' ہوا کی فرط حرکت کرنا اور روشنی کی فطرت پھیلنا ہے۔ ایسے ہی پیار کی فطرت بڑھنا اور گہرا ہونا ہے۔امریتا مجھ سے جدا ہوگئی تھی۔لیکن پیار تو جدا نہیں ہوا۔یہ بڑھتا اور گہرا ہوتا رہا...... یہ آج بھی بڑھ رہا ہے۔اور گہرا ہو رہا ہے۔ یہ آئندہ بھی بڑھتا اور گہرا ہوتے رہے گا اس لئے کہ سچے پیار کی فطرت میں بڑھوتی ہے۔یہ جدائی سے کم ہوتا ہے نہ ملاپ سے۔

اس سارے عرصے میں بس ایک اہم واقعہ ہوا ہے۔مجھے اپنے لاہور اور اپنے ماضی سے ناتہ توڑے تقریباً 4 سال ہوئے تھے۔میں کراچی میں تنویر رضا کے پاس رہا تھا۔وہ نومبر کی ایک چمکیلی سی دوپہر تھی۔میں اخبار دیکھ رہا تھا۔بالائی منزل سے بھابی (تنویر صاحب کی بیگم) نے آواز دی۔"دای! ٹی وی کھولو' پاکستان اور انڈیا کا میچ آ رہا ہے۔" میں بیساکھی کے بغیر ہی اٹھا اور لنگڑاتا ہوا ٹی وی سیٹ تک پہنچا...... یہ غالباً ریکارڈنگ تھی۔بڑا پھنسا ہوا میچ تھا۔عمران خان اور عبدالقادر بیٹنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف کپیل دیو اور مہندر امرناتھ کی بالنگ تھی۔پاکستان کو آخری چند اوورز میں قریباً 8 رنز فی اوور کی اوسط سے اسکور کرنا تھا۔پورا اسٹیڈیم جیسے پنجوں کے بل کھڑا تھا۔ ہر بال پر شور محشر برپا ہوتا تھا۔انڈیا کے ساتھ میچ میں ویسے بھی پاکستانیوں کے جذبات عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔عمران خان نے کریز سے نکل کر بلا بڑے زور سے گھمایا۔گیند فضا میں ایک بہت اونچا آرچ بناتی ہوئی باؤنڈری لائن سے باہر جا گری۔تماشائی ناچ ناچ کر اچھل اچھل کر بے حال ہو گئے۔ایک گیند کو مڈ آف کی طرف کھیل کر عمران خان اور قادر نے ایک رن لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔اگلی گیند پر گریٹ خان ایک بار پھر کریز سے باہر نکلا۔اس کے دلیرانہ شاٹ نے ایک بار پھر گیند کو فضاؤں میں بلند کیا اور باؤنڈری سے باہر ایک انکلوژر میں پھینک دیا۔تماشائی جوش و خروش سے دیوانے ہو گئے۔جیت اب چند قدم دوری پر تھی۔مخالف ٹیم حواس باختہ ہو رہی تھی...... بقیہ سفر تیزی سے طے ہوا۔آخری دو شاٹ لگے اور پاکستان یہ نہایت سنسنی خیز میچ جیت گیا۔تماشائی خوشی سے ناچ رہے تھے۔سنجیدہ قسم کے تماشائی اس شاندار فتح پر مسلسل تالیاں بجا رہے تھے۔ایسے موقعوں پر میرا دل بھی تالی بجانے کو چاہتا تھا۔لیکن تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔خوشی سے اچھلنے کے لئے بھی دونوں ٹانگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔میں لنگڑاتا ہوا دروازے تک گیا اور دروازہ کھولا۔سامنے تنویر صاحب کھڑے تھے۔ان کے گندمی چہرے پر ایک خاص رنگ تھا۔ جیسے ان کے پاس میرے لئے کوئی خاص خبر ہو۔ان کا ایک اخباری دوست بھی ان کے ساتھ تھا۔اس کے علاوہ ایک لڑکی تھی۔اس نے ایک لمبی پھول دار چادر اوڑھ رکھی تھی۔

اسی چادر میں اس کا چہرہ بھی چھپا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے سفید سینڈل اور شولڈر بیگ ہم رنگ تھے......

"دای! یہ آپ سے ملنے کے لئے آئی ہیں۔"

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے دروازے سے پیچھے ہٹ گیا۔ لڑکی اندر آ گئی اور اپنا شولڈر بیگ کرسی پر رکھ دیا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے تنویر رضا کی طرف دیکھا۔ وہ بولے۔ "آپ بات کریں ان سے۔"

اس کے ساتھ ہی تنویر صاحب باہر نکل گئے۔ میری چھٹی حس جیسے چونک سی گئی تھی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے مڑ کر چادر پوش لڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک ہی لمحے میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں زمین آسمان کے درمیان معلق ہو گیا ہوں۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں...... میرے سامنے صرف چار پانچ فٹ کے فاصلے پر امریتا کور کھڑی تھی۔

کتنی ہی دیر تک میں کچھ بول نہ سکا۔ پھر میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

"امریتا...... تم یہاں؟"

"وشواس نہیں ہو رہا؟" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"ہاں...... نن نہیں...... بب...... بیٹھو تم۔"

وہ بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر گہری گمبھیرتا نظر آ رہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح دلکش تھی۔ بس چہرہ جو پہلے زیادہ دبلا پتلا تھا ذرا بھر گیا تھا۔ وہ کیسے پہنچی تھی یہاں؟ سوہنی مہینوال والا پرآشوب دریا پار کر کے؟ اس نے کیسے ڈھونڈا تھا مجھے؟ وہ کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے؟ اَن گنت سوالات تھے۔ لیکن ان کے جوابات سوچنے کا وقت میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کانپ گیا۔ یہ آنکھیں رونے کے لئے بے قرار تھیں۔ جیسے ایک بہت بڑا طوفانی ریلا کسی بند کے پیچھے جمع ہو اور بس بہہ نکلنا چاہتا ہو۔ میں ایک مجرم کی طرح سکڑ سمٹ گیا۔ مجھے لگا جیسے میں صوفے میں ہمیشہ سے زیادہ دھنس گیا ہوں۔ اور مختصر نظر آنے لگا ہوں۔

وہ جلتی نظروں سے مجھے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ پھر طوفانی پانی کو روکنے والے

بند میں دراڑ پڑ گئی۔ اولین آنسو اس کے ریشمی رخساروں پر لڑھکنے لگا۔ وہ گمبھیر آواز میں بولی۔

"تم نے کیا سمجھا تھا مجھے...... بتاؤ تم نے کیا سمجھا تھا؟"

میں خاموش رہا۔ وہ طیش سے بولی۔ "چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں۔ پھر ذرا توقف سے پھنکاری، تم بولتے اس لئے نہیں کہ تم پڑھے لکھے جاہل ہو۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے......"

میرا سر کچھ اور جھک گیا۔ یوں لگا جیسے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ اور طیش سے بولی۔ "تمہارے نزدیک میں اتنی ہی کمینی تھی، ایسی ہی کم ذات تھی؟ اتنا ظرف بھی نہیں تھا میرے میں کہ تمہارے ساتھ ہونے والی ایک ورگھٹنا (حادثے) کو جھیل سکتی۔ بتاؤ میں اتنی ہی گھٹیا تھی؟"

میرے لب تھرائے۔ "نہیں امرت! ایسی بات نہیں تھی۔ دراصل...... میں......"

"دراصل تم معذور ہو گئے تھے۔ تمہاری ٹانگ نہیں رہی تھی، تمہارا بازو نہیں رہا تھا۔ تم نے سوچا، تم اب وہ دای نہیں ہو۔ میں تم پر تھوک دوں گی۔ تمہیں ٹھوکر مار کر چلی جاؤں گی...... اس لئے تم نے بلیدان دیا۔ یہی بات ہے نا، یہی ہے نا؟"

میرا سر جھکا تھا۔ وہ میری زبان بول رہی تھی۔ میرے دل کی بات کہہ رہی تھی۔ میرے تاثرات دیکھ کر وہ کچھ اور بھری۔ اس کی آنکھوں سے آتشیں آنسوؤں کے دھارے بہہ نکلے۔ چہرہ فرطِ غم سے لال بھبھوکا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں سوچا دای! کیا تم نے میرے جسم سے محبت کی تھی؟ بولو کیا تم نے بھی ایسا کیا تھا؟" اس نے اٹھ کر مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میری خستہ قمیص کا گریبان پھٹ گیا۔ اس نے میرے سر کے بالوں کو پکڑ کر میرا چہرہ جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ میرا سر عقب میں دیوار سے ٹکرایا۔ وہ مجھے ہیجانی انداز میں جھنجھوڑنے لگی، اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

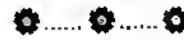
"کیا تم نے میرے شریر (جسم) سے محبت کی تھی۔ کیا تم نے میرے کنوارے پن کو چاہا تھا...... بولو، کیا ایسا کیا تھا تم نے...... بولو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تھا، تو میں کیسے کر سکتی تھی ایسا؟ میں تمہارے شریر کو اپنے اور تمہارے بیچ کیسے لا سکتی تھی۔ کیا اتنی کم

ظرف تھی میں؟ کیا اتنی نیچ تھی؟ بولتے کیوں نہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے ہو؟ میرے جیون کو پانچ سال کانٹوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر اب چپ کیوں ہو؟''

میری قمیص تار تار ہوگئی۔ میں صوفے پر ایک طرف کو جھک گیا۔ آنکھوں سے اشکوں کے دھارے بہہ نکلے۔ مجھے جھنجھوڑتے جھنجھوڑتے وہ ایکدم مجھ پر ڈھے سی گئی۔ نیم جان ہو کر جیسے میرے اوپر گر گئی۔ اس کا سینہ دلدوز ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ اس کے لمبے ریشمی بال کھل کر صوفے پر بکھر گئے تھے۔ کچھ دیر تک روتے رہنے کے بعد اس کے بازوؤں نے مجھے حصار میں لے لیا۔ مجھے اتنے زور سے بھینچا کہ میں اس کے جسم کا حصہ بن گیا۔ وہ میرے رخسار سے رخسار ملا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگی۔ اس کے آنسو میرے عریاں شانے کو دور تک بھگونے لگے۔ قمیص پھٹنے سے میرا کٹا ہوا بازو بھی کہنی تک عریاں تھا۔

چند لمحوں بعد امرت کو نجانے کیا ہوا۔ وہ بڑی بے تابی سے میرے کٹے ہوئے بدنما بازو کی طرف بڑھی اور اسے چومنے لگی۔ سامنے سے' دائیں بائیں سے۔ اس کے گرم آنسو اور نرم ہونٹ میرے بازو پر پھسلتے چلے گئے۔ پھر اس نے میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے گھٹنے کو چوما' بار بار چوما۔ تب وہ ایک بار پھر میرے سینے سے لگ گئی۔ میں سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

یہ عجیب لڑکی تھی۔ شعلہ بھی تھی' شبنم بھی۔ چٹان کی طرح مضبوط بھی اور پھول کی پتی سے بڑھ کر نازک بھی۔ اسے سمجھنا آسان نہیں تھا۔ میں اسے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا تو خود ہی الجھنے لگتا تھا۔ میں الجھتا چلا جا رہا تھا۔



وہ نومبر کی چمکیلی شام تھی۔ امریتا کی آنکھوں کے چڑھے ہوئے دریا اتر گئے تھے۔ میں اور وہ گھر کی چھت پر برساتی کے سامنے بیٹھے تھے۔ میرے اور امریتا کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ ان باتوں سے کئی انکشاف بھی ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک انکشاف یہ تھا کہ قریباً دو سال پہلے راکیش سنگاپور کی ایک جیل میں مر چکا ہے۔ اس بارے میں اطلاع یہ تھی کہ اسے کسی نے زہر کھلا دیا تھا۔ پرتاپ اور راج بھی مکمل طور پر منظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اس طرح کی کئی اور باتیں بھی امرت سے معلوم ہوئیں۔ امرت کی سہیلی لالہ (جو بعدازاں پرتاپ سنگھ کی مخبر ثابت ہوئی تھی) خانگی پریشانیوں کا شکار تھی۔ اور طلاق لے کر گھر بیٹھی ہوئی تھی۔ امرت سے سنگاپور کی گرماتا انڈین کے بارے میں بھی معلوم ہوا۔ وہ ''انوکھا کردار'' اسی آب و تاب سے سرگون میں موجود تھا۔ اس کی بیٹی مینا ایک بڑی ڈانسر کے طور پر ابھری تھی اور خوب دولت کما رہی تھی۔

اس گفتگو کے دوران میں امرت نے اپنا سفید شولڈر بیگ کھول کر مجھے اپنے سورگ باشی باؤجی کا ایک خط دکھایا (باؤجی قریباً ایک سال پہلے فوت ہوئے تھے) باؤجی کا خط خاصا طویل تھا۔ میں یہاں مختصراً بیان کرتا ہوں۔

''بیٹا! میں بس تم سے ایک دفعہ ملا ہوں۔ میں نے تمہیں دھیان سے نہیں دیکھا۔ نہ ہی تمہارے پریم کی شدت کو پرکھا ہے۔ لیکن میں نے اپنی امریتا کو دیکھا ہے۔ اس کے جذبات کو محسوس کیا ہے۔ اور میں تمہیں بھی جان گیا ہوں۔ تمہیں بھی پرکھ لیا ہے میں نے...... میرا وچار ہے کہ امریتا کو جتنا پریم تم دے سکتے ہو شاید سنسار میں

کوئی اور نہیں دے سکتا۔ یہی بات میں نے امریتا سے بھی کہی ہے۔

میرے جیون کا اب کوئی بھروسا نہیں۔ شاید چند ہفتے یا مہینے ہی جی پاؤں گا۔ میں نے امریتا سے کہا ہے کہ وہ تمہیں تلاش کرے۔ تمہیں ڈھونڈے۔ تم پاکستان یا دنیا کے جس کونے میں بھی ہو تم تک پہنچنے کی کوشش کرے اور مجھے وشواس ہے کہ تم ایک دن اسے ملو گے۔ کسی پر بہار موسم کے کسی خوش رنگ دن میں تم دونوں کا میل ضرور ہوگا۔ تمہارے ذہن میں یہ سوال اٹھے گا کہ میں یہ بات اتنے بھروسے سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ یہ بھروسا بھی مجھے امرت نے ہی دیا ہے۔ میں اس کی تڑپ دیکھتا ہوں تو مجھے تم دونوں کے انوکھے پریم کی بے کنار شکتی پر پورا وشواس ہونے لگتا ہے۔ ہاں بیٹے! یہ شکتی ہی اس سنسار کا اصل جوہر ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی سب سے بڑا دھرم بھی ہے۔"

جالندھر کے باؤجی کا لکھا ہوا خط میرے ہاتھ میں لرز رہا تھا...... اور میری نگاہیں امرت پر تھیں۔ اس نے درمیان سے مانگ نکالی ہوئی تھی۔ اس مانگ کے دونوں طرف بال ایک طویل آبشار کی طرح گرتے ہوئے کمر کی طرف چلے گئے تھے۔ میری نگاہ امریتا کے گلے کے لاکٹ پر پڑی۔ چاندی کے اس خوشنما لاکٹ میں کسی عمارت کی تصویر کندہ تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ یہ شیو مندر تھا۔ جالندھر کی وہی عمارت جس کا دروازہ مسجد کا اور اندرونی حصہ مندر یا گردوارے جیسا تھا۔ اس عمارت کو بودھیوں نے تعمیر کیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" امریتا نے حیا آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہارا لاکٹ۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "باؤجی نے لا کر دیا تھا چندی گڑھ سے۔ وہاں سے انڈیا کے کئی گردواروں اور مسجدوں کی بڑی بڑی تصویریں بھی لاتے تھے۔"

"مسجدوں کی تصویریں؟"

"ہاں دای! باؤجی کا مزاج بالکل اور طرح کا تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ وہ دو تین سالوں سے رمضان کے پورے روزے رکھتے تھے...... اور کبھی کبھی گرنتھ

صاحب کے ساتھ ساتھ قرآن مجید بھی پڑھا کرتے تھے۔ بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں ان میں۔ ان کے ایک ساتھی پروفیسر عبدالرحمٰن تھے۔ وہ حج کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت دوستی ہوگئی تھی باؤجی کی۔ وہ اکثر گھنٹوں ہمارے گھر بیٹھے رہتے تھے۔ مجھ سے اور باؤجی سے ڈھیروں باتیں کرتے تھے۔ باؤجی کے بعد بھی انہوں نے بہت خیال رکھا میرا۔ امریتا کچھ دیر تک باؤجی اور پروفیسر عبدالرحمان کی باتیں کرتی رہی پھر گفتگو کا رخ اس کی یہاں آمد کی طرف مڑ گیا۔

میں تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ سرحد پار سے یہاں کیونکر پہنچ سکی۔ میرے سوال پر اس نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ ان شفاف بلوری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی ابھر آئی۔ آنکھوں کا بلور کچھ اور چمکیلا ہوگیا۔ وہ بولی۔ "بڑا عجیب سوال کیا ہے تم نے؟ تمہیں پوچھنا چاہئے تھا کہ میں سرحد پار سے یہاں اب تک کیونکر "نہ" پہنچ سکی۔"

اس کے سوال نے مجھے نظر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ ایک ہی لمحے میں مجھے اس کی آنکھوں میں سنگاپور کے وہ تمام مناظر نظر آ گئے تھے جو دل و دماغ پر انمٹ روشنائی سے نقش ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں نے گواہی دی کہ جیسے میں ان میں سے کسی ایک منظر کو بھی بھولا نہیں ہوں' وہ بھی نہیں بھولی۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعے کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل اس کے حافظے پر نقش ہے۔ پانچ سال تو کیا شاید پچاس سال بھی گزرتے تو ان میں سے کسی یاد کو دھندلانا نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے دور رہ کر بھی' مجھ سے بدظن ہو کر بھی پانچ سال میرے بازو سے ہی چمٹی رہی ہے۔ سنگاپور میں گزرے روز و شب کی طرح ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوئی۔

پھر میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے امرت مجھے بتانے لگی کہ وہ کیسے اور کیونکر کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد مجھ تک پہنچ سکی ہے۔ اس نے بہت پاپڑ بیلے تھے۔ بڑے رستوں کی خاک چھانی تھی...... اس نے سنگاپور میں عرفات اور کرنیل تک سے رابطہ کیا تھا۔ لیکن وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ امریتا کو کیا بتاتے۔ ان سے امریتا کو بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ میں قریباً چار برس پہلے ایک [illegible]ثے میں سخت زخمی

ہو گیا تھا۔ اور پھر اپنی والدہ کی ابدی جدائی کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ امریتا نے کوشش کر کے پاکستان کا ویزہ لگوایا اور لاہور پہنچ گئی۔ یہاں وہ میرے بڑے بھائی سے بھی ملی۔ کسی ذریعے سے اسے یہ کھوج ملا کہ کبھی کبھی کراچی کے ایک اخبار میں میرا نام چھپتا ہے۔ اس ''کلیو'' کی مدد سے وہ کراچی آئی اور بالآخر مجھ تک پہنچ گئی۔

☆......☆......☆

وہ میری خزاں رسیدہ بدحال زندگی میں بہار کے ایک جھونکے کی طرح آئی۔

کراچی میں قیام کے دوران میں تیسرے چوتھے دن تھے' اس نے کہا۔

''دای! میں تمہیں انگلینڈ لے جاؤں گی۔ وہاں تمہاری ٹانگ کا علاج کراؤں گی۔ وہاں لوگوں کو مصنوعی اعضاء بھی لگائے جاتے ہیں' جو دیکھنے میں بالکل اصل جیسے ہوتے ہیں۔ یہ ''بائیومیکینکل'' ہوتے ہیں اور آج کل ان میں کئی طرح کی جدتیں لائی جا رہی ہیں۔''

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا کوئی بڑی لاٹری نکل آئی ہے؟''

''ہاں' ایسا ہی سمجھو۔'' اس نے کہا اور مجھے ایک خاصی بڑی رقم کا بنک ڈرافٹ دکھایا' یہ اٹھارہ ہزار امریکن ڈالر تھے۔

''یہ......کس کے ہیں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اگر قبول کرلو گے تو ہم دونوں کے ہیں۔ ورنہ میں ابھی اسے پھاڑ کر فلش میں بہادوں گی۔'' وہ اپنے طویل بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس کر بولی۔

میرے پوچھنے پر امریتا نے کہا۔ ''تمہیں تھوڑا سا پیچھے جانا پڑے گا۔ چار پانچ سال پیچھے۔ سنگاپور میں......؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں یاد ہے؟ کرنیل سنگھ کے فلیٹ میں میں نے اپنی کچھ تصویریں پھاڑی تھیں۔ وہ تصویریں ''ہوٹل سکائی ویو'' میں راکیش نے کھینچی تھیں۔ میرے بالوں کو فوکس کیا گیا تھا ان تصویروں میں۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سرہلایا۔

''وہ تصویریں راکیش نے میرے کوائف کے ساتھ میری ''پراپرٹی'' کی حیثیت سے یورپ کے دو بڑے خواتین میگزین کو بھیجی تھیں۔ ان میں کچھ تصویریں ایک میگزین نے اور کچھ دوسرے نے چھاپیں۔ اس وقت راکیش سنگاپور جیل میں تھا۔ ان دونوں میگزین نے نہ صرف مجھے میرے جالندھر کے ایڈریس پر تلاش کیا بلکہ پورا معاوضہ بھی بھیجا۔ یہ رقم میں نے ساری کی ساری بنک میں جمع کرا دی۔ ایک پائی بھی خرچ نہیں کی۔ پتہ ہے کیوں؟''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اپنی بلوری چمکیلی آنکھوں میں آنسو لے کر بولی۔ ''تم سے پوچھے بغیر ایسا کیونکر کرسکتی تھی۔'' اس نے بنک ڈرافٹ میرے سامنے رکھ دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بڑی تیزی سے ہوا۔ دن اور رات کی گردش جیسے ایکا ایکی بہت تیز ہو گئی۔ اگلے سات آٹھ ماہ میری زندگی میں بے حد انقلاب آفریں رہے۔ مجھے یوں لگا جیسے ارباز کے گھر والے حادثے سے قبل جو پرندہ پوری رفتار سے پرواز کرنے کے لئے پر تول رہا تھا وہ پھر سے قابل پرواز ہو گیا ہے۔ امریتا نے میرا پاسپورٹ بنوایا۔ میڈیکل بیس پر انگلینڈ کا ویزہ حاصل کیا اور مجھے لندن لے گئی۔

لندن میں رہائش کے اخراجات بچانے کے لئے امرت نے باؤجی کے ایک عقیدت مند شاگرد کے ہاں قیام کیا۔ یہ میاں بیوی مسلمان تھے۔ انہوں نے بڑی محبت اور استقامت کے ساتھ ہماری مہمان نوازی کی۔ یہ احوال تفصیل سے بیان کیا جائے تو بہت طویل ہو گا۔ لندن میں ایک ڈاکٹر واٹسن صاحب تھے۔ وہ بڑے عرصے سے مصنوعی اعضاء کی تیاری کر رہے تھے۔ اس حوالے سے "Bio Mechanicla Limbs" ان کا خصوصی شعبہ تھا۔ وہ ان دنوں ایک ایسا بازو تیار کرنے میں مصروف تھے جو چھوٹی چھوٹی موٹروں اور بیٹریوں کی مدد سے نہ صرف کئی طرح کی حرکات کر سکتا تھا بلکہ ان حرکات کا ذہن کو پورا پورا احساس بھی دلا سکتا تھا۔ بہرحال یہ مستقبل کی باتیں تھیں۔ ویسے بھی مجھے پورا بازو درکار نہیں تھا۔ میرا مسئلہ ''فورآرم'' کا تھا۔ لندن میں دو گھنٹے کی

ایک سرجری کے ذریعے مصنوعی ''فور آرم'' میری کہنی سے منسلک کر دیا گیا۔ اس فور آرم کی کلائی باقاعدہ مڑتی تھی اور میں کوشش کر کے ہلکی پھلکی اشیاء کو تھام بھی سکتا تھا۔ المونیم کاربن فائبر اور سیلی کان کا بنا ہوا یہ مصنوعی بازو بالکل میرے جسم کا ہم رنگ تھا۔ میرا دوسرا مسئلہ ٹانگ کا تھا۔ ڈاکٹرز کی رائے میں مزید سرجریوں سے بہتر تھا کہ میں فزیو تھراپی اور مستقل ورزشوں کے ذریعے اپنی ٹانگ کی حرکات کو بہتر بنانے کی کوشش کروں۔ ڈاکٹر واٹسن صاحب کے الفاظ تھے ''علاج اور سرجری سے زیادہ میری قوت ارادی میری ٹانگ کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔'' لندن میں ایک ماہر پاکستانی فزیو تھراپسٹ ابراہیم صاحب نے بڑی دلجمعی سے میرا علاج شروع کر دیا۔ اس علاج کا اہم ترین عنصر مختلف طرز کی ایکسر سائزز تھیں۔ ان ایکسر سائزز کے حوالے سے امریتا گھنٹوں میرے ساتھ مصروف رہتی تھی۔

قریباً آٹھ ماہ بعد جب میں انگلینڈ سے واپس آیا تو بالکل بدلا ہوا شخص تھا۔ بے شک میری معذوریاں بھی قدرے پس منظر میں چلی گئی تھیں لیکن اس سے بھی زیادہ' اور بہت زیادہ اہم بات یہ تھی کہ امرت اور اس کی محبت میرے ساتھ تھی۔ اس محبت نے مجھے جینے اور آگے بڑھنے کا نیا ولولہ دیا تھا۔ امرت نے میرے ذہن سے یہ احساس کھرچ کر رکھ دیا تھا کہ میں جسمانی طور پر کسی بھی حوالے سے ادھورا ہوں۔ اب بظاہر میری چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ کے سوا کوئی عیب نہیں تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ مستقل ورزشوں سے یہ لنگڑاہٹ مزید کم ہو جائے گی۔ میرے بائیو میکینکل بازو کی حرکات بھی بتدریج بہتر ہو رہی تھیں۔ امریتا نے میرے لئے ایک سپیشل جوتا بنوایا۔ اس جوتے کی دائیں ایڑی بائیں ایڑی سے ڈیڑھ انچ اونچی تھی۔ یہ جوتا پہن کر مجھے چلنا زیادہ آسان محسوس ہوتا تھا۔

میری یہ روداد اب اختتام کو پہنچتی ہے۔ امرت نے لندن میں قیام کے دوران میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ ایک مختصر سا عمل تھا لیکن اس کا سیاق و سباق بہت طویل تھا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے ڈانڈے باؤ جی سے بھی جا کر ملتے تھے۔ اس کا نیا نام ''عنبرین'' تھا۔ لیکن میں اسے امرت ہی کہتا رہا۔ اب بھی کہتا ہوں۔ پتا نہیں کہ یہ

غلط ہے یا درست۔ خدا میری اس کوتاہی کو معاف کرے۔

لندن سے کراچی واپس پہنچتے ہی ہم دونوں ازدواجی رشتے میں منسلک ہو گئے۔ اس رشتے نے میرے ویران جسم اور روح کو یوں شاداب کیا کہ ہر طرف بہاروں کے رنگ بکھر گئے۔ امرت جسم اور روح دونوں حوالوں سے بے مثال تھی۔ طویل دکھوں اور جانکاہ ناکامیوں کے بعد زندگی نے میرے لئے کامرانیوں کے راستے ایک ساتھ ہی کھولے تھے۔ میں نے تنویر رضا کے ساتھ مل کر ایک مونٹیسوری اسکول کی بنیاد رکھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے کافی اوپر لے گیا۔

میرے دو بیٹے ہیں۔ ایک خوبصورت سا گھر ہے۔ تنویر جیسا دوست ہے اور تنویر ہی نہیں اب تو عرفات اور کرنیل سنگھ جیسے یاروں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ امرت کے ''امرت'' نے میری زہر زدہ زندگی کو پھر سے زندہ کیا ہے۔ کون کہتا ہے کہ ملن کی دھار محبت کو کاٹ دیتی ہے۔ محبت اگر واقعی محبت ہے تو ان کیفیتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ یہ جدائی سے کم ہوتی ہے اور نہ ملاپ سے۔ یہ صرف بڑھتی ہے' کیونکہ اس کی بنیادی خاصیت ہی بڑھوتی ہے......

اپنے چھوٹے سے خوبصورت آنگن میں کبھی کبھی ہم لڑتے بھی ہیں کیونکہ روٹھنا اور منانا ازدواجی زندگی کا حسن ہے۔ یہ کمپیوٹر اور موبائل کا دور ہے۔ ای میل اور میسج کا زمانہ ہے لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو آج بھی خط لکھتے ہیں اور خط لکھنے کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ہم دور دور ہوں۔ اکثر ایک ہی گھر کے دو کمروں میں ہوتے ہوئے ہم خط لکھنے کا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ عام طور پر ایسا تب ہوتا ہے جب ''ایک'' نے ''دوسرے'' کو منانا ہو...... پچھلے دو دن سے وہ مجھ سے روٹھی ہوئی ہے۔ آج میں نے اسے منانا ہے اور منانے کا آسان طریقہ خط ہی ہے۔

نیلے آسمان پر شام کی شفق کھلی ہے۔ میں نے ٹیرس میں کرسی ڈال لی ہے اور خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ میں قلم تھامتا ہوں' اور لکھتا ہوں۔

''یہ کاغذ پر لکھے لفظ بھی کیا چیز ہوتے ہیں امرت...... کہنے کو ساکت و جامد ہوتے ہیں لیکن ان میں دنیا جہاں کے رنگ' ذائقے' لمس' خوشبوئیں اور جذبے حرکت

کرتے ہیں۔ یہ سوچوں اور مزاجوں کا آئینہ بن کر انجانے لوگوں کو ایک دوسر
یوں منسلک کر دیتے ہیں جیسے وہ زمانوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ امر
لگتا ہے کہ میں تمہیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ میں نے پہلے پہل کہاں دیکھا
تمہیں۔ شاید ساون کی پہلی بارش میں' شاید سرما کی اس دھوپ میں جو کئی دن کے بعد
تھی' یا پھر گرمیوں کی ایک ٹھنڈی چاندنی رات میں' یا پھر کسی رنگا رنگ تہوار کی آمد سے
ایک دن پہلے کسی بچے کی چہکار میں' جب میرے اندر بلاوجہ خوشی ناچ رہی تھی۔ ہاں
امرت! میں نے دیکھا تھا تمہیں......" اور میں آنکھوں میں نمی لئے لکھتا چلا گیا۔

(ختم شد)